اسلام سائنس اور الحاد

مؤلف
قاری ندیم ایاز حفظہ اللہ

مکتبہ دار الترتیل

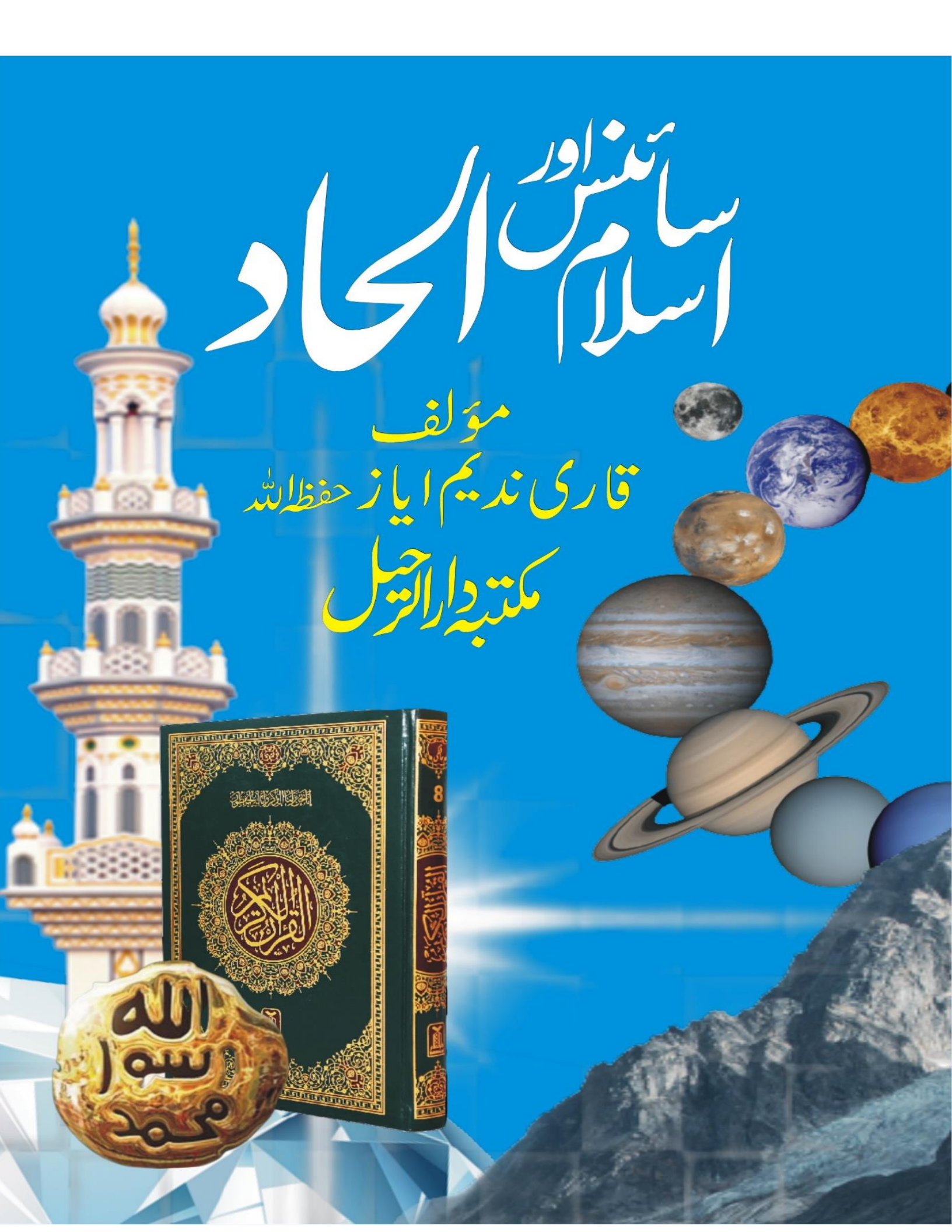

فہارس

بسم اللہ الرحمن الرحیم.....5

مقدمہ.....5

نوجوانوں کے انحراف کے اسباب اور انکا حل 6

تبصرہ کتب الحاد.....10

تہذیبی نرگسیت-ایک تہذیبی مرعوب کی سرگذشت کا اصولی جواب—حصہ اول.....10

تہذیبی نرگسیت-ایک تہذیبی مرعوب کی سرگذشت کا اصولی جواب—حصہ دوئم 17

تہذیبی نرگسیت-ایک تہذیبی مرعوب کی سرگذشت کا اصولی جواب—حصہ سوم 27

مغالطے مبالغے۔ایک اسم بامسمی کتاب.....34

رچرڈ ڈاکنز کی کتاب'' "The God Delusion کا جائزہ.....40

''خدائی سرگوشیاں''اردو زبان میں جدید الحاد کا علمی محاکمہ پیش کرتی ایک منفرد کتاب 47

کریسرچ کا میکنزم اور الحاد کا فکری سقم 50

شک کا مرض اور اس کا علاج 56

ملحدین اور عقل کا غلط استعمال.....60

کالجز/یونیورسٹیز کے سٹوڈنٹس سے ایک درخواست 67

مولانا ابوالکلام آزادؒ اور دہریت سے ایمان کیطرف واپسی کا سفر 70

علمی گمراہی کا سفر 77

الحادی فتنوں سے بچاؤ کیسے۔۔؟.....81

مولانا دریابادی کے سفر دہریت کی داستان 86

کیاواقعی جدید سائنس منکرخداہوسکتی ہے؟ 99

کیاقوانین فطرت خداکامتبادل ٹھہرائے جاسکتے ہیں؟.. 104

تخلیقِ کائنات اور رچرڈڈاکنز.. 109

تخلیق کائنات اور سٹیفن ہاکنگ.. 113

خدااور سٹیفن ہاکنگ-آخر یہ کس کی تخلیق ہے؟ڈاکٹر جان لینکس آکسفرڈیونیورسٹی 118

زمین پر زندگی کیسے شروع ہوئی؟رچرڈڈاکنز 127

مذہبِ سائنس(الحادی)کی شدت پسندانہ روش کاجائزہ.. 129

کیونکہ میں سوچتاہوں لہذامیں ہوں! 134

تشکیک سے مذہب کی تائید ہوتی ہے یاالحاد کی؟مولانادریابادی 141

اسلام اورالحاد—ایک موازنہ.. 148

سائنس، فلاسفی آف سائنس اور ملحدین کی دھوکے بازی 153

اسلام، سائنس اور ملحدین کی سائنس 158

مذہب، سائنس اور شبہے کاعنصر 167

سائنسی لحاظ سے مذہب کی مخالفت کاامکان باقی نہیں رہا! 172

حقیقی ملحدوہ ہوتاہے جو۔۔۔۔ 175

دہریت 'عقلمندی یاحماقت؟.. 177

بے خداتہذیب کی پریشانی 181

مجھے الحادمیں کیوں کشش محسوس نہیں ہوئی؟.. 188

من نمی ملحد.....192

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اسلام ، سائینس اور الحاد کے عنوان سے اہل علم کے کچھ موضوعات تلاش کرکے مرتب کردئیے یقینا پڑھنے والوں کو اس سے بڑا فائدہ ہوگا۔ ان شاء اللہ

یہ اس سلسلے میں پہلی تالیف ہے بعد میں اور تالیفات کا اضافہ کیا جائیگا ۔ آپ حضرات وخواتین ہم سے فیس بک پیج peaceofmind.na کے ذریعے رابطے میں رہئیے تاکہ نئی تالیف کے آنے پر بروقت مطلع ہوسکیں۔

مضامین نگار چونکہ بہت سے ہیں ضروری نہیں کہ ہم یا آپ ان سب سے یا انکی سب باتوں سے متفق ہوں جو بات دلیل کے مطابق ہوں وہ ہم قبول کریں گے مجموعی طور پہ اہل علم کی تحریروں میں خیر ہی غالب ہوتا ہے الحمد للہ ۔

کتاب سے فائدہ اٹھانے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ فہرست پڑھئیے اور جو عنوان آپکو پسند آئے وہ مطالعہ کیجئے اور یقینا اس فہرست میں کافی دلچسپ عنوانات ہیں۔

آپ حضرات اپنا مشورہ دینا چاہیں تو بلا جھجھک رابطہ کریں لیکن خیال رہے کہ صرف میسیج پر ہی غور کیا جائیگا فون پہ بات کرنا ممکن نہیں کیونکہ وقت کی شدید قلت کاسامنا ہے۔

نوٹ : اس تالیف سے مقصد کسی قسم کی دنیوی نفع بالکل نہیں ہے اور نہ ہی یہ برائے فروخت ہے بلکہ بالکل مفت فراہم کی جارہی ہے۔

قاری ندیم ایاز

مکتبہ دارالرحیل

www.peaceofmindna.com

peaceofmina.na facebook 00923172134743 whatsapp

نوجوانوں کے انحراف کے اسباب اور انکا حل

اگر بغور جائزہ لیا جائے تو نوجوانوں کی گمراہی وانحراف کے کئی اَسباب سامنے آتے ہیں کیونکہ نوجوانی کی عمر ہی ایک ایسی عمر ہے جس میں انسان پر جسمانی، فکری اور عقلی حیثیت سے بڑی تیزی سے تبدیلیاں رونما ہو رہی ہوتی ہیں۔اِنسانی جسم نشو ونما اور ارتقا کی طرف گامزن ہوتا ہے۔ہر لمحہ نئے تجربات اور تازہ احساسات عقل وفکر کے دریچے کھولتے جاتے ہیں۔پھر اس کے ساتھ ساتھ شعور وادراک کی نت نئی منازل بھی طے ہونا شروع ہو جاتی ہے جس کی بنا پر انسان سوچ وفکر کی نئی راہیں متعین کرنے کی کوشش کرتا ہے۔دوسری طرف جذبات کی شدت فیصلوں میں عجلت پر مجبور کرتی ہے۔ان احوال میں نوجوانوں کو ایسے مربیوں کی ضرورت ہوتی ہے جو حکمت وبصیرت کے ساتھ ان کی تربیت کریں۔بڑے احتیاط اور صبر وتحمل کے ساتھ صراطِ مستقیم کی طرف لے چلیں۔اب ہم ان پانچ اہم اسباب کا ذکر کرتے ہیں جو آج کل کے نوجوانوں کے بگاڑ میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں تاکہ بعد میں حسبِ حال اصلاح ممکن ہو سکے۔

1۔فراغت

نوجوانوں کی تباہی وہلاکت کا اہم ترین سبب فراغت ہے۔جسم انسانی کو اللہ تعالیٰ نے اصلاً متحرک وفعال بنایا ہے۔لہٰذا اس کی ساخت اور کیفیت تقاضا کرتی ہیں کہ یہ ہر دم حرکت میں رہے۔حرکت کا تعطل اس کے لیے فکری، عقلی بلکہ ظاہری اعتبار سے بھی زہر قاتل ہے۔ فکری پراگندگی وانتشار، ذہنی رذالت وسطحیت، مجاہدانہ اولوالعزمی کی بجائے کم حوصلگی، خواہشاتِ نفسانی اور وساوس شیطانی فراغت کے ہی کرشمے ہیں، کیونکہ جسم کو تو اپنے تقاضے کے مطابق حرکت میں رہنا ہی ہے۔اب وہ حرکت بالخصوص اس وقت جب اسے شدتِ جذبات کی پشتیبانی بھی حاصل ہو تو بجائے مثبت اور تعمیری کاموں پر لگنے کے وہ منفی اور تخریبی امور سرانجام دیتی ہے۔جس سے معاشرتی بگاڑ پیدا ہوتا ہے اور مسلّمہ اقدار کی بے حرمتی ہونا شروع ہو جاتی ہے۔اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ ایسے نوجوانوں کو ذہنی یا عملی طور پر ان کی صلاحیت کے مطابق مصروف رکھا جائے۔تعلیمی، فنی، تجارتی، انتظامی یا دیگر سرگرمیوں میں سے کسی کی طرف لگا دیا جائے۔

2۔بڑوں اور چھوٹوں کے درمیان دوری

نوجوانوں کی بے راہ روی میں اس فاصلے اور بُعد کا بھی بڑا حصہ کارفرما ہے جو ہمارے معاشرے میں بڑی عمر کے لوگ چھوٹی عمر والوں کے درمیان حائل رکھتے ہیں۔چاہے وہ نوجوان ان کے اپنے خاندان سے تعلق رکھتے ہوں یا دوسروں سے۔وہ بلا تفریق ان سے بُعد اور دوری

ہی اختیار کرتے ہیں۔ آپ بوڑھوں کو دیکھیں کہ وہ نوجوانوں کی اصلاح سے مایوس و نااُمید نظر آئیں گے۔ بڑوں کے ایسے رویے سے پھر نوجوان بھی ان سے دوری کو ہی عافیت محسوس کرتے ہیں۔ پھر وہ خواہ کوئی بھی حالات چاہے بہتری یا بدتری کے، ان معاملات میں بڑوں کو اپنے ساتھ شامل نہیں کرتے اور اپنے تئیں ان کا سامنا کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر اکثر تو حالات کی رو میں بہہ جاتے ہیں اور جن چند ایک کو پائے ثبات نصیب ہوتا ہے، وہ بھی گرتے گرتے سنبھلتے ہیں اور بوڑھوں نے تو اُن سب کی خرابی کے بارے میں ایک نفسیاتی سا کلیہ بنالیا ہوتا ہے جس سے معاشرتی دوریاں جنم لیتی ہیں، منفی رویے تشکیل پانا شروع ہو جاتے ہیں، نوجوان بوڑھوں کو اور بوڑھے نوجوانوں کو بنظر حقارت دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ دونوں گروہوں کے انہی رویوں کی وجہ سے کئی طرح کے خطرات معاشرے کے دروازے پر دستک دینا شروع کر دیتے ہیں۔

اِس مشکل کا حل یہ ہے کہ دونوں گروہوں کے رویوں میں حسبِ ضرورت تبدیلیاں پیدا ہوں۔ بجائے فراق و بعد کے قربت و اتحاد ہو ۔ پورا معاشرہ جسدِ واحد کی طرح اپنے اندر یگانگت کو جنم دے اور یہ شعور معاشرے کے ہر فرد میں رچ بس جائے کہ تمام افراد معاشرہ ایک ہی جسدِ واحد کے مختلف اعضا ہیں۔ ایک کی خرابی و فساد تمام کی بربادی کا سبب بنے گی۔ بوڑھوں کو چاہیے کہ وہ اپنے دلوں میں نوجوانوں کی اصلاح کا درد پیدا کریں، ان کے بارے میں حسرت و یاس ترک کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ تو ہر چیز پر قدرتِ تامہ رکھتا ہے۔ کتنے ہی وہ لوگ ہیں جو ضلالت و گمراہی کے قعرِ مذلت میں گرے ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں منارۂ نور اور شمع ہدایت بنا دیا۔

دوسری طرف نوجوانوں کو چاہیے کہ وہ بوڑھوں کے بارے میں اپنے رویّوں میں تبدیلی لائیں، ان کی آراء کا احترام کریں۔ ان کی طرف سے پیش کردہ مسائل و معاملات کی توجیہات کو قبول کریں کیونکہ وہ بڑے تجربات کا ماحصل ہوتی ہیں۔ وہ زندگی کے ان تلخ حقائق سے گزرے ہوتے ہیں جن سے ابھی تک نوجوان دوچار نہیں ہوتے۔ اس طرح جب بوڑھوں کی فکر اور حکمت و دانائی نوجوانوں کی رہبر و رہنما بنے گی تو معاشرہ ترقی اور عروج میں آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگے گا۔

3۔ گمراہ لوگوں کی صحبت

نوجوانوں کی گمراہی کا تیسرا سبب ان کی ایسے لوگوں کے ساتھ صحبت اور میل جول رکھنا ہے جو گمراہ ہیں۔ صحبت ان عوامل میں سے سب سے زیادہ مؤثر ترین عامل ہے جس سے نوجوان متاثر ہوتے ہیں۔ یہ چیز ان کی عقل و فکر اور رویوں کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔ آں

حضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: المرء علی دین خلیلہ فلینظر أحدکم من یخالل ''یعنی آدمی اپنے ہم نشین ساطرزِ زندگی اپناتا ہے چنانچہ کسی کی ہم نشینی سے پہلے اس کے بارے میں غور کرلو کہ وہ کیسا ہے؟''اور آپ ﷺ نے ایک جگہ فرمایا:

مثل الجلیس السوء کنافخ الکیر إما أن یحرق ثیابک واما أن تجد منہ رائحۃ کریھۃ ''برے ہمنشیں کی مثال لوہار کی بھٹی کی طرح ہے یا تو وہ تیرے کپڑے جلادے گی یا پھر تو اس کے دھوئیں کو چکھ لے گا''۔

صحبتِ صالح ترا صالح کند

صحبتِ طالح ترا طالح کند

اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ نوجوانوں کو چاہیے کہ ایسے لوگوں کی صحبت اختیار کریں جو نیکی اور بھلائی کا سرچشمہ ہوں اور عقل ودانش کا پیکر ہوں تاکہ ان سے کسبِ خیر، اصلاح احوال اور عقل کو جلا بخشی جائے۔اس لیے کسی کی صحبت سے پہلے ان معاملات اور رویوں کو خود بھی پرکھنا اور دوسرے لوگوں سے بھی سن لینا چاہئے۔اگر وہ صاحبِ اخلاق، صاحبِ دین اور اعلیٰ کردار کا مالک ہو اور لوگ بھی اسے اچھا کہیں یعنی دید وشنید دونوں ہی بہتر ہوں تو اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ، تعلقات استوار کرو۔اس کے برعکس اگر وہ بداخلاق اور بدکردار ہے تو اس سے دوری اختیار کرجاؤ۔چاہے وہ اپنی صورت میں چاند سے زیادہ خوبصورت ہو، اپنی باتوں میں شہد سے زیادہ شیرینی رکھتا ہو، اپنی شخصیّت اور ظاہری وضع قطع کے لحاظ سے کمال کو پہنچا ہوا ہو پھر بھی اس سے اجتناب کرو۔کیونکہ یہ تمام ظاہری خوبیاں شیطان، بندگانِ الٰہ کو گمراہ کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔کیونکہ اس کی ظاہری چمک دمک نظروں کو خیرہ کردیتی ہے۔سو اس وجہ سے لوگ اس کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں لیکن درحقیقت وہ بدقسمت شیطان کے لیے آلہ گمراہی اور فسق وفجور ہوتا ہے۔

اب کسی پوشاک میں کردار کی خوشبو نہیں رہی

چھپ گئی ہے انسان کی پہچان ملبوسات میں!

4۔ منفی کتابوں کا مطالعہ اور انٹرنیٹ کا غلط استعمال

نوجوانوں کی گمراہی کا چوتھا سبب ایسے رسائل ومجلّات، اخبارات اور کتابیں وغیرہ پڑھنا ہے، جو ایک نوجوان کے دل میں اس کے عقائد و نظریات کے بارے میں تردّد وشک کی راہ ہموار کرتے ہیں۔اسے اخلاقِ رذیلہ پر آمادہ کرتے اور کفر وفسق میں مبتلا کردیتے ہیں۔بالخصوص

اس وقت جب کسی فرد کی تربیت پر ثقافت اسلامیہ کے اثرات اچھی طرح مرتب نہ ہوں، اور وہ اپنے دین کے فہم کے حوالے سے ایسی بصیرت سے محروم ہو جو حق و باطل کے درمیان اچھی طرح خطِ امتیاز کھینچ سکے اور اپنے لیے نافع و ضرر رساں کا گہرے شعور کے ساتھ ادراک کر سکے۔ اس طرح کی کتابوں کا مطالعہ نوجوان کو ایڑیوں سے پھیر دیتی ہے اور وہ اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے ان گمراہوں کو نہ چاہتے ہوئے قبول کر بیٹھتا ہے۔

اس مشکل کا حل یہ ہے کہ نوجوان ایسی تخریبی کتابوں کے مطالعہ سے گریز کرے اور ان کتابوں کے مطالعے میں غرق ہو جو اس کے دل کو محبتِ الٰہی اور محبتِ رسول ﷺ کا سرچشمہ بنا دے اور اس کے ایمان و عمل صالح کی جڑیں مضبوط کر دے، پھر صرف ایسی ہی کتابیں پڑھنے پر اکتفا کرے۔ دوسری قسم کی منفی رجحانات پیدا کرنے والی کتابوں سے گریز کرے تو پھر آہستہ آہستہ وہ محسوس کرے گا کہ پہلے منفی اثرات مرتب کرنے والی کتب پڑھنے کی وجہ سے اس کے دل و دماغ میں تشکیک و تردّد کے جو کانٹے چبھ گئے تھے، وہ نکل رہے ہیں۔ اسے اندازہ ہوتا جائے گا کہ وہ شک و اضطراب کی دنیا سے باہر آ رہا ہے۔ اس کا سرکش نفس اللہ، رسول ﷺ کی اطاعت پر آمادہ ہو رہا ہے، اس کا دل لہو و لعب کی دنیا سے اُچاٹ ہو رہا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے اہم ترین کتاب 'کتاب اللہ' ہے اور جو ان کی تفسیر و بیان پر مشتمل ہیں، چاہے وہ تفسیر بالمنقول ہو یا تفسیر بالرائے المحمود ہو۔ اسی طرح سنت رسول ﷺ کا مطالعہ بھی انتہائی ضروری، نفع بخش اور مفید ہے، پھر وہ کتابیں جو ایسے استدلال و استنباط اور فقہی مسائل پر مشتمل ہوں جو علمائے ربانیین نے ان دونوں مصادرِ اساسیہ سے نکالے ہیں۔

عربی تحریر: شیخ محمد بن صالح العثیمین، ترجمہ: عبدالحنان الکیلانی

تبصرہ کتب الحاد

تہذیبی نرگسیت-ایک تہذیبی مرعوب کی سرگذشت کا اصولی جواب—حصہ اول

تحریر: عدنان مسعود

میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ امت مسلمہ کے لیے ضروری ہے کہ یہ وہ اپنے مسائل کا حل اپنی خامیوں اور کوتاہیوں میں تلاش کرے خود احتسابی کا عمل نہایت ضروری، بحیثیت امت اور بحیثیت فرد لیکن صاحب کتاب نے جس بے دردی کے ساتھ دین اسلام کی بنیادی اساس یعنی اقامت دین اور 'ان الدین عند اللہ الاسلام' کو روندا اور اس کو نام نہاد تہذیبی نرگسیت کا موجب گردانا، راقم اس تقابل سے اختلاف رکھتا ہے کہ اپنے اعمال اور برگشتگیوں کی ذمہ داری دین الہیہ پر ڈالی جاے، صلاہ کو میکانیکی حرکات کا مجموعہ کہا جاے اور قران کی آیات و احکامات کو ناکافی مان کر اس کا تمسخر اڑایا جائے۔

صاحب کتاب یقینا ہمیں بھی 'نرگسی' خیال دیں گے لیکن یہ عبودیت ہے، نرگسیت نہیں۔ کسی ملامت کرنے والے کا خوف ایمان والوں کو اللہ کے دین کو بیان کرنے سے نہیں روک سکا اور نام نہاد ترقی پسند سوچیں جس اسلام کو ترقی سے نامطابق یا 'ان کمپیٹبل' سمجھتی ہیں انہیں اس سطحی سستی شہرت کے حصول کے لئے آیات الہیہ کا بلا سوچے سمجھے مذاق اڑانے کی کھلی چھٹی نہیں دی جاسکتی. احقر ناتو عالم ہے اور نا ادیب—تمام خامیاں میری اپنی ہیں اور تمام توفیق اللہ سبحانہ تعالی کی طرف سے.

تہذیبی نرگسیت-کتاب کس حیثیت میں لکھی گئی؟

مبارک حیدر کی یہ تصنیف صاف اور کھلے انداز میں تحریک اسلامی کی فکری اساس پر تنقید کرتی نظر آتی ہے جس کی ' برائے تعمیر ' کاوش پر شائد وہ مبارکباد کے مستحق ٹھہرتے اگر یہ کتاب تضادات کا مجموعہ نہ ہوتی۔ پہلا اور بنیادی سوال فریم ورک یا ضابطے کا ہے کہ یہ کتاب کس حیثیت میں لکھی جارہی ہے۔ بحیثیت مسلمان ہمارا عقیدہ ہے کہ قران اللہ (سبحانہ وتعالی) کی کتاب ہے اور کسی بھی نقص اور خامی سے پاک ہے-

ذالک الکتاب لاریب فیہ۔ اس کے احکامات اسی ذات باری کی طرف سے ہیں جس نے انسان کو پیدا کیا اور وہ اسکی فطرت کو سب سے بہتر جانتا ہے۔ جناب مبارک حیدر لکھتے ہیں۔

اسلام اور غلامی کے موضوع پر تفصیل یہاں اور یہاں پیش کی جاچکی ہیں، ہم یہاں اعتراض کے ضابطے پر چند باتیں عرض کرنا چاہتے ہیں۔

اگر اساس دین 'لاریب فی' آپ کا یہ ایمان نہیں، اس کتاب کی کچھ باتیں آپکی روشن خیالی سے ٹکراتی ہیں اور آپ بر سر عام اس کے قوانین کو دنیاوی قوانین سے ہیچ جانتے ہیں تو ٹھیک ہے، کسی ناقص کتاب کے ماننے، اس کتاب کے خالق اور پہنچانے والے اور اس کے اتباع میں جان لٹانے والوں پر 'صلی اللہ علیہ وسلم' اور 'رضی اللہ تعالی عنہ' لکھنا چہ معنی؟

ہم آپ کے اختلافی حق کو تسلیم کرتے ہیں لیکن اب آپکی بات اس حیثیت سے سنی جاے گی کہ آپ الہامی پیغام میں تبدیلی کے قائل اور نقص کے حامی ہیں۔ میں مبارک صاحب کو دائرہ اسلام سے خارج کرنے کی قطعی کوشش نہیں کر رہا، ان کا ایمان انکے اور انکے رب کے درمیان ہے اور بقول ابن انشا، اب اس دائرہ میں لوگ داخل کم اور نکالے زیادہ جاتے ہیں، میرا مقصد یہاں بنیادی اصطلاحات 'پری ریکوزیٹس' متعین کرنا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی فرد روزے پر بات کرنا چاہے اور مانتا ہو کہ خدا وہیں تو یہ بات لاحاصل ہو گی ۔ اگر آپ اللہ کی کتاب اور اسکے قوانین پر انسانی قوانین کو افضل سمجھتے ہیں تو یہ بات اب ایمان بالغیب اور ربوبیت کی اسناد متعین کرنے سے ناہو پاے گی کیونکہ اگر مقدس صحیفہ اللہ کا کلام نہیں بلکہ ارتقا کی منزل کا ایک زینہ ہے پھر محراب و ممبر کی گزارش چہ مانند۔

اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا

سورۃ المائدۃ—سورۃ 5—عدد آیا تھا 120

آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو بحیثیت دین پسند کر لیا''

مبارک حیدر صاحب نا تو پہلے فرد ہیں اور نا ہی آخری ہونگے جنہوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا۔اس کی ایک مثال۔ شعبان ۱۳۵۳ھ۔ کی مولانا مودودی کی تحریر ہے جو ایک ایسے ہی بے سر و پا اعتراضات کے جواب میں لکھی گئی تھی اور اس مضمون کے آخر میں مکمل متن موجود ہے۔اس کا ایک چھوٹا سا اقتباس یہ ہے

سوال یہ ہے کہ قرآن سے اتنا کھلا اختلاف رکھتے ہوئے آپ مسلمان کیسے رہ سکتے ہیں۔اور مسلمان ہوتے ہوئے آپ قران سے اختلاف کیونکر کر سکتے ہیں۔؟اگر آپ مسلمان ہیں تو قرآن سے اختلاف نہ فرمایئے اور اگر قرآن سے اختلاف کرنا چاہتے ہیں تو دائرہ اسلام سے باہر کھڑے ہو کر اختلاف کیجئے۔؟''

جو شخص کسی مذہب کے اصول اور احکام و قوانین سے مطمئن نہ ہو، جس کا دل ان کی صداقت پر گواہی نہ دیتا ہو جو ان کی علت و مصلحت کو سمجھنے سے عاجز ہو اور جس کے نزدیک ان میں سے بعض یا اکثر زبانیں قابل اعتراض ہوں، اس کے لیے دو راستے کھلے ہوئے ہیں یا تو وہ مذہب سے نکل جائے، پھر اس کو حق ہو گا کہ اس مذہب کے جس قاعدے اور جس حکم پر چاہے نکتہ چینی کرے یا اگر وہ اس عدم اطمینان کے باوجود اس مذہب میں رہنا چاہتا ہے تو اس کے خلاف مظاہرہ کرنے سے احتراز کرے اور مجتہد بن کر اس کے قواعد و ضوابط پر تیشہ چلانے کے بجائے طالب علم بن کر اپنے شکوک و شبہات حل کرنے کی کوشش کرے۔

عقل و دانش کی رو سے تو اس حالت میں یہی دو طریقے ہو سکتے ہیں اور مرد عاقل جب کبھی ایسی حالت میں مبتلا ہو گا تو انہی میں سے کسی ایک طریقے کو اختیار کرے گا۔ لیکن فاضل مضمون نگار اور ان کی طرح بہت سے فرنگی تعلیم و تربیت پائے ہوئے حضرات کا حال یہ ہے کہ پہلا طریقہ اختیار کرنے کی اخلاقی جرات ان میں نہیں اور دوسرا طریقہ اختیار کرتے ہوئے انہیں شرم آتی ہے۔اس لیے انہوں نے بیچ کا ایک غیر معقول طریقہ اختیار کرر کھا ہے۔اور وہ یہ ہے کہ ایک طرف مسلمانوں میں شامل بھی ہوتے ہیں۔ ترقی اسلام کی آرزو مند بھی بنتے ہیں، اسلام اور مسلمانوں کے درد میں تڑپتے بھی ہیں اور دوسری طرف اسلام کے خلاف وہ سب کچھ کہتے اور کرتے ہیں جو ایک غیر مسلم کہہ اور کر سکتا ہے۔ حدیث و فقہ تو درکنار قرآن تک پر نکتہ چینی کرنے سے باز نہیں رہتے اور ان تمام بنیادوں پر ضرب لگا جاتے ہیں جس پر اسلام قائم ہے۔

تہذیبی مرعوبیت کے شکار افراد جو اسلام کو 'ماڈرنائز' کرنا چاہتے ہیں بہت سے مختلف رنگوں میں پائے جاتے ہیں۔ان کی کچھ اقسام مندرجہ ذیل ہیں

خود بدلتے نہیں قران کو بدل دیتے ہیں—کچھ وہ ہیں جو سمجھتے ہیں کہ یہ قرون اولی کی کہانیاں ہیں اور انکا جدید دور میں کیا کام اور کچھ وہ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ جب اللہ تبارک تعالی نے زنا کی سزا مقرر فرمائی تو وہ ایک پرانے دور کے لیے تھی، ماڈرن انسان اب ان بربریت کی سزاوں کا مستحق نہیں..

ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب

کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

ان میں ایسے بہتیرے لوگ ہیں جو انوع تہذیب سے بہت متاثر ہیں، جو اسلام کو ہزاروں دیگر تہذیبوں میں سے صرف ایک تہذیب سمجھتے ہیں جس کا 'درست 'ہونا یا نا ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا بلکہ یہ تو صرف افراد کا مجموعہ اور تحریک تھی جو اپنے وقت پر اٹھی، عروج پایا اور زوال کا شکار ہو گئی، اب اسکی باقیات ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ رومن سلطنت اور بلاد حرمین ویٹیکن کا درجہ حاصل کرلے گا۔

ان مرعوب لوگوں میں مادی اور تخلیقی انداز میں سہمے لوگ بھی ہیں جو یہ سوچتے ہیں کہ لاس اینجلس، نیویارک، سڈنی، لندن یا ٹوکیو ڈاون ٹاون کی رنگینیاں، ان شہروں کا امن وسکون، اس کے لاکھوں باسی جنھوں نے کبھی اپنے حقیقی رب کا نام بھی نہیں سنا کس وجہ سے اتنے ترقی یافتہ ہیں؟ کیا انسان کو دین کی کوئی ضرورت ہے؟ اسکے جواب میں ہی انکے رب نے فرمادیا کہ نہیں جھگڑا کرتے اللہ کی آیات میں مگر وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا۔ سودھوکے میں نہ ڈالے تمہیں ان کی چلت پھرت ملکوں میں۔40:4

اگر ہمیں مٹی میں مل جانا ہے تو یہ عبادات واعتقادات کس کام کی؟ ساوتھ امریکہ میں کروڑوں لوگ بستے ہیں، برازیل کیا سارا کا سارا جھنم میں جانے والا ہیں، کیسی باتیں کرتے ہو؟

جن لوگوں کے لیے یہ تمام الحاد کی شیطانی فتنہ پردیزیاں اتنی آسانی سے ایمان کو ڈانوں ڈول نہیں کرتیں، وہ اپنے آپ کو ماڈرن مجدد کے فتنے میں پاتے ہیں۔ ان تمام لوگوں نے اپنے دین اور اپنے رب کو بہت چھوٹا جانا اور اسکی قدر نا کی جیسا کہ اسکی عبودیت کا حق تھا۔(اگر آپ اپنے آپ کو یہ کہتا پاتے ہیں کہ شیطان، فتنہ۔۔۔یہ کس قسم کی باتیں ہیں؟ علمی دلائل سے بات کریں جناب۔ تو محترم، میں یہ جواب من الحیث مسلم لکھ رہا ہوں اور چاہے یہ فرشتے، شیاطین، وسوسے اور خدا کا تصور آپکو کتنا ہی بعید القیاس لگے، میں اس پر اسی شدت سے ایمان

رکھتا ہوں جتنا کہ اپنے رب کے عطا کردہ حواس خمسہ پر بلکہ اس سے کہیں زیادہ۔)۔ فتنہ ماڈرن مجدد کیا ہے، وہ یہ ہے کہ ماڈرنائیزیشن کو احیا دین بنا کر لاگو کرنے کی کوشش کی، جیو اور جینے دو کی پالیسی اپنائی جائے اور لبرل سوچ کی موجودہ تحاریک اور قوانین سے اسلام کو ہم آہنگ کیا جائے۔

آپ کسی انگریزی تعلیم یافتہ شخص سے کسی مذہبی مسئلے پر گفتگو کیجئے اور اس کی ذہنی کیفیت کا امتحان لینے کے لیے اس سے مسلمان ہونے کا اقرار کر لیجئے پھر اس کے سامنے مجرد حکم شریعت بیان کر کے سند پیش کیجئے۔ وہ فوراً اپنے شانے ہلائے گا اور بڑے عقل پرستانہ انداز میں کہے گا کہ یہ ملائیت ہے' میرے سامنے عقلی دلیل لاؤ' اگر تمہارے پاس معقولات نہیں صرف منقولات ہی منقولات ہیں تو میں تمہاری بات نہیں مان سکتا۔ بس انہی چند فقروں سے یہ راز فاش ہو جائے گا کہ اس شخص کو عقلیت کی ہوا بھی چھو کر نہیں گزری ہے' اس غریب کو برسوں کی تعلیم و تربیت علمی کے بعد اتنا بھی معلوم نہ ہو سکا کہ طلب حجت کے عقلی لوازم کیا ہیں اور طالب حجت کی صحیح پوزیشن کیا ہوتی ہے۔

ایسے لوگ مزید براں بے پر کی تاویلات سے نتائج اخذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو کہ علمی دیوالیہ کا ثبوت دیتا ہے۔ مثلاً وہ یہ کہتے نہیں چوکتے کہ خود تنقیدی کی تحریک اسلامی میں مثال نہیں ملتی لیکن خلافت و ملوکیت کا تذکرہ چھوڑ دیتے ہیں۔ کتمان حق یا علم چھپانے کا یہ عالم ہے کہ فروعات و سنن کی دلیلوں کو نصوص پر لگاتے ہیں اور اپنی باتوں کا لوہا منوانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسلام اختلاف رائے کے خلاف نہیں، نا ہی اجتہاد کا دروازہ بند کرتا ہے لیکن یہ اصول سمجھ لینا چاہیے کہ نصوص قطعیہ میں نا تو اجتہاد ہے اور نا ہی اس میں مسلمان کے لیے اختلاف کی گنجایش ہے۔

مثلاً رمضان کا روزہ ہر صحتمند مسلمان پر فرض ہے، اب دنیا کا کوئی فقیہ اس حکم کو تبدیل نہیں کر سکتا۔ یہی فقہی اصول قران کریم کے تمام احکامات پر لاگو ہوتا ہے۔ اگر یہ بندش آپ کو بری لگے تو مسلمان کہلانا یعنی مطیع ہونے کے کیا معنی ہیں؟ اسلام کی بنیاد اللہ اور رسول پر ایمان ہے، سید ابو لعلی مودودی تنقیحات میں لکھتے ہیں

اسلام کی تعلیم میں یہ قاعدہ اصل اور اساس کی حیثیت رکھتا ہے' وہ پہلے احکام نہیں دیتا بلکہ سب سے پہلے اللہ اور رسول پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے۔ جتنی حجتیں ہیں' سب اسی ایک چیز پر تمام کی گئی ہیں۔ ہر عقلی دلیل اور فطری شہادت سے انسان کو اس امر پر مطمئن کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ خدائے واحد ہی اس کا الٰہ ہے اور محمد خدا کے رسول ہیں۔ آپ جس قدر عقلی جانچ پڑتال کرنا چاہتے ہیں' اس بنیادی

مسئلہ پر کر لیجئے۔ اگر کسی دلیل اور کسی حجت سے آپ کا دل اس پر مطمئن نہ ہو تو آپ کو داخل اسلام ہونے پر مجبور نہیں کیا جائے گا اور نہ احکام اسلامی میں سے کوئی حکم آپ پر جاری ہو گا۔ لیکن جب آپ نے اس کو قبول کر لیا تو آپ کی حیثیت ایک ''مسلم'' کی ہو گئی اور مسلم کے معنی ہی مطیع کے ہیں۔ اب یہ ضروری نہیں کہ اسلام کے ہر ہر حکم پر آپ کے سامنے دلیل و حجت پیش کی جائے اور احکام کی اطاعت کرنے کا انحصار آپ کے اطمینان قلب پر ہو۔ مسلم بن جانے کے بعد آپ کا اولین فرض یہ ہے کہ جو حکم آپ کو خدا اور رسول کی طرف سے پہنچے بے چوں وچرا اس کی اطاعت میں سر جھکا دیں۔

انما کان قول المومنین اذا دعوا الی اللہ ورسولہ لیحکم بینھم ان یقولو سمعنا واطعنا (النور۔ 51)

ایمان لانے والوں کا کام تو یہ ہے کہ جب ان کو اللہ اور رسول کی طرف بلایا جائے تاکہ رسول ان کے درمیان حکم کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔

ایمان اور ایسی طلب حجت جو تسلیم واطاعت کے لیے شرط ہو' باہم متناقض ہیں اور ان دونوں کا اجتماع صریح عقل سلیم کے خلاف ہے۔ جو مومن ہے وہ اس حیثیت سے طالب حجت نہیں ہو سکتا اور جو ایسا طالب حجت ہے' وہ مومن نہیں ہو سکتا۔

اگر اس دنیا میں لوگوں کو مذہب اسلام کے ماننے یا نا ماننے پر منقسم کرنا ہو تو اس کی دو طرح سے تقسیم ہو سکتی ہے۔

اولا—وہ لوگ جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہوں

دوم—وہ لوگ جو اپنے آپ کو مسلمان کے علاوہ کچھ اور کہتے ہوں یا وہ لوگ جن تک اسلام کا پیغام نہیں پہنچا

اگر آپ اپنے آپ کو اول درجہ میں گردانتے ہیں تو دوم طبقے کے لیے دعوت و تبلیغ آپ کا فریضہ ٹھہرا۔ نیز اگر آپ اسلامی نظام کو' ضابطہ حیات'، اللہ مالک کائینات کی طرف سے نازل کردہ نظام سمجھتے ہیں جسے قران کے مطابق پوری جنس دین پر غالب کرنا خالق کی مشیت ٹھری تو آپ کی بے قراری کا کیا عالم ہو گا کہ آپ اس دین کو نافذ کرنے کے لیے تن من دھن سے قربانیاں دیں اور لوگوں کو آتش دوزغ سے بچانے کے لیے ہر وقت بے قرار رہیں۔ اگر آپ ان لوگوں میں نہیں تو زیادہ تر امکان یہ ہے کہ اس کی وجہ ایمان کی کمزوری ہے کہ آپ نے اس نہایت اہم کام اقامت دین کو اپنی زندگی کی ترجیحات میں شامل نہ کیا۔ اللہ آپ کو اسکی توفیق دے۔

بدترین درجہ ان افراد کا ہے جو اہلیت کے باوجود نا تو خود یہ کوشش کرتے ہیں بلکہ دوسرے لوگ جب اس امر کی سعی کرتے ہیں تو اس میں مین میخ نکالتے ہیں، اور صاحب کتاب تو یہاں پورے مقصد خلافت علی منہاج النبوہ ہی کا انکار کرنے پر تلے ہیں۔ انکا اصرار ہے کہ چونکہ مسلمانوں کے اپنے اعمال درست نہیں، اسلام کا یہ دعوی کرنا سرے سے ہی غلط ہے کہ وہ دین حق ہے اور غالب ہونے کے لئے آیا ہے۔ خطبہ حجتہ الوداع میں ہمارے ہادئ برحق نے ارشاد فرمایا ہے: ''لوگو! میری بات سنو اور سمجھو۔ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ دیکھو میرے بعد کہیں گمراہ نہ ہو جانا کہ آپس ہی میں ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے لگو۔ لیکن یہ تنگ نظر بیرونی تہذیب سے متاثر افراد طالبان کے ظلم و ستم کو اسلامی ریاست کا جاری و ساری عمل قرار دیتے ہیں، یہاں اسلام کی خوش خلقی اور عفو و درگذر کی ساری مثالیں انکے ذہن سے محو ہو جاتی ہیں۔

یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ e=mc^2 غلط ہے کیونکہ اس سے ایٹم بم بنا۔ نا کہ یہ کہیں کہ لوگوں کو مارنے والے غلط لوگ تھے، اکثریت ان لوگوں کی ہے جو اس توانای سے بجلی بنا کر اسپتال اور شفاخانوں میں لوگوں کا علاج کرتے ہیں۔ غلط e=mc^2 نہیں ہے، لوگ غلط ہیں۔

خود بدلتے نہیں قران کو بدل دیتے ہیں

اگلے حصے میں ہم اس کتاب کی کچھ اصطلاحات اور ان کے غلط استعمال پر گفتگو کریں گے ان شااللہ۔

تہذیبی نرگسیت-ایک تہذیبی مرعوب کی سرگذشت کااصولی جواب—حصہ دوئم

گزشتہ حصہ میں ہم نے 'تہذیبی نرگسیت' کے بنیادی تضادات اور نصوص قطعیہ پر اس کے اعتراضات پر اجمالی روشنی ڈالی تھی۔اس قسط میں اس قسط میں ہماری کوشش یہ ہوگی کہ معروضی شکل میں اس کتاب کے اہم نکات کو بھی بیان کردیں۔اس 'فتنہ نرگسیت' کی بنیادی اغلاط کااحاطہ ان پانچ نکات سے کیاجاسکتاہے۔راقم کااس کتاب کے چیدہ چیدہ نکات نکال کر سیاق وسباق کے بغیر نقل کرکہ اس کی تضحیک کرنامقصد نہیں لہذااپنی تشفی کے لئے اصل کتاب کامطالعہ بھی ضرور کریں۔

وہ نکات ملاحظہ کریں

"اسلام مکمل ضابطہ حیات نہیں ہے—'ایک بنیادی دعوی جس پر کئی دوسرے دعووں کے محل تعمیر کئے گئے ہیں، یہ ہے کہ اسلام مکمل ضابطہ حیات ہے حالانکہ قران اور حدیث نے ایسا کوئی دعوی نہیں کیاہے۔یہ دعوی تہذیبی فخر کے لئے قائم کئے گئے مفروضوں میں سے ہے۔۔۔'صفحہ 96۔

قران نے نظام مملکت پر کوئی ضابطہ نہیں دیاجو بے حد اہم موضوع ہے۔''صفحہ 97

دوسرا بڑا مفروضہ جس پر تہذیبی نرگسیت کی بنیاد ہے، یہ ہے کہ اسلام کو ہر دوسرے دین پر غالب کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔قران و حدیث میں اس مفروضہ کی بھی کوئی بنیاد نہیں 'صفحہ 100

نصوص میں تبدیلی کی اجازت :'۔۔۔ عملا اسلامی معاشرہ شدید دباو اور دودلی کا شکار ہے۔ جس کے باعث ریاکاری زوروں پر ہے۔۔ایک طرف اسلامی قوانین اور اعتقاد ہیں جن میں علما کے بقول کسی تبدیلی یا ترمیم کی گنجایش نہیں مثلا قتل، زنا، چوری اور دیگر فوجداری جرائم اور غلام لونڈی کی اجازت۔ 'صفحہ 65

وحدت ادیان اور تہذیبوں کے ملاپ کا فلسفہ 'حکمت اور پارسائی کا دعوی اگر تھوڑی دیر کے لئے چھوٹ دیا جاے تو لگے گا کہ یہ ترانہ سننے یا گانے سے کسی تہذیب یا دین کا تختہ نہیں الٹ جاتا' ص86

انسان کو روح کی کتنی غذا چاہئے؟ یعنی اگر عبادت ہی روح کی خوراک ہے تو کتنی عبادت؟ اسلام کے مطابق دن میں پانچ مرتبہ ایک مقررہ معمول کے مطابق عبادت اور رمضان میں اس سے کچھ اور زیادہ؟۔۔ لیکن مسیحیت میں ہفتہ وار اور ہندوں میں دن میں ایک بار دیوی دیوتا کے آگے حاضری یا پرنام روح کو تروتازہ کردیتا ہے ص114۔

مذہب پر عمل کرنا اگر روحانیت ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ دنیا کے چاروں مستعد مذاہب کے عقائد اور عملیات میں اتنی شدید تفاوت کے کیا معنی ہیں؟۔۔۔ ص118

اگر قاری نے قران وحدیث کا سمجھ کر مطالعہ کیا ہو تو یہ تمام مفروضات آن واحد میں باطل نظر آتے ہیں۔ راقم ان شاءاللہ ان باطل عقائد و اعتراضات کا مرحلہ وار جواب دینے کی سعی کرئے گا

ہم پہلے نقطہ اعتراض پر بات کریں گے جس کے بارے میں صاحب کتاب کا کہنا ہے کہ۔

اسلام مکمل ضابطہ حیات نہیں ہے –'ایک بنیادی دعوی جس پر کئی دوسرے دعووں کے محل تعمیر کئے گئے ہیں، یہ ہے کہ اسلام مکمل ضابطہ حیات ہے حالانکہ قران اور حدیث نے ایسا کوئی دعوی نہیں کیا ہے۔ یہ دعوی تہذیبی فخر کے لئے قائم کئے گئے مفروضوں میں سے ہے۔۔۔ 'صفحہ 96۔

نیز مزید آپ کہتے ہیں کہ 'مسلمانوں کو بھی یہ حق حاصل تھا کہ فاتح تہذیب کی حیثیت سے اپنے نظریہ حیات کو مکمل ضابطہ حیات کہتے لیکن یہ سب زراعتی معاشروں کے دور تک ممکن تھا' صفحہ 96۔

یہ باتیں ایسے دیوانے کی بڑ سے زیادہ نہیں کہ جو اسلام کا مارٹن لوتھر کنگ بننا چاھتا ہو لیکن اسے اسلام کی بنیادی اصطلاحات سے کوئی غرض نہ ہو۔اسلام دین اور مکمل ضابطہ حیات ہے۔اس بات میں قران مجید کی تصریحات بالکل صاف ہیں۔ مکمل ضابطہ حیات ہونے کا دعوی کرنے والا ہی یہ بات کہ سکتا ہے کہ جب کسی معاملہ میں خدا اور رسول کا حکم آجائے تو مومنوں کو ماننے یا نہ ماننے کا اختیار باقی نہیں رہتا۔

ترجمہ: کسی مومن مرد اور عورت کو یہ حق نہیں کہ جب کسی معاملہ میں اللہ اور اس کا رسول فیصلہ کر دے تو ان کے لیے اپنے اس معاملہ میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار باقی رہے۔ جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا ہو گیا(الاحزاب 36)

ایک ایسا دین ہی جو مکمل ضابطہ حیات ہونے کا مدعی ہو کہتا ہے کہ فیصلہ صرف کتاب الہیٰ کے مطابق ہونا چاہیئے۔ خواہ وہاں لوگوں کی خواہشات کے مطابق ہو یا نہ ہو۔

ترجمہ: تو ان کے درمیان اسی کتاب کے مطابق فیصلہ کر جو اللہ نے اتاری ہے اور جو حق تیرے پاس اللہ کی طرف سے آیا ہے اس کو چھوڑ کر ان کی خواہشات کی پیروی نہ کر۔(المائدہ 56)

اور وہی دین کہتا ہے کہ کتاب اللہ میں سے کچھ کو ماننا اور کچھ کو رد کر دینا۔ دنیا اور آخرت میں رسوا کن ہے۔

ترجمہ: کیا تم کتاب کی بعض باتوں کو مانتے ہو اور بعض کو نہیں مانتے؟ تم میں سے جو کوئی ایسا کرتا ہے اس کی سزا بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ دنیا کی زندگی میں اس کے لئے رسوائی ہو اور آخرت میں ایسے لوگ شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیئے جائیں گے۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔(البقرہ 85)

مزید براں فرمایا کہ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرہ اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اُن لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں، پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسُول کی طرف پھیر دو اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طریقِ کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔ اے نبی! تم نے دیکھا نہیں اُن لوگوں کو جو دعوٰی تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اُس کتاب پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور ان کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں مگر چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ

کرانے کے لیے طاغوت کی طرف رُجوع کریں، حالانکہ انہیں طاغوت سے کفر کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔۔۔ شیطان انہیں بھٹکا کر راہِ راست سے بہت دُور لے جانا چاہتا ہے۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اُس چیز کی طرف جو اللہ نے نازل کی ہے اور آؤ رسولؐ کی طرف تو ان منافقوں کو تم دیکھتے ہو کہ یہ تمہاری طرف آنے سے کتراتے ہیں۔ پھر اس وقت کیا ہوتا ہے جب اِن کے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی مصیبت ان پر آپڑتی ہے؟ اُس وقت یہ تمہارے پاس قسمیں کھاتے ہوئے آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا کی قسم ہم تو صرف بھلائی چاہتے تھے اور ہماری نیت تو یہ تھی کہ فریقین میں کسی طرح موافقت ہو جائے۔۔۔ اللہ جانتا ہے جو کچھ ان کے دلوں میں ہے، ان سے تعرّض مت کرو، انہیں سمجھاؤ اور ایسی نصیحت کرو جو ان کے دلوں میں اُتر جائے۔ ﴿انہیں بتاؤ کہ﴾ ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لیے بھیجا ہے کہ اذنِ خداوندی کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے۔ اگر انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہوتا کہ جب یہ اپنے نفس پر ظلم کر بیٹھے تھے تو تمہارے پاس آجاتے اور اللہ سے معافی مانگتے، اور رسول بھی ان کے لیے معافی کی درخواست کرتا، تو یقیناً اللہ کو بخشنے والا اور رحم کرنے والا پاتے۔ نہیں، اے محمدؐ! تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اِختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی نہ محسُوس کریں، بلکہ سر بسر تسلیم کر لیں۔ اگر ہم نے انہیں حکم دیا ہوتا کہ اپنے آپ کو ہلاک کر دو یا اپنے گھروں سے نکل جاؤ تو ان میں سے کم ہی آدمی اس پر عمل کرتے۔ حالانکہ جو نصیحت انہیں کی جاتی ہے اگر یہ اس پر عمل کرتے تو یہ ان کے لیے زیادہ بہتری اور زیادہ ثابت قدمی کا موجب ہوتا اور جب یہ ایسا کرتے تو ہم انہیں اپنی طرف سے بہت بڑا اجر دیتے اور انہیں سیدھا راستہ دکھا دیتے۔ جو اللہ اور رسُول کی اطاعت کرے گا وہ ان لوگوں کے ساتھ ہو گا جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء اور صدّیقین اور شہداء اور صالحین۔ کیسے اچّھے ہیں یہ رفیق جو کسی کو میسّر آئیں۔ یہ حقیقی فضل ہے جو اللہ کی طرف سے ملتا ہے اور حقیقت جاننے کے لیے بس اللہ ہی کا علم کافی ہے۔

سورہ النساء ۵۹ تا ۷۰

اب کوئی یہ کہے کہ ان تمام منقولات سے کتاب کی اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں تو ثابت ہوتی ہے مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد نہیں تو پھر اس فرد کی عقل پر ماتم ہی کیا جا سکتا ہے کہ اس نے اسلام کی آفاقیت اور ہمیشگی کی دلیل نہیں دیکھی۔ ا:...
''الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔'' (المائدہ: ۳)

ترجمہ:... ''آج کے دن میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر نعمت تمام کر دی اور تمہارے لئے دین اسلام کو پسند کیا۔''۲:... ''ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ ' وھو فی الآخرۃ من الخاسرین۔''(آل عمران: ۸۵)

ترجمہ:... ''اور جو شخص اسلام کے علاوہ کسی دوسرے دین و مذہب کو اپنائے گا' اللہ کے ہاں اسے قبولیت نصیب نہیں ہو گی اور وہ آخرت میں خسارہ میں ہو گا۔''

تو اگر اسلام مکمل ضابطۂ حیات نہیں ہے تو وہ مکمل دین کیونکر ہو سکتا ہے؟ اسلئے کہ خود اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

''ان الدین عند اللہ الاسلام''(آلِ عمران: ۱۹)

بے شک دین اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسلام ہے

اگر اسلام دین مکمل نہیں تو پھر ناقص ٹھرا کہ اسے اپنے نفاذ کے لئے کسی اور دین یا نظریہ حیات کا سہارا لینا پڑے گا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ دین مغرب، دین پادشاہی یا دین الحاد یا کوئی بھی اور نظام اس بات کی اجازت دے کہ اسلام کو مکمل طور پر اختیار کیا جائے؟ اس سے بڑا سوال یہ اٹھتا ہے کہ دین و مذہب، اپنے ماننے والوں کو مکمل ضابطۂ حیات فراہم نہ کرتا ہو وہ قابلِ تقلید اور لائقِ اقتداء ہے؟ بالفرض اگر اسلام مکمل ضابطۂ حیات نہیں تھا تو کیا یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرض نہ تھا کہ وہ اپنی امت کو بتلاتے کہ اسلام میں فلاں فلاں جگہ نقص اور کمی ہے، اور اس کی تکمیل کے لئے فلاں فلاں دین و مذہب اور قانون و دستور سے مدد لی جائے؟ مگر دنیائے اسلام جانتی ہے کہ آقائے دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی کسی قسم کی کوئی نشاندہی نہیں فرمائی، تو کیا کہا جائے کہ ... نعوذ باللہ... آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے ساتھ خیانت کی ہے؟ کیا ایسا کہنا سمجھنا یا سوچنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوت کے انکار کے مترادف نہیں؟

اس حصہ کا اختتام سید مودودی کے مندرجہ ذیل اقتباس سے کرتا ہوں جو کہ اس 'فتنہ نرگسیت' کے تجدد پر اتمام حجت کرتا ہے اور راقم کو 'ری انونٹنگ دی وہیل' کی حاجت نہیں۔

ہمارے روشن خیال اور تجدد پسند ''حضرات جب کسی مسئلہ پر گفتگو فرماتے ہیں تو ان کی آخری حجت جو ان کے نزدیک سب سے قوی حجت ہوتی ہے یہ ہوتی ہے کہ زمانے کا رنگ یہی ہے۔ ہوا کا رخ اسی طرف ہے۔ دنیا میں ایسا ہی ہو رہا ہے۔ پھر ہم اس کی مخالفت کیسے کر سکتے ہیں۔ اور مخالفت کر کے زندہ کیسے رہ سکتے ہیں۔ اخلاق کا سوال ہو۔ وہ کہیں گے کہ دنیا کا معیار اخلاق بدل چکا ہے۔ مطلب یہ نکلا کہ مسلمان

اس پرانے معیار اخلاق پر کیسے قائم رہیں؟ پردے پر بحث ہوا رشاد ہوگا کہ دنیا سے پردہ اٹھ چکا ہے۔ مراد یہ ہوئی کہ جو چیز دنیا سے اٹھ چکی اس کو مسلمان کیسے نہ اٹھائیں۔ تعلیم پر گفتگو ہو۔ ان کی آخری دلیل یہ ہوگی کہ دنیا میں اسلامی تعلیم کی مانگ ہی نہیں۔ مدعا یہ کھلا کہ مسلمان بچے وہ جنس بن کر کیسے نکلیں جس کی مانگ ہی نہیں۔ اور وہ مال کیوں نہ بنیں جس کی مانگ ہے۔ سود پر تقریر ہو۔ ٹیپ کا بند یہ ہوگا کہ اب دنیا کا کام اس کے بغیر نہیں چل سکتا۔ گویا مسلمان کسی ایسی چیز سے احتراز کیسے کر سکتے ہیں جو اب دنیا کا کام چلانے کے لیے ضروری ہوگئی ہے۔ غرض یہ کہ تمدن، معاشرت، اخلاق، تعلیم، معیشت، قانون، سیاست اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں سے جس شعبے میں بھی وہ اصول اسلام سے ہٹ کر فرنگیت کا اتباع کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے زمانے کا رنگ اور ہوا کا رخ اور دنیا کی رفتار وہ آخری حجت ہوتی ہے جو اس تقلید مغربی یا در حقیقت اس جزوی ارتداد کے جواز پر برہان قاطع سمجھ کر پیش کی جاتی ہے۔ اور خیال کیا جاتا ہے کہ عمارت اسلامی کے اجزاء میں سے ہر اس جز کو ساقط کر دینا فرض ہے جس پر اس دلیل سے حملہ کیا جائے۔

ہم کہتے ہیں کہ شکست وریخت کی یہ تجویزیں جن کو متفرق طور پر پیش کرتے ہو، ان سب کو ملا کر ایک جامع تجویز کیوں نہیں بنا لیتے؟ مکان کی ایک ایک دیوار، ایک ایک کمرہ اور ایک ایک دالان کو گرانے کی علیحدہ علیحدہ تجویزیں پیش کریں، اور ہر ایک پر فرداً فرداً بحث کرنے میں فضول وقت ضائع ہوتا ہے۔ کیوں نہیں کہتے کہ یہ پورا مکان گرا دینے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اس کا رنگ زمانے کے رنگ سے مختلف ہے۔ اس کا رخ ہوا کے رخ سے پھرا ہوا ہے اور اس کی وضع ان مکانوں سے کسی طرح نہیں ملتی جو اب دنیا میں بن رہے ہیں۔

جن لوگوں کے حقیقی خیالات یہی ہیں ان سے تو بحث کرنا فضول ہے۔ ان کی لیے تو صاف اور سیدھا جواب یہی ہے کہ اس مکان کو گرانے اور اس کی جگہ دوسرا مکان بنانے کی آپ زحمت کیوں اٹھاتے ہیں؟ جو دوسرا خوش وضع، خوشنما اور خوش رنگ مکان آپ کو پسند آئے اس میں تشریف لے جائیے۔ اگر دریا کے دھارے پر بہنے کا شوق ہے تو اس کشتی کا لیبل کھرچنے کی تکلیف بھی کیوں اٹھائیے۔ جو کشتیاں پہلے سے بہہ رہی ہیں انہی میں سے کسی میں نقل مقام فرمالیجئے جو لوگ اپنے خیالات اپنے اخلاق، اپنی معاشرت، اپنی معیشت، اپنی تعلیم، غرض اپنی کسی چیز میں بھی مسلمان نہیں ہیں اور مسلمان رہنا نہیں چاہتی ان کے برائے نام مسلمان رہنے سے اسلام کا قطعاً کوئی فائدہ نہیں بلکہ سراسر نقصان ہے۔ وہ خدا پرست نہیں، ہوا پرست ہیں، اگر دنیا میں بت پرستی کا غلبہ ہو جائے تو یقیناً وہ بتوں کو پوجیں گے اگر دنیا میں برہنگی کا رواج عام ہو جائے تو یقیناً وہ اپنے کپڑے اتار پھینکیں گے۔ اگر دنیا نجاستیں کھانے لگے تو یقیناً وہ کہیں گے کہ نجاست ہی پاکیزگی ہے اور پاکیزگی تو سراسر نجاست ہے۔ ان کے دل اور دماغ غلام ہیں اور غلامی ہی کے لیے گھڑے گئے ہیں۔ آج فرنگیت کا غلبہ ہے اس لیے اپنے باطن سے لے کر ظاہر کے ایک ایک گوشے تک وہ فرنگی بننا چاہتے ہیں۔ کل اگر حبشیوں کا غلبہ ہو جائے تو یقیناً وہ حبشی بنیں گے۔

اپنے چہروں پر سیاہیاں پھیریں گے۔اپنے ہونٹ موٹے کریں گے۔اپنے بالوں میں حبشیوں کے سے گھونگھر پیدا کریں گے۔ہر اس شے کی پوجا کرنے لگیں گے۔جو حبش سے ان کو پہنچے گی۔ایسے غلاموں کی اسلام کو قطعاً ضرورت نہیں۔بخدا اگر کروڑوں کی مردم شماری میں سے ان سب منافقوں اور غلام فطرت لوگوں کے نام کٹ جائیں اور دنیا میں صرف چند ہزار وہ مسلمان رہ جائیں جن کی تعریف یہ ہو کہ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ (المائدہ, 54) تو اسلام اب سے بدر جہاز یادہ طاقتور ہو گا اور ان کروڑوں کا نکل جانا اس کے حق میں ایسا ہو گا جیسے کسی مریض کے جسم سے پیپ اور کچ لہو نکل جائے۔

نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ؕ (المائدہ, 52)۔

نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ؕ (المائدہ, 52)

ہم کو خوف ہے کہ ہم پر مصیبت آجائے گی۔

یہ آج کوئی نئی آواز نہیں بہت پرانی آواز ہے۔جو منافقوں کی زبان سے بلند ہوتی رہی ہے۔یہی آواز نفاق کی اس بیماری کا پتہ دیتی ہے جو دلوں میں چھپی ہوئی ہے۔اسی آواز کو بلند کرنے والے ہمیشہ مخالفین اسلام کے کیمپ کی طرف لپکتے رہے ہیں۔ہمیشہ سے انہوں نے اللہ کی قائم کی ہوئی حدوں کو پاؤں کی بیڑیاں اور گلے کا طوق ہی سمجھا ہے۔ہمیشہ سے ان کو احکام خدا و رسول کا اتباع گراں ہی گزرتا ہے۔اطاعت میں جان و مال کا ضیاع اور نافرمانی میں حیات دنیا کی ساری کامرانیاں ہمیشہ سے ان کو نظر آتی رہی ہیں۔پس ان کی خاطر خدا کی شریعت کو نہ ابتداء میں بدلا گیا تھا' نہ اب بدلا جا سکتا ہے اور نہ کبھی بدلا جائے گا۔یہ شریعت بزدلوں اور نامردوں کے لیے نہیں اتری ہے۔نفس کے بندوں اور دنیا کے غلاموں کے لیے نہیں اتری ہے۔ہوا کے رخ پر اڑنے والے خش و خاشاک' اور پانی کے بہاؤ پر بہنے والے حشرات الارض اور ہر رنگ میں رنگ جانے والے بے رنگوں کے لیے نہیں اتری ہے۔یہ ان بہادر شیروں کے لیے اتری ہے جو ہوا کا رخ بدل دینے کا عزم رکھتے ہیں۔جو دریاؤں کی روانی سے لڑنے اور اس کے بہاؤ کو پھیر دینے کی ہمت رکھتے ہیں۔جو صبغۃ اللہ کو دنیا کے ہر رنگ سے زیادہ محبوب رکھتے ہوں اور اسی رنگ میں تمام دنیا کو رنگ دینے کا عزم رکھتے ہوں۔مسلمان جس کا نام ہے وہ دریا کے بہاؤ پر بہنے کے لیے پیدا ہی نہیں کیا گیا ہے۔اس کی آفرینیشن کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ زندگی کے دریا کو اس پر رواں کر دے جو اس کے ایمان و اعتقاد میں راہ راست ہے۔صراط مستقیم ہے۔اگر دریا نے اپنا رخ اس راستہ سے پھیر دیا تو اسلام کے دعوے میں وہ شخص جھوٹا ہے۔جو اس

بدلے ہوئے رخ پر بہنے ک لیے راضی ہو جائے۔ حقیقت میں جو سچا مسلمان ہے وہ اس غلط رو دریا کی رفتار سے لڑے گا۔ اس کا رخ پھیرنے کی کوشش میں اپنی پوری قوت صرف کر دے گا۔ کامیابی اور ناکامی کی اس کو قطعاًپرواہ نہ ہو گی۔ وہ ہر اس شخص کو گوارا کر لے گا جو اس لڑائی میں پہنچے یا پہنچ سکتا ہو۔ حتیٰ کہ اگر دریا کی روانی سے لڑتے لڑتے اس کے بازو ٹوٹ جائیں۔ اس کے جوڑ بند ڈھیلے ہو جائیں اور پانی کی موجیں اس کو نیم جان کر کے کسی کنارے پر پھینک دیں تب بھی اس کی روح ہر گز شکست نہ کھائے گی۔ ایک لمحہ کے لیے بھی اس کے دل میں اپنی اس ظاہری نامرادی پر افسوس یا دریا کی رو پر بہنے والے کافروں یا منافقوں کی کامرانیوں پر رشک کا جذبہ راہ نہ پائے گا۔

قرآن تمہارے سامنے ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی سیرتیں تمہارے سامنے ہیں۔ ابتداء سے لے کر آج تک علمبرداران اسلام کی زندگی تمہارے سامنے ہیں۔ کیا ان سب سے تم کو یہی تعلیم ملتی ہے کہ ہوا جدھر اڑائے ادھر اڑ جاؤ؟ پانی جدھر بہائے ادھر بہہ جاؤ؟ زمانہ جو رنگ اختیار کرے اسی رنگ میں رنگ جاؤ؟ اگر مدعا یہی ہوتا تو کسی کتاب کے نزول اور کسی نبی کی بعث کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ہوا کی موجیں تمہاری ہدایت کے لیے اور حیات دنیا کا بہاؤ تمہاری رہنمائی کے لیے اور زمانے کی نیرنگیاں تمہیں گرگٹ کی روش سکھانے کے لیے کافی تھیں۔ خدا نے کوئی کتاب ایسی ناپاک تعلیم دینے کے لیے نہیں بھیجی اور نہ اس غرض کے لیے کوئی نبی مبعوث کیا۔ ذات حق کی طرف سے تو جو پیغام آیا ہے۔ اس لیے آیا ہے کہ دنیا جن غلط راستوں پر چل رہی ہے ان سب کو چھوڑ کر ایک سیدھا راستہ مقرر کرے۔ اس کے خلاف جتنے راستے ہوں ان کو مٹائے اور دنیا کو ان سے ہٹانے کی کوشش کرے' ایمانداروں کی ایک جماعت بنائے جو نہ صرف خود اس سیدھے راستے پر چلیں بلکہ دنیا کو بھی اس کی طرف کھینچ لانے کی کوشش کریں۔ انبیاء علیہم السلام اور ان کے متبعین نے ہمیشہ اسی غرض سے جہاد کیا ہے۔ اس جہاد میں اذیتیں اٹھائی ہیں۔ نقصان برداشت کیے ہیں۔ اور جانیں دی ہیں۔ ان میں سے کسی نے مصائب کے خوف یا منافع کے لالچ سے رفتار زمانہ کو کبھی اپنا مقتدا نہیں بنایا۔ اب اگر کوئی شخص یا کوئی گروہ ہدایت آسمان کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے میں نقصان اور مشکلات اور خطرات دیکھتا ہے اور ان سے خوفزدہ ہو کر کسی ایسے راستے پر جانا چاہتا ہے جس پر چلنے والے اس کو خوشحال' کامیاب اور سربلند نظر آتے ہیں تو وہ شوق سے اپنے پسندیدہ راستے پر جائے۔ مگر وہ بزدل اور حریص انسان اپنے نفس کو دنیا کو یہ دھوکہ دینے کی کوشش کیوں کرتا ہے کہ وہ خدا کی کتاب اور اس کے نبی کے بتائے ہوئے طریقے کو چھوڑ کر بھی اس کا پیرو ہے؟ نافرمانی خود ایک بڑا جرم ہے۔ اس پر جھوٹ اور فریب اور منافقت کا اضافہ کر کے آخر کیا فائدہ اٹھانا مقصود ہے۔؟

یہ خیال کہ زندگی کا دریا جس رخ پر بہہ گیا اس سے وہ پھیرا نہیں جا سکتا عقلاً بھی غلط ہے اور تجربہ و مشاہدہ بھی اس کے خلاف گواہی دیتا ہے۔ دنیا میں ایک نہیں سینکڑوں انقلاب ہوئے ہیں اور ہر انقلاب نے اس دریا کے رخ کو بدلا ہے۔ اس کی سب سے زیادہ نمایاں خود

اسلام ہی میں موجود ہے۔ محمد جب دنیا میں تشریف لائے تو زندگی کا دریا کس رخ پر بہہ رہا تھا؟ کیا تمام دنیا پر کفر و شرک کا غلبہ نہ تھا؟ کیا استبداد اور ظلم کی حکومت نہ تھی؟ کیا انسانیت کو طبقات کی ظالمانہ تقسیم نے داغدار نہ بنا رکھا تھا؟ کیا اخلاق پر خواہش، معاشرت پر نفس پرستی، معیشت پر ظالمانہ جاگیرداری و سرمایہ داری اور قانون کی بے اعتدالی کا تسلط نہ تھا۔ مگر ایک تن واحد نے اٹھ کر تمام دنیا کو چیلنج دے دیا۔ تمام ان غلط خیالات اور غلط طریقوں کو رد کر دیا جو اس وقت دنیا میں رائج تھے۔ ان سب کے مقابلہ میں اپنا ایک عقیدہ اور اپنا ایک طریقہ پیش کیا اور چند سال کی مختصر مدت میں اپنی تبلیغ اور جہاد سے دنیا کے رخ کو پھیر کر اور زمانہ کے رنگ کو بدل کر چھوڑا۔

تازہ ترین مثال اشتراکی تحریک کی ہے۔ انیسویں صدی میں سرمایہ داری کا تسلط اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ کوئی بزدل مرغ باد نما اس وقت یہ تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ کہ جو نظام ایسی ہولناک سیاسی اور جنگی قوت کے ساتھ دنیا پر مسلط ہے اس کو الٹ دینا بھی ممکن ہے۔ مگر انہی حالات میں ایک شخص کارل مارکس نامی اٹھا اور اس نے اشتراکیت کی تبلیغ شروع کی۔ حکومت نے اس کی مخالفت کی، وطن سے نکالا گیا۔ ملک ملک کی خاک چھانتا پھرا۔ تنگ دستی اور مصیبت سے دوچار ہوا۔ مگر مرنے سے پہلے اشتراکیوں کی ایک طاقت ور جماعت پیدا کر گیا۔ جس نے چالیس سال کے اندر نہ صرف روس کی سب سے زیادہ خوفناک طاقت کو الٹ کر رکھ دیا بلکہ تمام دنیا میں سرمایہ داری کی جڑیں ہلا دیں اور اپنا ایک معاشی اور تمدنی نظریہ اس قوت کے ساتھ پیش کیا کہ آج دنیا میں اس کے متبعین کی تعداد روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اور ان ممالک کے قوانین بھی اس سے متاثر ہو رہے ہیں جن پر سرمایہ داری کی حکومت گہری جڑوں کے ساتھ جمی ہوئی ہے۔

مگر انقلاب یا ارتقاء ہمیشہ قوت ہی کے اثر سے رونما ہوا ہے۔ اور قوت ڈھل جانے کا نام نہیں ڈھال دینے کا نام ہے۔ مڑ جانے کو قوت نہیں کہتے۔ موڑ دینے کو کہتے ہیں۔ دنیا میں کبھی نامردوں اور بزدلوں نے کوئی انقلاب پیدا نہیں کیا۔ جو لوگ اپنا کوئی اصول، کوئی مقصد حیات، کوئی نصب العین نہ رکھتے ہوں جو بلند مقصد کے لیے قربانی دینے کا حوصلہ نہ رکھتے ہوں۔ جن کو دنیا میں محض آسائش اور سہولت ہی مطلوب ہو۔ جو ہر سانچے میں ڈھل جانے اور ہر دباؤ سے دب جانے والے ہوں۔ ایسے لوگوں کا کوئی قابل ذکر کارنامہ انسانی تاریخ میں نہیں پایا جاتا۔ تاریخ بنانا بہادر مردوں کا کام ہے۔ انہی نے اپنے جہاد اور اپنی قربانیوں سے زندگی کے دریا کا رخ پھیرا ہے۔ دنیا کے خیالات بدلے ہیں۔ مناہج عمل میں انقلاب برپا کیا ہے۔ زمانے کی رنگ میں رنگ جانے کی بجائے زمانے کو خود اپنے رنگ میں رنگ کر چھوڑا ہے۔

پس یہ نہ کہو کہ دنیا جس راستہ پر جاری ہے اس سے وہ پھیری نہیں جاسکتی اور زمانے کی جو روش ہے اس کا اتباع کیے بغیر چارہ نہیں۔ مجبوری کا جھوٹا دعویٰ کرنے کی بجائے تم کو خود اپنی کمزوری کا سچا اعتراف کرنا چاہیے اور جب اس کا اعتراف کر لو گے تو تم کو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ کمزور کے لیے دنیا میں نہ کوئی مذہب ہو سکتا ہے، نہ کوئی اصول اور نہ کوئی ضابطہ اس کو تو ہر زور آور سے دبنا پڑے گا۔ ہر طاقتور کے آگے جھکنا پڑے گا۔۔ وہ کبھی اپنے کسی اصول اور کسی ضابطہ کا پابند نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی مذہب اس کے لیے اپنے اصول بدلتا چلا جائے تو وہ سرے سے کوئی مذہب ہی نہ رہے گا۔

تہذیبی نرگسیت-ایک تہذیبی مرعوب کی سرگذشت کااصولی جواب—حصہ سوم

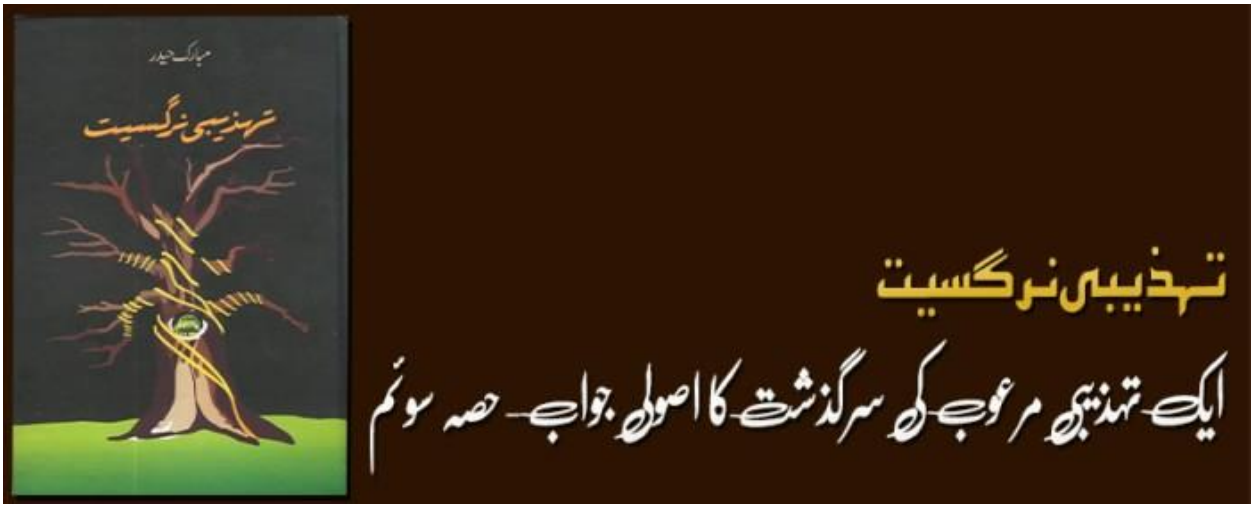

گذشتہ کچھ عرصے سے مشاہدے میں آیا ہے کہ تہذیبی نرگسیت کا باطل نظریہ خام ذہنوں میں مستقل شکوک و شبہات کا باعث بن رہا ہے۔ خصوصا لبرل اور لادینی عناصر اپنی تحاریر اور گفتگو میں اس کتاب کا اکثر حوالہ دیتے رہتے ہیں۔ نئے ناپختہ اذہان اس فتنے سے متاثر نا ہوں، اس لئے ہم نے پچھلے دو حصوں میں بتدریج اس فتنے کے بنیادی تضادات، نصوص قطعیہ پر مصنف کے اعتراضات اور اسلام کے مکمل ضابطہ حیات ہونے کے متعلق قران و حدیث سے دلائل پیش کئے ہیں۔ اس تیسرے حصے میں ہماری کوشش ہو گی کہ اس خود ساختہ 'نرگسیت' کی حقیقت اور غلبہ اسلام کے بارے میں نصوص قطعیہ سے اتمام حجت کریں اور اس فتنے کے علمی سرقے پر کچھ روشنی ڈالیں۔ نیز ہم یہ بات واضع کرتے چلیں کہ اس مضمون اور اس کے پہلے دو حصوں کے مخاطب وہ شعوری مسلمان ہیں جو اللہ اور اسکے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین کو تہ دل سے تسلیم کرتے ہیں اور اس نرگسی فتنے کے اسباب و حقایق پر اپنی تشفی قلب کے لئے مزید معلومات کے خواہاں ہیں۔

پاکستان میں سیکولر اور لبرل طبقے کا ہمیشہ سے یہ وطیرہ رہا ہے کہ وہ ہر انسانی مسئلے، پریشانی اور ناکامی کی بنیادیں مذہب سے جوڑنے پر مصر ہوتے ہیں اور اس کے لئے نت نئے اعتراضات تراشتے رہتے ہیں، نرگسیت کا بے معنی اعتراض بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ کیونکہ اس

طبقے کی اپنی سوچ مغرب سے مستعار لی ہوئی ہوتی ہے، اسی لئے وہ علمی سرقے سے بھی گریز نہیں کرتے اور لی ہاورڈ ہاجز کے 2002 کے 'دی ایرانین' میں چھپنے والے مضمون 'وکٹمالوجی' میں تصرف کر کے کتابی شکل دے دیتے ہیں اور بیشتر پیراگراف من و عن ترجمے کر کے بغیر حوالے کے چھاپ دیتے ہیں۔ سرقے سے سرقے کا سفر شاید اتنا طویل نہیں۔ مزید تفصیل کے لیئے حوالہ جات ملاحظہ ہوں۔

بہر حال، یہ تو ہے ان لوگوں کے علمی دیوالیے پن کا حال۔ مجھے غالب گمان ہے کہ اس نظریے کے حامی افراد ضرور کہیں گے کہ چلیں سرقہ ہی سہی، بات تو درست ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ لبرل تعصب کی پٹی ہٹا کر دیکھا جاے تو یہ باتیں علمی، عقلی و عملی بنیادوں پر بلکل پورا نہیں اترتیں۔ ہم مندرجہ زیل دس نکات میں یہ بات واضع کرتے چلیں گے۔

اولا—جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا تھا، در حقیقت اسلامی نرگسیت یا 'مسلم نارسسززم' کی اصطلاح اسلام دشمن مستشرقین کی اختراع ہے، گوگل کی اس تکنیکی دنیا میں اس دعوی کی تصدیق کرنا کوئی مشکل نہیں، مسلم نارسسززم واوین 'کوٹس' میں لکھیں اور جو نتائج آئیں ان مضامین اور ان کے مصنفین کی جانبداری علمی پیرائے میں پرکھیں، آپ کو میرے 'سازشی نظریات' پر شائد یقین آجائے۔ اس اصطلاح کا استعمال اسلام دشمنی کے لئے تو نہایت موزوں ہے، تجدد، خود تنقیدی اور بہتری کے لئے نہیں۔ نیز اس اصطلاح کا کریڈٹ بھی گمان غالب ہے کہ لی ہاورڈ ہاجز ہی کو جائے گا، مبارک حیدر یا انکے حوارین کو نہیں۔

ثانیا—بقول مصنف نارسززم اپنے آپ کو، اپنے نظریات کو یا اپنے مذہب کو دیوانگی کی حد تک چاہنے کا نام ہے۔ مغرب میں مثل مشہور ہے کہ نرگسی فرد اپنے آپ سے اس قدر محبت کرتا ہے کہ اس کا بس نہیں چلتا کہ اپنی جنس تبدیل کر کے اپنے آپ ہی سے شادی کر لے۔ آج مصنف جس تہذیبی نرگسیت کو ام الخبائث قرار دے رہے ہیں، کیا وہ اس پیمانے پر پورا اترتی ہے؟ اسلامی تہذیب کی اساس توحید، رسالت، عبادت، پاکیزگی، تقوی، حسن سلوک، ایمانداری، اور اسوہ حسنہ پر عمل کرنے میں ہے۔ آج جن افراد کو آپ تہذیبی نرگسیت کا منبع قرار دینے پر مصر ہیں، کیا ان میں اسلامی تہذیبی رویوں کی کوئی ہلکی سی رمق بھی دکھائی دیتی ہے؟ اگر یہ حقیقتا اپنی تہذیب پر فخر و اعزاز کا معاملہ ہوتا تو یہ لوگ پہلے اپنی تہذیب کو اپناتے اور اس پر عمل کرتے نہ کہ اس کے قطعی مخالف اعمال کو اپنا وطیرہ بناتے۔ در حقیقت فکر و استنبطاط کی صلاحیتوں سے یکسر محروم مصنف اور انکی صنف کے لبرل تشدد پسند لوگ جابر و کرپٹ حکمرانوں، سماجی و معاشرتی تفاوت سے پیدا ہونے والے رجحانات، نیو امپیریلزم اور بیرونی حملہ آوروں جیسے بڑے مسائل کے متشددانہ رد عمل کو فورا مذہب سے جوڑ دیتے ہیں کیونکہ شائد یہ آسان ترین شکار ہے۔ نیز اگر کوئی مذہب کے نام پر تشدد کا درس دیتا ہے تو وہ ایک قبیح فعل کر رہا ہے اور ہر مذہب اور

معاشرے میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں، اس کے لئے پوری مسلم امہ کو مورد الزام لگانا کیا معنی رکھتا ہے۔ اسی طرح جرائم یا قانون شکنی کے باعث ہونے والے واقعات کو بھی تہذیبی نرگسیت کے کھاتے میں ڈالنا ان لبرل متشدد دین کا نیا حربہ ہے جس کی کوئی منطقی وجہ ہماری عقل سے بالاتر ٹھہری۔

ثالثا– غیرت دین، اپنے نظریے، وطن اور آبا سے محبت انسان کی فطرت میں شامل ہے، اس کو نرگسیت قرار دینا نہایت بے اصل بات ہے۔ اگر مسلمان اپنے ماضی اور اپنی تہذیب پر فخر کرتے ہیں تو یہ کس قاعدے کی رو سے جرم ہے؟ مصنف مزید لکھتے ہیں

مسلمان کا ایمان اعلی، اخلاق اعلی، اس کی عبادت اعلی۔ اس کی دنیاداری اعلی۔ یہ دنیا اس کی، اگلا جہان بھی اس کا۔ باقی ساری دنیا جہنمی۔ باقی سارے انسان کفر اور جاہلیت پر رکے ہوے' صفحہ 91

اپنے ایمان وایقان پر اعلی وارفعی ہونے کا گمان کرنا مصنف کے نزدیک نرگسیت کی علامت ہے جبکہ یہ بات مسلمان قران وحدیث کی تائید میں سمجھتے ہیں کہ ان کا ایمان اور انکا دین ہی واحد درست دین ہے (ان الدین عنداللہ الاسلام)۔ لبرلزم کی جس تحریک سے مصنف کا تعلق ہے اسکے نزدیک ایک کافر، ایک ہمجنس پرست، ایک بت پرست اور ایک موحد میں کوئی فرق نہیں۔ اگر ان سب کے دنیوی اعمال درست ہوں اور انہوں نے دنیا میں لوگوں کو نفع پہنچایا ہو یہ اس 'خیالی' جنت میں جانے کے برابر کے حقدار ہیں چاہے وہ اللہ اور اسکے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے باغی ہی کیوں نا ہوں۔ ان نام نہاد جدت پسندوں کی سمجھ میں یہ سیدھی سی بات نہیں آسکتی کہ اگر خالق کائنات پر ایمان رکھتے ہو تو جنت ودوزخ کے بارے میں اپنے گمان پر نا جاو بلکہ اللہ اور اسکے رسول کے فرمان کو درست جانو۔

یقین جانو کہ کافروں کے لیے جو کچھ زمین میں ہے بلکہ اسی طرح اتنا ہی اور بھی ہو اور وہ اس سب کو قیامت کے دن عذاب کے بدلے فدیہ میں دینا چاہیں تو بھی یہ ناممکن ہے کہ ان کا یہ فدیہ قبول کر لیا جائے، ان کے لیے تو دردناک عذاب ہی ہے۔ وہ چاہیں گے کہ وہ جہنم سے نکل بھاگیں لیکن وہ ہرگز اس میں نہیں نکل سکیں گے اور ان کے لیے ہمیشگی والا عذاب ہوگا" المائدۃ(37 – 36)

اس ضمن میں میرا یہ ہرگز مقصد نہیں کہ مسلمانوں کو جنت کا کوئی 'فری پاس' مل گیا ہے بلکہ قران وحدیث کا مطالعہ رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ حقیقت اس سے بعید ہے۔ لیکن اگر مسلم امہ اپنی الہامی کتب کے مطابق اپنے عقیدہ توحید کی بنا پر اعمال کی بارگاہ الہیہ میں قبولیت پر یقین رکھتی ہے تو اس سے لبرلزم کے ایوان کیوں لرزنے لگتے ہیں؟ کوئی باشعور مسلمان اس بات کو تسلیم نہیں کرے گا کہ بے گناہوں کی جان لینے والے ایک خودکش حملہ آور کا' ایمان اعلی، اخلاق اعلی، اس کی عبادت اعلی۔ اس کی دنیاداری اعلی۔ یہ دنیا اس کی،

اگلا جہان بھی اس کا' ہے بلکہ وہ ببانگ دہل یہ کہے گا کہ ایک مسلمان ایسا فعل کر ہی نہیں سکتا کیونکہ یہ اسلامی تہذیب کے سراسر خلاف ہے۔ تہذیبی نرگسیت کا الزام لگانے والوں کو ایک مسلمان یہ ضرور یاد دلائے گا کہ اسلامی تہذیب کے اصول و مبادی ہمیں سکھاتے ہیں کہ ایک انسان کا قتل تمام انسانیت کا قتل اور ایک انسان کی جان بچانا تمام انسانیت کو بچانے کے مترادف ہے۔

رابعا—مصنف کے وضع کردہ اصول کی بناپر کہ کسی تہذیب نے سائینسی و تخلیقی میدان میں سو دو سو سال سے اگر کوئی سرگرمی نہ دکھائی ہو اسے 'ترقی یافتہ' تہذیب کا دین (طریقہ) اختیار کر لینا چاہئے، افریقہ کی تمام اقوام کو عرصہ دراز پہلے اپنے سفید فام حکمرانوں کی تہذیب و تمدن کا اپنا لینا لازم ٹھرا۔ اپنی تہذیب اور شناخت پر فخر کرنا نرگسیت ٹھہرا تو دنیا کی ہر قوم اس' گروپ نارسسزم' کا شکار قرار پائے گی۔ یہ مصنف کی خام خیالی ہے کہ یہ فطری رجحان' مردہ اقوام' میں پایا جاتا ہے۔ اقوام عالم کی تاریخ اس فخر و ناز سے عبارت ہے۔

خامسا—یہ تمام کتاب 'اینکڈوٹل ایوڈنسز' یا واقعاتی شہادتوں سے بھرپور ہے جن کی کوئی علمی و تجرباتی اہمیت نہیں۔ مثلا کسی مدرسے میں پڑھانے والے فرد کی کسی طالبعلم سے دست درازی کو' بلینکٹ اسٹیٹمنٹ' بنا کر تمام علما، اساتذہ اور دینی مدارس کو رگیدنا ایک عام مثال ہے۔ مصنف کے مطابق چونکہ کچھ مفاد پرست لوگ غریب ملازمین کا استحصال کرتے ہیں اور اسوقت انہیں خدا یاد نہیں آتا، یہ تو یقینا اسلام و مسلمانوں کی مجموعی خامی ہے۔ اگر عرب ممالک اپنے مسلمان بھائیوں کو رہایش یا شہریت کا حق نہیں دیتے تو یہ مسلم اخوت کے نظریے کی خامی ہے (یہ نکتہ ہاورڈ ہاجز نے بھی بعینہ اٹھایا ہے)—اس طرح کی غیر حقیقت پسندانہ سوچ بڑی محرومی ہے اور کوئی باشعور مسلمان ان باتوں پر اسلامی تہذیب کو مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتا۔

ستتہ—آحادیث مبارکہ کی روشنی میں یہ بات واضع ہے کہ مسلمان ایک جسد کی طرح ہیں جس کا ایک عضو تکلیف میں ہو تو دوسرا اس درد کو محسوس کرتا ہے۔ یہ امت مسلمہ کا خاصہ ہے کہ چین و عرب سے لیکر افریقہ اور جزائر پولینیشیا تک کے مسلمان ایک امت واحد کی لڑی میں پروے ہوے ہیں۔ جس نرگسیت کی طرف مبارک حیدر صاحب کا اشارہ ہے اور جو فکر ان کی سیکیولر ذہنیت میں کھٹکتی ہے وہ ملت بیضا کی اجتماعیت کا تصور ہے۔ انکی مرعوبانہ سوچ اس بات کا ادراک نہیں رکھتی کہ مسلمانوں کا عروج و زوال مادی ترقی سے نہیں بلکہ اسلام کے اصولوں پر عمل کرنے سے وابستہ ہے۔ اپنا قبلہ لندن و واشنگٹن کو بنانے اور حرم سے رشتہ کاٹنے کے بجاے ہمیں حکم ہے کہ 'ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے، اس لیے بھیجا ہے کہ کہ حکم الہیٰ کے مطابق اس کی اطاعت کی جائے' النسا۔ لیکن حیدر صاحب تو حج و عمرہ کو' ایک منافع بخش کاروبار' اور نماز کو' میکانیکی حرکات' سے کچھ زیادہ گردانتے سے سخت گریزاں ہیں۔

سبعہ۔ یہ فتنہ نرگسیت اور اس کے حوارین غلبہ اسلام کی اہمیت اور اقامت دین کی فرضیت پر اعتراض کرتے ہوئے اسے ایک من گھڑت بات قرار دیتے ہیں۔ اس زمن میں مصنف نے 'غلبہ اسلام کے مفروضے' کے تحت ایک مستقل باب باندھا ہے؛ قران و حدیث کا بنیادی علم رکھنے والا ہر فرد یہ بات جانتا ہے کہ یہ بات نصوص قطعیہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے متواتر فعل سے ثابت ہے کہ اللہ کے نظام کے نفاذ کے لئے دامے درمے سخنے جدوجہد کرنا مسلمان پر لازم ہے۔

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ فَإِنِ انتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ بَصِيرٌ

اور (اے اہلِ حق!) تم ان (کفر و طاغوت کے سرغنوں) کے ساتھ جنگ کرتے رہو، یہاں تک کہ کوئی فتنہ (باقی) نہ رہ جائے اور سب دین (یعنی نظامِ بندگی و زندگی) اللہ ہی کا ہو جائے، پھر اگر وہ باز آ جائیں تو بیشک اللہ اس (عمل) کو جو وہ انجام دے رہے ہیں، خوب دیکھ رہا ہے 08:39

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

عن ابن عمر رضی الله عنهما، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال أمرت أن أقاتل الناس، حتى يشهدوا أن لا إله إلا الله، وأن محمدا رسول الله، ويقيموا الصلاة، ويؤتوا الزكاة، فإذا فعلوا ذلك عصموا مني دماءهم وأموالهم إلا بحق الإسلام، وحسابهم على الله تعالى) رواه البخاري ومسلم.

مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں نے لوگوں سے لڑتا رہوں یہاں تک کہ وہ اس بات کی شہادت دیں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول اللہ ہیں اور نماز قائم کریں اور زکوۃ ادا کریں جب وہ یہ کام کریں تو انہوں نے مجھ سے اپنے خون اور مال محفوظ کر لئے مگر اسلام کے حق کے ساتھ ان کا حساب اللہ کے ذمے ہے۔ (بخاری و مسلم)

مصنف خود عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ کی شرائط ثلاثہ (اسلام، جزیہ یا جنگ) کو نقل کرتے ہیں لیکن مغربی سوچ سے مرعوبیت کا یہ عالم ہے کہ وہ اسکو اسلامی سلطنت کے پھیلاو کا انسانی ناکہ الہامی رجہان قرار دینے میں دیر نہیں لگاتے جو کہ سراسر ایک بے بنیاد الزام ہے۔ مصنف کو قران کا یہ واضع حکم شائد نظر نہیں آتا کہ قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّىٰ يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَن يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ

(اے مسلمانو!) تم اہلِ کتاب میں سے ان لوگوں کے ساتھ (بھی) جنگ کرو جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں نہ یومِ آخرت پر اور نہ ان چیزوں کو حرام جانتے ہیں جنہیں اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حرام قرار دیا ہے اور نہ ہی دینِ حق (یعنی اسلام) اختیار کرتے ہیں، یہاں تک کہ وہ (حکمِ اسلام کے سامنے) تابع و مغلوب ہو کر اپنے ہاتھ سے خراج ادا کریں۔ 9:29

ثمانیہ – جہاد فی سبیل اللہ کی مختلف اقسام میں دفاعی جنگ، قصاص، مظلوموں کی مدد، معاہدہ توڑنے کی سزا کے لئے لڑنا شامل ہیں لیکن ہر بار اس بات کی تاکید کر دی گئی ہے کہ مسلمان حدود اللہ کو پایمال نا کریں۔

وَقَاتِلُواْ فِي سَبِيلِ اللّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلاَ تَعْتَدُواْ إِنَّ اللّهَ لاَ يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ

اور للہ کی راہ میں ان سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں (ہاں) مگر حد سے نہ بڑھو، بیشک للہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں فرماتا 2:190

ان واضع قرانی احکامات و آحادیث کے ہوتے ہوئے غلبہ اسلام کے لئے جدوجہد کی فرضیت کو ایک من گھڑت بات وہی کہ سکتا ہے جس کے دل میں ناخوف خدا ہو اور نا عقلی و نقلی دلائل کا کوئی لحاظ۔۔

تسعتہ - تہذیبی نرگسیت سے اگر آپ کی مراد 'وے آف لایف' کو بحال رکھنے کی جدوجہد ہے تو یہ تو رحمانی اور شیطانی تہذیبوں کی جنگ ہے جو کہ روز ازل سے جاری ہے اور یوم الدین تک جاری رہے گی۔ ہر تہذیب اپنے وے آف لایف کو برقرار رکھنا چاھتی ہے۔ سابق امریکی صدر بش کا یہ کہنا تھا کہ 'یہ لوگ ہمارے طریق زندگی، آزادی اور جمہوریت سے نفرت کرتے ہیں'، ہر قوم کی طرح امریکی قوم کو بھی اپنے طریق زندگی اور تہذیب سے محبت کرنے اور اس کی بقا کے لئے جان لڑا دینے کا پورا حق ہے۔ مبارک حیدر صاحب کو چاہیے تھا کہ وہ کہتے کہ یہ نرگسیت آپ کو نقصان پہنچا رہی ہے، اسے تبدیل کرنے میں عافیت ہے، لیکن انہوں نے یہ طے کر رکھا ہے کہ سمجھوتا ہمیں نے کرنا ہے۔ لارا انگرم تو لباس کی قید سے آزادی کو اپنا وے آف لایف سمجھ کر اسکا دفاع کرے لیکن اگر ہم پردے کے بارے میں کچھ کہیں تو وہ نرگسیت کہلائے۔ فرانس آزادی رائے کا نام نہاد علمبردار حجاب پر پابندی لگانے میں حق بجانب ٹھرے لیکن اگر ہمارے لوگ شرعی سزاوں کے نفاذ پر زبان کھولیں تو اسے انتہا پسندی اور بربریت کا نام دیا جائے۔ جو نام نہاد نرگسیت ہمارے لئے زہر قاتل ہے، یورپ کے لئے اکثیر۔ سبحان اللہ۔

اربعہ۔ مذہب بیزار لوگ جو دین و دنیا کو علیحدہ علیحدہ کرنے کے لئے عرصہ دراز سے سر گرم ہیں، ان کی یہ نئی تحریکِ نرگسیت اس بات کے لئے صرف ایک بہانہ ہے کہ مسلمانوں کے مسائل کا منبع ان کی دینی حمیت اور وابستگی کو قرار دیا جائے۔ بے شک امت مسلمہ میں بگاڑ موجود ہے اور من الحیث القوم ہم بے شمار بیماریوں کا شکار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تعداد کی اکثریت کے باوجود سمندر کے جھاگ کی مانند ہماری کوئی اہمیت نہیں۔ لیکن اپنے دین سے محبت اور اسلامی تہذیب سے لگاو ان مسائل کی جڑ نہیں بلکہ اس سے نکلنے کا آخری ذریعہ ہے۔ بے شک مسلمانوں کو اپنے مسائل قران و سنت کی روشنی میں حل کرنے اور اپنی ترجیحات متعین کرنے کی ضرورت ہے۔ اسلامی ممالک میں ظالم نااہل حکمرانوں سے نجات، کرپشن کا خاتمہ، جہالت سے جنگ اور تعلیم کا فروغ، عصری علوم و فنون، فلسفہ، آرٹ و دیگر علوم کی ترویج اسلامی تہذیب کا حصہ ہیں، اس سے متصادم نہیں۔

یہ (منکرینِ حق) چاہتے ہیں کہ وہ اللہ کے نور کو اپنے منہ (کی پھونکوں) سے بجھا دیں، جبکہ اللہ اپنے نور کو پورا فرمانے والا ہے اگرچہ کافر کتنا ہی ناپسند کریں 61–الصّفّ

اللہ سبحان تعالی ہمیں دور جدید کے ان فتنوں سے بچائے۔ آمین

حوالہ جات۔

سانجھ پبلیکیشن

لی ہاورڈ ہاجز۔ ایرانین

وارڈ چرچل

سیلفشنس اور سیلف لو–ایرک فرام

مغالطے مبالغے۔ایک اسم با مسمی کتاب

اس کتاب کے تیرہ عدد ابواب میں بحث کا جواز، مبالغے اور مغالطے: اسلامی سلطنت کا مغالطہ، پارسائی کا مبالغہ، آزاد میڈیا کا مبالغہ، عدلیہ کے تقدس کا مبالغہ، علم کی ملکیت کا مبالغہ، نگران جماعت کا مبالغہ، قیام خلافت کا مبالغہ، اسلام دشمنی کا مبالغہ، مغربی تہذیب کا مغالطہ اور سیکولرازم کا مغالطہ شامل ہیں۔ تہذیبی نرگسیت کی طرح یہ کتاب بھی تحقیقی حوالہ جات سے عاری ہے جو ابواب و کتاب کے اخیر میں دیے جایا کرتے ہیں۔ جدید تہذیب جسے محترم نے ''احیائے علوم کی تحریک'' کے نام سے جگہ جگہ یاد کیا ہے، میں اس زمن کی کتابوں میں اپینڈکس و فٹ نوٹ یا حاشیے کا انداز مستعمل ہے۔ایسی کتاب جو احیائے علوم کی تحریک کے گن گاتی ہو اگر خود بھی اسکا استعمال کر لے تو کیا ہی اچھا ہو۔

کتاب کا انداز بیاں تقریری ہے اور مغالطوں سے عبارت۔ اپنی پہلی کتاب کی کئی چیزیں دہرائی گئی ہیں جن میں منطقی مغالطے سر فہرست ہیں۔ تہذیب مغرب کی شان میں رطب اللسان ہیں اور اسے جدید انسانی تہذیب قرار دیتے ہیں لیکن اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نا آنے کے مصداق اس غالب و دانا تہذیب کی لڑی گئی دو جنگوں پر صاحب کتاب کا قلم بنیادی طور پر معذرت خواہ اور خاموش ہے۔ لیکن جب جناب اسلامی تہذیب کے بخیے ادھیڑنے ہوں تو ہر طرح کی اینکڈوٹ ایک حقیقت بنا کر سامنے لای جاتی ہے۔ ہیروشیما و ناگاساکی کی تباہ کاریاں ہوں یا ایٹم بم و ہایڈروجن بم کی ایجاد یا نو آبادیاتی نظام ہو، ان سب کے لیے صاحب کتاب کے قلم سے جس قسم کی معذرتیں نکلتی ہیں ان پر بڑے بڑے اپالجسٹس بھی رشک کرتے ہونگے۔ لکھتے ہیں۔ اگرچہ یورپ کی اقوام نے ان شاندار نظریات کے باوجود دنیا بھر میں نو

آبادیات قائم کیں اوران قوموں پر تسلط جمایا، پھر آج کی دو بڑی جنگیں بھی انہوں نے لڑیں لیکن فاشزم اور نو آبادیاتی نظام کے باوجود ان نظریات کی قوت ان معاشروں میں کم نہیں ہو سکی. بلکہ یہ نظریات دنیا بھر میں نو آبادیات کی آزادی کے لئے بنیاد بن گئے۔

یعنی کہ تم قتل کرے ہو کہ کرامات کرے ہو۔ پھر مغربی تہذیب کی مادر پدر آزادی کے دفاع میں مزید خامہ فرسا ہوتے ہیں کہ :

''اس جدید تہذیب نے انسانوں کی آزادی اور حقوق کو جس انداز سے تسلیم کیا اور اس کے نتیجہ میں یہ فطری تھا کہ ان کے معاشروں میں بعض مبالغہ آمیز ذاتی آزادیاں بھی رائج ہوئیں. خاندان کی شکست وریخت اور اولاد کی اپنے والدین کے ساتھ حقوق کی برابری کے تصور نے بعض الجھنیں پیدا کیں لیکن یہ اس تہذیب کی بنیادی شناخت نہیں، نہ ہی اس تہذیب کے مفکروں کا اصرار ہے یہ فلسفہ ہے کہ اس تہذیب کے یہ پہلو اپنائے جائیں. جو الجھنیں آزادی کے استعمال سے پیدا ہوئیں ان کے باوجود یہ معاشرے سلامت ہیں یا ان الجھنوں کو دور کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں''.

کاش محترم نے کبھی یورپ وامریکہ کے جنسی جرائم کا ریکارڈ دیکھا ہوتا۔۔ پھر ایک دور کی کوڑی لاتے ہوے کہتے ہیں

''اصل بات یہ ہے کہ جاگیر داری دور کی وہ ظالمانہ فضیلتیں جو انسان پر انسان کے تسلط کی ضمانت دیتی ہیں اس نئے نظام کے آنے سے خطرے میں پڑ گئیں اور چونکہ مسلمانوں کی بادشاہتوں کا خاتمہ اس صنعتی معاشرے کے ہاتھوں ہوا تھا لہذا اقتدار سے محروم ہونے والے طبقوں کو اس کا بہت قلق تھا''

یعنی اصولا تو یہ نظام بلکل درست لگتا ہے لیکن چونکہ مولانا حضرات کو اپنی سلطنت جانے کا غم تھا، اس وجہ سے وہ اسکے مخالف ہو گئے (مصنف اگر مرعوبیت کی عینک اتار کے دیکھتے تو سب سے زیادہ انسان پر انسان کے تسلط کی راہ انکے پسندیدہ سرمایہ دارانہ نظام نے ہی ہموار کی ہے)۔

مغالطے مبالغے کے مصنف کی سوانح کچھ ہوں ہے کہ مبارک حیدر صاحب نے نے 1963 میں گارڈن کالج راولپنڈی سے انگریزی ادبیات میں ماسٹرز کیا، وہیں پوسٹ گریجویٹ یونین کے صدر تھے جب ذوالفقار علی بھٹو سے پہلی ملاقات ہوئی. 64ء میں اسلامیہ کالج سے وابستہ ہوئے. کتاب کہتی ہے کہ شاعر اور انقلابی کی حیثیت سے ملک بھر میں پذیرائی ملی. پھر جب پاکستان پیپلز پارٹی معرض وجود میں آئی تو 68ء میں بھٹو نے انھیں لیبر ونگ کا سربراہ مقرر کیا. غالبا یہی وہ نمک ہے جس کو وہ آزاد میڈیا کے مغالطے نامی باب میں حلال کرتے

نظر آتے ہیں۔ان کا قلم عدلیہ کے مغالطے نامی باب میں ایک محقق سے زیادہ ایک جیالے کا خامہ نظر آتا ہے جس کی حب الوطنی کا یہ عالم ہے کہ لکھتے ہیں

''اگرچہ پاکستان عالمی منظر پر کسی مثبت یا پیداواری عمل کی وجہ سے کوئی حیثیت نہیں رکھتا. تاہم تخریب اور نفی کے کئی میدان ایسے ہیں جن میں ہماری اہمیت دنیا میں نمبر ایک ہے۔''

پھر نفرت از خود کا یہ عالم ہے کہ اپنے افکار بھی میگنا کارٹا کے سر باندھنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔رقم طراز ہیں

''بنیادی مفہوم جو احیائے علوم کی تحریک نے سمجھا اور اپنایا، یہ تھا کہ تمام انسان برابر ہیں، تمام انسانوں کو برابر حقوق حاصل ہیں، ان حقوق میں انسانی آزادی، آزادی فکر، آزادی اظہار، آزادی مذہب اور آزادی تنظیم سب شامل ہیں. کسی گورے کو کالے پر، کسی مرد کو عورت پر، کسی ایک نسل کو دوسری نسل پر، کسی ایک مذہب کو کسی دوسرے مذہب پر فوقیت نہیں. رنگ نسل اور قومیتوں کے تعصبات مہمل اور باطل ہیں، بنی نوع انسان کی اس دنیا میں زندگی سب سے بڑی صداقت ہے، یہ زندگی مقدّس ہے اور اس کے تحفظ کے لئے ساری انسانیت کی متحدہ جدوجہد ضروری ہے''.

پھر یاسیت کی انتہا سے خامہ رواں ہوتا ہے کہ

''۔۔۔لیکن سبھی جانتے ہیں کہ اس دہشت گردی اور انتشار کے پیچھے چاہے کوئی بھی ہو، چاہے پاکستان کے عسکری اندھوں کا کوئی گروہ مال اقتدار کے لئے اس ہتھیار کو استعمال کرے یا کوئی عرب طاقت اپنی عالمی سودا بازی میں لگی ہوئی ہو، کوئی سابقہ عالمی طاقت اپنے گرد بننے والے گھیرے کو توڑنے کے لئے کام کر رہی ہے یا کوئی ابھرتی ہوئی طاقت موجودہ واحد سپر پاور کی جگہ لینے کا خواب دیکھ رہی ہو، لیکن ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ افغانستان اور پاکستان کے بدنصیب عوام کی نوجوان نسلیں عالمی رہنما بن جائیں گی یا انہیں دنیا میں کسی بھی طرح سے کوئی فضیلت نصیب ہو سکے گی. جس علمی، معاشی، تنظیمی اور اخلاقی حالت میں ہم اس وقت ہیں یعنی نہ ہماری زراعت ہے نہ صنعت، نہ ادارے ہیں نہ افراد، نہ دنیا میں کہیں سے خوش آمدید کا کوئی پیغام، ایسی حالت میں ہم چاہے پتھر پھینک پھینک کر ساری دنیا کے باغ اجاڑ دیں، باغ ہمارے نہیں ہو سکتے، نہ یہاں کے باغ نہ اگلے جہان کے باغ. ہم شیر، لگڑ بھگے، چیتے جو بھی بن جائیں انسانوں کی کوئی بستی ہمیں اپنا بادشاہ نہ مانے گی. یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی ہماری میڈیا کا فیصلہ یہ رہا ہے کہ خودکشی کے اس عامل کی جو بھی مخالفت کرے، اسے مختلف بہانوں سے سخت نفرت کا نشانہ بنایا جائے۔''

میڈیا پر مصنف کی نقادانہ نظر بہر حال حقیقت سے قریب تر ہے، اس ضمن میں رقم طراز ہیں

''آسان فضیلت واقتدار کے طلبگار عناصر نے ہماری اس مریضانہ حالت سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے. چناچہ میڈیا کے وہ دکاندار جن کی نظر میں پیشہ ورانہ صلاحیت کے معنی بلیک میل کی ٹیکنیک اور مال بنانے کی صلاحیت سے آگے کچھ نہیں، ہمارے معاشرے کی نرگسیت سے لطف اندوز ہو رہے ہیں. چونکہ اس معاشرہ کے خوشحال اور کامیاب طبقوں کو کامیاب ہونے کے لئے علم اور قدروں کی ضرورت ہی نہیں پڑتی ہے بلکہ در حقیقت وہ کامیاب ہی تب ہوئے جب انہوں نے علم اور اقدار سے نفرت کرنا سیکھا اس لئے خبر کی بجائے افواہ ان کی پسندیدہ خوراک بنی، کیونکہ خبر کا تعلق تحقیق اور سچائی سے ہے، یہ علم اور اقدار کی طاقت سے نکھرتی ہے، اسے ہضم کرنے کے لئے صحت مند معدہ درکار ہوتا ہے. کھٹیا ور کراری مانگنے والوں کی طلب بڑھنے سے مزید کھٹی اور مزید کرری بیچنے والوں کی دوکانیں چلتی ہیں معدہ کے مریض اللہ کو پیارے ہوتے رہتے ہیں، لیکن نسل کشی کی طاقت سے مالامال اس تہذیب میں کھانے والوں کی تعداد گھٹتی نہیں، خصوصاً جب سادہ اور صحت بخش خوراک کے لئے خوشحال لوگوں کا دل مائل ہی نہیں ہوتا. دوسری طرف بدخورانی اور زہر خورانی کے زخم بھرنے کے لئے عبادت اور ثواب سہارا بن جاتے ہیں. چناچہ کھٹی اور کراری افواہوں کی ہر دوکان کے ساتھ دینی فضیلت کی دوکانیں پھلتی پھولتی ہیں. ہمارے اخبارات اور چینلز پر کھٹے اور کرارے تبصروں، مکالموں اور خبروں کے ساتھ ساتھ دینی فخر و فضیلت سے بھرپور صفحات، ایڈیشن اور تقاریر اسے حسین امتزاج کی مثالیں ہیں۔''

لیکن حقیقت پسندی، میڈیا میں اخلاقیات واستدلال ودیانت وسچای کا درس دینے کے بعد ان کا قلم یوں رواں ہوتا ہے

''موجودہ سول حکمت پہلی بدنصیب حکمت نہیں، جسے گالیوں، کرپشن کی افواہوں اور مقدموں کے نہ ختم ہونے والے سلسلوں کا سامنا ہوا ہے. ذوالفقار علی بھٹو کو شہید ہونے تک ہر تذلیل کا سامنا تھا، حتیٰ کہ پارسائے اعظم ضیاءالحق نے جیل میں بھٹو کی لیٹرین کے پردے ہٹوا دیئے. کہتے ہیں بھٹو نے اپنی عزت نفس کے تحفظ کے لئے کھانا پینا چھوڑ دیا. ایک رپورٹ کے مطابق تقریباً چھ فٹ قد کے بھٹو کا وزن پھانسی کے دن 100 پاؤنڈ سے بھی کم تھا. ملک کے سارے اہل ایمان، سارے اہل قلم اور عدل کے نگران ضیاءالحق کے آگے سجدہ ریز تھے اور بھٹو کو گالیاں دینے میں ایک سے بڑھ کر ایک. پھر بینظیر اور نواز شریف کی باری آئی۔''

یہاں یقینا انہوں نے مصدقہ ذرائع سے ہی بھٹو کے باتھ روم کی صورتحال کا پتا چلایا ہوگا اور اس کا بغیر حوالہ جات کے درج کرنا انکے نزدیک عین محققانہ دیانت ہے۔ اس کتاب کے دیگر مندرجات بھی اسی قسم کے بہت سے مغالطوں اور یک رخی پند ونصایح سے بھرے

پڑے ہیں جن کی تفصیلات آپ کتاب پڑھ کر خود جان سکتے ہیں، میری بس اتنی گذارش ہے کہ آپ اس کے ساتھ اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی اور تجدید و احیائے دین کا بھی مطالعہ کر لیں تو بہتر ہے کہ یک طرفی معلومات سے قاری کا ذہن متنفر نا ہو۔ آخری بات اس حوالے سے یہ کرتا چلوں کہ کہ جمہوریت کے حوالے سے لادینی قوتوں کی جو کوششیں اسلام اور جمہوری نظام کو متناقض قرار دینے کے لیے کارفرما ہیں، ان میں صاحب کتاب سرفہرست ہیں، لکھتے ہیں

"۔۔۔ مسلم معاشروں میں جمہوریت کا مقام اب تک ایک خارجی سا رہا ہے جس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ مسلم معاشروں میں فضیلت و احترام کا منصب اسلامی اتھارٹی کی بنیاد پر طے ہوتا رہا ہے. بادشاہ اور جاگیردار کو دینی علما کی تائید حاصل رہی ہے اور انسانی علم و عقل یا رائے کو کبھی وہ سعادت حاصل نہیں ہوئی جو عقائد کو حاصل رہی ہے. اپنے عقائد کو آخری سچائی ماننے والے معاشرہ میں جب فاتح کا غرور بھی شامل ہو جائے اور صدیوں کی حکمرانی کی سند بھی، اور جب لوگوں کو یقین ہو کہ ان کی کامرانیوں کا سبب ان کے عقائد ہیں، اور ان عقائد کا علم طبقہ علما کے پاس ہے یا پھر اہل اقتدار کے پاس، تو اجتماعی انسانی رائے یا استدلال کی ضرورت کہاں رہ جاتی ہے. مسلم معاشروں کی ہزار سالہ فتوحات اور کامرانی نے جو فخر پیدا کیا تھا، اسے پچھلے تین چار صدیوں کی پسپائی نے کم کرنے کی بجائے مسخ کر دیا ہے. اب فخر کبھی یاد ماضی بن کر، کبھی احساس مظلومیت بن کر ہمیں سیکھنے سوچنے سے روکتا ہے تو کبھی فخر کی یہ مسخ شدہ شکل تشدد اور تنہائی کی طرف دھکیلتی ہے. ہمارے یہ معاشرے جو اپنا کوئی بھی اجتماعی کام ڈھنگ سے نہیں کر پاتے، حتیٰ کہ خوراک تک کے لئے دنیا کے محتاج ہیں، وہ عالمی مملکت قائم کرنے کے لئے ہر دم تیار ملتے ہیں.

اس سلسلے میں ڈاکٹر فیاض عالم نے جسارت اخبار میں ایک اچھا و مدلل جواب لکھا ہے جسے یہاں نقل کرتے ہوے اس مضمون کا اختتام کرتا ہوں۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، ڈاکٹر حمید اللہؒ اور مولانا امین احسن اصلاحیؒ جیسے عظیم اسکالرز کی تحریروں کو پڑھ کر اسلام میں جس جمہوریت کی گنجائش اور اجازت نظر آتی ہے وہ مغربی سیکولر جمہوریت یقیناً نہیں ہے اور نہ ہی ہو سکتی ہے۔ مغربی سیکولر جمہوریت میں کسی ریاست میں قانون سازی کے تمام حقوق عوام کو حاصل ہوتے ہیں کہ ان کے منتخب نمائندے جس طرح قانون چاہیں بنالیں، مثلاً یہ کہ بعض مغربی ممالک نے مردوں سے مردوں کی اور عورتوں سے عورتوں کی شادی کو قانوناً جائز قرار دے دیا ہے۔ یا بغیر شادی کے پیدا ہونے والے بچوں کو قانونی حیثیت عطا کر دی ہے۔ اسلام میں اس طرح کی قانون سازی کے حقوق عوام یا ان کے نمائندوں کو حاصل نہیں

ہیں۔ یہاں ایک بنیادی اور بالادست قانون اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے عطا فرمادیا ہے جس کی اطاعت اسلامی ریاست کے ذمہ داروں اور عوام دونوں پر فرض ہے۔اس لحاظ سے اسلامی حکومت جمہوری حکومت نہیں ہوتی بلکہ الٰہی حکومت ہوتی ہی' یعنی ایسی حکومت جس میں انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کے بجائے شرعی قوانین نافذ ہوتے ہیں۔ الٰہی حکومت کو انگریزی میں تھیوکریسی(Theocracy) کہتے ہیں۔ لیکن بقول مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ''یورپ جس طرح کی تھیوکریسی سے واقف ہے اس میں ایک مخصوص مذہبی طبقہ (Priest Class) خدا کے نام سے خود اپنے بنائے ہوئے قوانین نافذ کرتا ہے' جبکہ اسلام جس تھیوکریسی کو پیش کرتا ہے وہ کسی مخصوص مذہبی طبقے کے ہاتھ میں نہیں ہوتی بلکہ عام مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے' اور یہ عام مسلمان اسے خدا کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق چلاتے ہیں۔'' مولاناؒ نے اسلامی حکومت کو الٰہی جمہوری حکومت(Theo-Democratic Government) قرار دیا ہے۔ یعنی ایک ایسی جمہوریت جس میں خدا کے اقتدارِ اعلیٰ کے تحت مسلمانوں کو محدود عمومی حاکمیت عطا کی گئی ہے۔ گویا مسلمانوں کے نمائندے یا ارا کینِ شوریٰ ایسے قوانین تو وضع کر سکتے ہیں جن کے متعلق اسلامی شریعت میں کوئی صریح حکم موجود نہ ہو، مثال کے طور پر آج کے دور میں اگر کسی ضلع، صوبے یا ملک کی حکومت کو انٹرنیٹ کے حوالے سے قانون سازی کرنی پڑے یا وہ سائبر کرائمز کو روکنے کے لیے قوانین وضع کریں تو اسلام اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ قرآن و سنت کے اصولوں کے مطابق اس حوالے سے قانون سازی کی جائے۔ لیکن عورتوں سے عورتوں کی شادی جیسے غیر شرعی، غیر اخلاقی و غیر انسانی قوانین کسی بھی اسلامی ریاست میں کسی بھی نوعیت کی جمہوری حکومت نہیں بنا سکتی۔ لہٰذا یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اسلام میں جس جمہوریت کی بات کی جاتی ہے وہ مغربی سیکولر جمہوریت نہیں ہے بلکہ قانون سازی کا محدود اختیار رکھنے والی الٰہی جمہوریت یا اسلامی جمہوریت ہے جس میں شرعی قوانین کو لازماً برتری حاصل ہوتی ہے۔ اسلام اور جمہوریت کے حوالے سے تفصیلی معلومات کے لیے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تالیف ''اسلامی ریاست'' جسے پروفیسر خورشید احمد صاحب نے مرتب کیا ہے اور مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی تصنیف ''جدید اسلامی ریاست میں قانون سازی کے مسائل'' کا مطالعہ مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

تحریر عدنان مسعود

رچرڈ ڈاکنز کی کتاب'' "**The God Delusion**" کا جائزہ

تحریر عاصم بخشی

مقبول عام سائنسی لٹریچر کے قارئین کے لئے مشہور ماہر حیاتیات رچرڈ ڈاکنز کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ سام ہیرس، ڈینیئل ڈینیٹ اور کرسٹوفر ہچنز کے ساتھ ان کا شمار جدید الحاد کے ''چار شاہ سواروں'' میں ہوتا ہے جن کی خاص وجہ شہرت ان کی شدت پسند اور مادیت میں ڈوبی ہوئی مذہب دشمنی ہے۔ ڈاکنز ایک کٹر ڈارونی مبلغ کے طور پر جانے جاتے ہیں اور ان کی تمام مشہور تصنیفات مثال کے طور پر 'خود غرض جین' (Selfish Gene)، 'مبسوط جینیاتی ترکیب' (Extended Phenotype)، 'باغ عدن سے پھوٹتا دریا' (River Out of Eden) اور 'نابینا گھڑی ساز' (The Blind Watchmaker) وغیرہ حیاتیات میں ڈارونی روایت کا تسلسل ہونے کے ساتھ ساتھ مذہب، اخلاقیات اور نظریہء تخلیقِ عالم کے خلاف ثانوی تبصروں کے طور پر بھی مانی جاتی ہیں۔ مگر ان کی کتاب 'خدائی مغالطہ' (The God Delusion) مذہب کے خلاف ایک کھلا اعلانِ بغاوت ہے۔ ڈاکنز کے بقول اس کتاب میں انہوں نے خدا کے مفروضے کو سائنسی بنیادوں پر پرکھا ہے اور ان کی کتاب عوامی شعور اجاگر کرنے کے لئے کم از کم چار مقدمات قائم کرتی ہے۔ اوّل یہ کہ ملحدین ایک پر اطمینان، اخلاقی اور متوازن زندگی گزار سکتے ہیں، دوم، قدرتی چناؤ وغیرہ جیسے سائنسی نظریات خدائی مفروضہ کی بہ نسبت کائناتی تعبیرات کے لئے زیادہ معتبر ہیں، سوم، بچوں کو ان کے والدین کے مذہب سے منسوب کرنا

زیادتی ہے اور چہارم یہ کہ ملحدین کو معذرت خواہانہ رویہ کی بجائے اس پر افتخار ہونا چاہئے کیونکہ الحاد ایک آزاد اور صحت مند ذہن کی دلیل ہے۔ ذیل میں ڈاکنز کی کتاب پر تبصرہ پیش خدمت ہے عمومی مذہبی خیال کے برعکس حقیقتِ مطلق، خدا کی ہستی اور وحی کے متعلق بے اعتقادی اور تشکیک محض ایک جدید حادثہ نہیں ہے۔ جہاں تک ایک ہمہ وقت تخلیق میں مشغول ہستیِ مطلق کے تصور کا سوال ہے سامی الہامی روایتوں کے برعکس مشرق میں ہندومت، جین مت، بدھ مت اور تاؤ مذہب وغیرہ کافی حد تک کونیاتی ندرت کے مظاہر ہیں مگر پھر بھی ان مذہبی روایتوں میں ایک عالمگیر آفاقی سچائی کا تصور تو بہر حال پوری آب و تاب کی ساتھ موجود ہے۔ عہد عتیق کی کلاسیکی مغربی روایت میں ریاست کے قائم کردہ خدائی تصورات کو جھٹلانا بھی ایک طرح سے الحاد کا مترادف سمجھا جاتا تھا اور قدیم یونانی فلسفے میں پہلی بار یونانی ثقافت کے دیومالائی خداؤں پر سوال اٹھانے کی ابتدا ہوئی۔ یہ فلاسفہ فی نفسہٖ الحاد کے قائل تو نہ تھے مگر انہوں نے کائنات کی تعبیر اساطیری کہانیوں کی بجائے فطری قوانین سے کرنے کی داغ بیل ڈالی جس کے نتیجے میں جوہریت، سوفسطائیت اور اپی قوریت جیسی لاتعداد روایات نے اپنی اپنی کونیاتی اور معادیاتی تعبیرات پیش کیں۔ عہد وسطیٰ تک پہنچتے ہوئے عقلیت پسند روایت ایک مکمل تشکیک پسند اور الحادی جہت کو فروغ دے چکی تھی۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ اس دور میں یورپی معاشروں کے برعکس مسلم معاشروں میں ابن الراوندی، محمد ابن زکریا الرازی اور ابو العلاء المعری وغیرہ جیسے ملحدین اور متشککین کے نام زیادہ مشہور ہیں۔ اس کی ایک وجہ شاید اس زمانے میں مسلم معاشروں اور ریاستوں کا انفرادی عقیدے کی حد تک زیادہ متحمل اور روادار ہونا ہے۔ اس زمانے میں خدا کے وجود کے متعلق کئی لاادری سوالات اٹھائے گئے، مگر یہ کاوشیں گو کئی ایسے مفکرین کے قلم سے نکلیں جو اصل میں سائنسدان تھے مگر پھر بھی اتنی جرأت مند نہ تھیں کہ انہیں وجودِ خدا کا یکسر انکار کہا جا سکتا۔

عصرِ جدید میں مغربی فلسفیانہ روایت نے، جس کی جڑیں سولہویں صدی کی روشن خیالی کی تحریکوں بالخصوص کانٹ اور ہیوم کے فلسفے میں ہیں، سائنسی جدوجہد کو وہ بنیادیں فراہم کیں جنہوں نے بلاواسطہ طور پر عمومی لاادریت اور بلاواسطہ طور پر الحاد کو فروغ دیا۔ ان رجحانات کے بانیوں میں بنیادی طور پر اہلِ منطق، طبعی علوم کے ماہرین اور ماہرین رکازیات وغیرہ شامل تھے سائنس کو جتنا مقبولِ عام ان کی تحریروں نے بنایا، ویسا سائنسی ثقافت کی پوری تاریخ میں کسی اور نے نہ کیا تھا یہی نہیں بلکہ انہوں نے سائنسی دائرہء کار کو مابعد الطبیعات، اخلاقیات اور الٰہیات جیسے خالص فلسفیانہ میدانوں تک پھیلا دیا۔ مگر اس پوری روایت میں مذہب کو اس قدر معاندانہ طور پر عقل سے متصادم نہیں دکھایا گیا جتنا کہ ہمیں رچرڈ ڈاکنز کی کتاب ''خدائی مغالطہ (God Delusion) [1]'' میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ ڈاکنز ایک شدید سائنسی فطرت پرستی کے پس منظر میں یہ قضیہ قائم کرتے ہیں کہ الحاد انسانی ارتقاء کا قدرتی نتیجہ ہے۔ ہر قسم کا مذہبی عقیدہ لازما

عقل واستدلال سے ناموافق ہوتا ہے کیونکہ اس کا تجرباتی اثبات ناممکن ہے۔ڈاکنز کی تعبیر کے مطابق اس دنیا میں تمام بدنما مظاہر کی جڑ وں میں کہیں نہ کہیں مذہب ضرور موجود ہوتا ہے۔مزید یہ کہ انسانی شعور میں موجود تصورِ خدا ارتقاء کے نتیجے میں پیدا ہونے والا عالمِ کل اور قادرِ مطلق ہستی کو ماننے کا محض ایک فطری محرک ہے، یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو ارتقائی عمل میں ''کسی مفید شے'' کا ماحصل ہوسکتی ہے یا پھر سادہ انداز میں دیکھا جائے تو عظیم الشان ارتقائی عمل میں ایک چھوٹی سی غلطی کا نتیجہ ہے۔اپنے چند پیش رو مفکرین مثلا تھامس ہکسلے، برٹرنڈ رسل اور اسٹیفن۔جے۔گولڈ کے برعکس جو الحاد کی بجائے کی لاادریت سے منسوب ہونا پسند کرتے ہیں، رچرڈ ڈاکنز یہ تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں کہ کوئی تجربی ثبوت نہ رکھنے کے باعث انکارِ خدا ایک بلا جواز مابعدالطبیعاتی دعویٰ ہے اور اس پر اصرارِ محض ایک کٹر راسخ الاعتقادی۔ لہٰذا مذہب اور سائنس دو بالکل مختلف میدان ہیں جن کے اپنے اصول وضوابط اور باہم غیر مربوط دائرہ کار ہیں[2]۔نتیجے کے طور پر خدا کی ہستی سے متعلق کوئی بھی دعویٰ یا سوال سائنسی تصور کیا جانا چاہئے کیونکہ یہ سوال کسی بھی طرح انسانی زندگی اور کائنات کے متعلق کو نیاتی استفسارات کو نظرانداز نہیں کرسکتا۔

بہت سے مفکرین کی جانب سے ڈاکنز کے طریقہ کار کو بجا طور پر ''متشدد دہریت'' کہا گیا ہے کیوں کہ وہ مذہب کے تمام عملی مظاہر کو ڈھا دینے کی حمایت کرتے ہیں اور ایسے ہر ضابطہ کی نفی کرتے ہیں جو مذہب کو عملی طور ممکن بنائے اور اس کی انفرادی یا اجتماعی بنیادوں کو مضبوط کرے۔ جیسا کہ کیرن آرمسٹرانگ اپنی کتاب ''خدا کا مقدمہ''[3] میں جامعیت کے ساتھ بیان کرتی ہیں، ڈاکنز ایک مخصوص تخفیفی میلان کی ترجمانی کرتے ہیں جو غیر معمولی طور پر مذہبی شدت پسندوں سے متشابہ ہے اور دونوں ایک دوسرے کو ''بدی کا نمونہ'' سمجھتے ہیں۔یہ دونوں فکری رجحانات غیر ضروری تسہیل اور تعمیم کی بناء پر اپنی اپنی جگہ کچھ ناگزیر قضایا قائم کرتے ہیں جن سے اخذ کردہ نتائج آخر کار ایک دوسرے کے بدترین اور بدشکل مظاہر کو نمایاں کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ امر کسی حیرانی کا باعث نہیں کہ مصنف کرسٹوفر ہچنز اور ابن وراق وغیرہ کی تنقیدی تحریروں[4] کے اطلاق سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ مذہب کے متعلق ایک روادار، متحمل اور مبنی براحترام زاویہء نگاہ بھی شدید قابل مذمت ہے کیوں کہ مذہب کی کوئی بھی شکل مذہبی شدت پسندی کا جواز فراہم کرتی ہے۔اس طرح کے بودے منطقی تجزیات کی سطحیت واضح ہے اور یقینا کسی مستعد علمی تنقید کی متقاضی نہیں، مزید یہ کہ ان دونوں متشدد رجحانات کے درمیان مماثلت دریافت کرنا نہایت سہل ہے۔

خدا کا وہ تصور جو ڈاکنز اپنا مقدمہ پیش کرنے کے لئے قائم کرتے ہیں نہایت سوقیانہ تجسیم پر مبنی ہے۔ تحریر میں جابجا قاری کو یہ ماننے پر مجبور کیا جاتا ہے کہ ہر خدا پرست، اس سے قطع نظر کے وہ کس عقیدے یا مذہب سے تعلق رکھتا ہے، کسی ایسی مافوق الفطرت ہستی کا مکانی

تصور رکھتا ہے جسے ڈاکنز اپنے مخصوص ہجویہ انداز میں ''فلکیاتی چائے دانی[5]'' یا ''اڑنے والے سپیگٹی عفریت[6]'' سے تشبیہ دیتے ہیں۔ ڈاکنز کی فطرت پرست استغراقی کیفیت کے لئے کوئی ایسا تصور جس میں ایک عالمگیر رمزیت کے استعمال سے کسی ماورائے زمان و مکان ناقابل بیان ہستی کی طرف اشارہ و کنایہ ہو بالکل ناممکن اور عجیب ہے۔ لہٰذا مذہبی عقیدہ، جیسا کہ مصنف گلا پھاڑ کر وکالت کرتے ہیں ،ایک نادانی اور سادہ لوحی پر مبنی ہے جس کی کسی ذہین، غیر متعصب اور معقول آدمی سے ہر گز توقع نہیں کی جاسکتی۔ مابعد الطبیعاتی مسائل و مضامین کی جانب اپنے تشکیک آمیز رویے اور سہل پسندی کے باعث ڈاکنز شاید جان بوجھ کر مذہبی صداقت میں پوشیدہ اساسی یا جوہری نامعلومیت کو نظر انداز کرتے ہیں جو اس صداقت کی ملکیت کے کسی بھی انفرادی دعوے کا ایک جزو لاینفک ہے۔ وہ یہ تسلیم کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتے کہ کچھ مذہبی انتہا پسندوں کے علاوہ کوئی خدا پرست صراحت کے ساتھ یہ دعویٰ ہر گز نہیں کرتا کہ وہ حقیقتِ مطلق کی کوئی ہمہ گیر قابل بیان شبیہ رکھتا ہے۔ وحی خود بھی لیس کمثلہ شئ جیسے کے ذریعے اس قسم کے کسی بھی دعوے کا راستہ ہمیشہ کے لئے بند کر چکی ہے اور حقیقتِ مطلق اور معاد کے باب میں جو کچھ ہمارے پاس ہے اب محض رمز و کنایہ کے اسلوب میں ہے جس کی توجیہ کرنے میں ہر خدا پرست اپنی انفرادی حیثیت میں آزاد ہے۔

ڈاکنز، شاید اپنے غیر فلسفیانہ میلانات کے باعث، بظاہر یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ایک خدا پرست کے لئے اسی تحیر میں ایک مسرت، ایک ہیبت و استعجاب کی ملی جلی نفسیاتی کیفیت پوشیدہ ہے جو کائنات میں اس کے اپنے مبہم ہونے کے عاجزانہ احساس کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ مگر اتنا تو ضرور ڈاکنز بھی تسلیم کریں گے کہ سائنس اگرچہ ہمارے ارد گرد پھیلی پیچیدگی کو سلجھانے کی سعی کرتی ہے اس کے باوجود وہ مذہب کے ساتھ اس تحیر میں شریک ہے کیونکہ بالآخر اسے بھی ایک تجرباتی تسلسل کے ساتھ ساتھ ایک عملی اعتقاد کا سہارا لینا ہی پڑتا ہے۔ اس مخصوص فکری پسِ منظر میں ایک احتمالی نمونے کی بنیاد پر نام نہاد ''مفروضہ ءخدا'' کا رد غیر معمولی طور پر ناقابل یقین ہے۔ جب تک ''احتمال'' کو ''صداقت'' یا ''حق'' کے مترادف تصور نہ کیا جائے ڈاکنز کا اخذ کردہ نتیجہ ''خدا تقریباً یقینی طور پر موجود نہیں'' فلسفیانہ نکتہ نگاہ سے کوئی علمی قضیہ نہیں مانا جاسکتا۔ یہ ایک لطیف مگر اہم نکتہ ہے جسے کارل پاپر نے اپنی تصنیف ''سائنسی دریافت کی منطق[7]'' میں اس طرح بیان کیا ہے[8]:

''۔۔۔ ہمیں سائنس کو ایک ''مجموعہ ءعلم'' کی بجائے ''مفروضوں کے ایک نظام'' کے طور پر دیکھنا چاہئے، یعنی اندازوں یا توقعات کا ایک نظام جو اصولی طور پر تو قابل دفاع نہیں مگر ہم اسے اس وقت تک استعمال کرتے رہیں گے جب تک کہ وہ تجربے کی کسوٹی پر پورا اترتا رہے اور اس بارے میں ہم کبھی یہ کہنے میں حق بجانب نہیں کہ ہمیں علم ہے کہ یہ ''سچ'' یا ''کم و بیش یقینی'' یا پھر ''احتمالی'' ہے۔' اس سخت

ارتقائی فکری قالب کی بدولت ڈاکنز کے لئے اپنے نظریہ اخلاق کو کسی نہ کسی قسم کی ڈارونی بنیادیں فراہم کرنا ناگزیر تھا۔انسانی عقل کو بالآخر حیاتیاتی ارتقاء کا نتیجہ قرار دینا شاید کتاب کا سب سے بودا اصرار ہے جس کی بنیاد پر شاید یہ دعویٰ کرنا مقصود ہے کہ ہمارے اجداد عقلی طور پر حقیقتِ مطلق کے معروضی فہم کی نسبتاً کم صلاحیت رکھتے تھے۔یہ کم و بیش وہی بات ہے جس کی طرف اقبال اپنے دوسرے خطبے میں مذہبی تجربے کی ہیئت کا ذکر کرتے ہوئے اشارہ کرتے ہیں: کوئی بھی ایسا نقطہء نگاہ جس کی رو سے عقل ارتقاء کا ماحصل ٹھہرے، سائنس اور اس کے اپنے ہی معروضی اصولِ تحقیق کے مابین تعارض پیدا کر دے گی۔اس تعارض کے ایک مناسب بیان کے لئے وہ ویلڈن کار کا حوالہ دیتے ہیں[9]:

اگر عقل ارتقاء ہی کی پیداوار ہے تو زندگی کی نوعیت اور اس کے آغاز کے بارے میں تمام میکانکی تصور لغو ٹھہرتا ہے۔لہٰذا وہ اصول جسے سائنس نے اختیار کیا اس پر یقیناً نظرِ ثانی کی جانی چاہیے۔ہم اس سلسلے میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ خود متناقض بالذات ہے۔عقل جسے ادراکِ حقیقت کا رویہ کہا جاتا ہے کس طرح بجائے خود کسی ایسی چیز کا ارتقاء ہو سکتی ہے جو اگر موجود ہے تو اس طریقِ ادراک یعنی عقل کی ایک تجرید کی حیثیت سے۔اگر عقل زندگی کا ارتقاء ہے تو زندگی کا یہ تصور کہ اس سے عقل کا ارتقاء ادراکِ حقیقت کے ایک مخصوص طریق کی صورت میں ہوا ہے لازماً کسی مجرد میکانکی حرکت کی نسبت زیادہ محسوس فعالیت کا تصور ہونا چاہیے تھا جو اپنے محتویات کے ادراک کے تجزیے کے ذریعے عقل کو اپنے آپ ظاہر کر سکتی ہے۔اور پھر مزید اگر عقل زندگی کے ارتقاء کا نتیجہ ہے تو یہ مطلق نہیں بلکہ زندگی کی سرگرمی کے حوالے سے اضافی ہے۔اب اس صورت میں سائنس ادراک کے موضوعی پہلو کو خارج کر کے ایک مطلق معروضی تصور پر کس طرح اپنی عمارت استوار کر سکتی ہے؟ ایسے میں ظاہر ہے کہ علومِ حیات کے لئے لازم ہے کہ وہ سائنسی اصولوں پر دوبارہ غور کرے۔[10]"

ڈاکنز اپنی کتاب ایک ایسی معاشرتی مہم کے طور پر متعارف کرواتے ہیں جس کا مقصد مختلف مفروضوں کے متعلق عوامی شعور کو اجاگر کرنا ہے مثال کے طور پر الحاد کا لاادریت کے مقابلے میں زیادہ معقول ہونا، مذہب کا ہر برائی کی جڑ ہونا، مذہبی تعلیم کا بچوں سے زیادتی کے مترادف ہونا، مذہب اور اخلاقیات کا مکمل طور پر باہم غیر متعلق ہونا اور الحاد کا ایک ایسا معروضی نتیجہ ہونا جس کا اخذ کرنا ایک فرد کے لئے باعثِ شرم نہ ہو اور صرف اسی کا ایک ایسا واحد معقول عقیدہ ہونا جو کوئی بھی انسان فخر کے ساتھ رکھ سکے۔اگر انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے تو یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ ان تمام مقاصد میں سے چند تو وہ ضرور جزوی طور پر حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں، بالخصوص ایک خاص قسم کے تشکیک پسند اور سادہ لوح جدید ذہن کو مذہب ترسی کی طرف مائل کرنا اور ساتھ ہی ساتھ ملحدین کو ایسی مضبوط مگر

بازاری مناظرانہ بنیادیں فراہم کرنا جن سے ان کا فکری تفاخر قائم ہو سکے۔ مگر ایک ایسے خداپرست قاری کے لئے جو مذہب اور سائنس کی انفرادی اقالیم سے یکساں درجے میں تحیر زدہ ہے اور پل باندھ کر فاصلے کم کرنے میں دلچسپی رکھتا ہے شاید کتاب کا واحد مفید مگر مخفی پہلو وہ سوالات و اعتراضات ہیں جو اس کو اپنی داخلی اور پوشیدہ ترین ایقانی کیفیات کو جانچنے میں مدد دیتے ہیں۔ برٹرنڈ رسل سے جب ایک بار ایسے ثبوت کے بارے میں دریافت کیا گیا جو ان کو خدا کی ہستی کے بارے میں قائل کر دے گا تو انہوں نے جواب دیا کہ اگر آسمان سے آنے والی ایک غیبی صدا انہیں اگلے چند گھنٹوں میں پیش آنے والے واقعات سے آگاہ کر دے اور وہ تمام واقعات بعینہ اسی طرح وقوع پذیر بھی ہو جائیں تو وہ شاید خدا کی موجودگی کے امکان کے بارے میں غور کریں۔ مجھے شک ہے کہ اتنا صریح معجزانہ تجربی کشف بھی شاید ڈاکنز کو ''مفروضہ ءخدا'' کی حقانیت کی جانب فکر پر آمادہ نہ کر سکے۔ ان کی اپنی ہی تحریر سے مستعار یہ طنزیہ جگت شاید ان کی باغیانہ فکر کی صحیح ترجمانی کرتی ہے کہ وہ خدا کے نہ ہونے کو محض اعتقادی درجہ میں مانتے ہی نہیں بلکہ جانتے ہیں[11]۔

حواشی:

1. Richard Dawkins, The God Delusion, Mariner Books, 2006.

۲ . یہ اسٹیفن۔ جے۔ گولڈ کی اختراع کردہ اصطلاح non-overlapping magisteria کی طرف اشارہ ہے۔

. Karen Armstrong, The Case for God, Anchor Reprint Edition, 2010.3

. Christopher Hitchens, The Portable Atheist: Essential Readings for the 4 Non-Believer, [Editor] Perseus Publishing; Christopher Hitchens, God is not Great: The Case Against Religion, Atlantic Books, 2007; Ibn Warraq, Why I Am Not a Muslim, Prometheus Books, 1995.

. Cosmic Teapot.5

. Flying Spaghetti Monster.6

. Karl Popper, The Logic of Scientific Discovery, Routledge Classics, 2nd 7
Edition, 2002.

. ibid8

9۔ ملاحظہ ہوں تجدید فکریاتِ اسلام کے حواشی۔

10۔ علامہ محمد اقبال، تجدید فکریاتِ اسلام، ترجمہ ڈاکٹر وحید عشرت، اقبال اکادمی پاکستان) ۲۰۰۲(

۱۱ . یہ کارل یونگ کے ایک انٹرویو میں دیئے گئے جواب کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

''خدائی سرگوشیاں'' اردو زبان میں جدید الحاد کا علمی محاکمہ پیش کرتی ایک منفرد کتاب

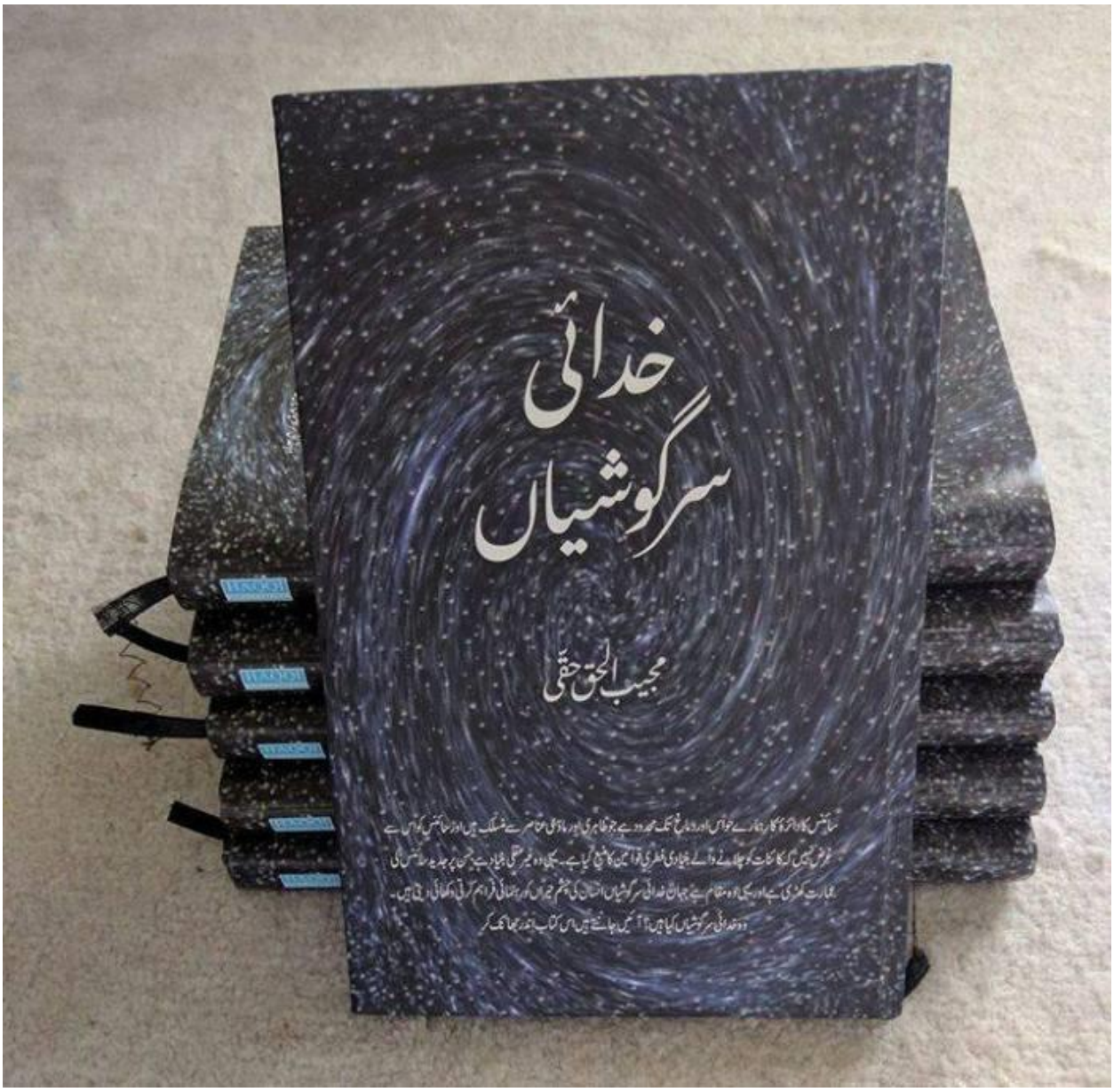

موجودہ دور میں الحادی لٹریچر کی تشہیر اور سوشل میڈیا پر سرگرم ملحدین نے علمی چیلنجز کا جو ماحول اور ذہنی تبدیلی کے لیے جو اثر انگیز حالات پیدا کر دیے ہیں انکو دیکھتے ہوئے اس وقت ہمیں اردو زبان میں سب سے زیادہ ایسے لٹریچر کی ضرورت ہے جو اسلامی عقائد و

نظریات کے حق میں عقلی دلائل پر مبنی ہو اور اسکے ذریعے اُمت کے جدید تعلیم یافتہ اور ذہین طبقے کو فکری ارتداد سے بچایا اور اسکے ذہن و قلب میں اسلام پر یقین و اعتماد کو بحال کیا جائے۔ علماء کی ضرور ایسی سینکڑوں کتابیں موجود ہیں جو ایک عام آدمی کے اسلامی عقائد توحید، رسالت اور آخرت پر یقین پیدا کرنے کے لیے کافی ہیں لیکن جنھوں نے مغربی فلسفوں کا مطالعہ کیا ہے یا دور جدید کا الحادی لٹریچر اور سوشل میڈیا پر ملحدین کے اعتراضات جن کی نظر سے گزر رہے ہیں' انکے لیے یہ کتابیں کافی نہیں ہیں۔ ملحدین خصوصا رچرڈ ڈاکنز، برٹرنڈ رسل، کرسٹوفر ہیچنز اور وکٹر جے استینجر، ڈین بارکر وغیرہ نے الحاد کے حق میں دلائل کی جو وسیع عمارتیں کھڑی کی ہیں' وہ اچھے اچھے اہلِ ایمان کو متشکک کر دیتی ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اس الحادی لٹریچر کے مقابلے کے لیے اردو زبان میں جدید اسلوبِ میں ہمارا موجودہ اسلامی تحریری سرمایہ کسی صورت کافی نہیں ہے۔ انگریزی زبان میں عیسائیوں نے اور اب مسلمانوں نے بھی اس محاذ پر بڑا قابل قدر کام کیا ہے لیکن اردو زبان میں اس موضوع پر گنے چنے لوگوں کی ہی کتابیں موجود ہیں جیسے مولانا مودودی، وحیدالدین خان، پروفیسر احمد رفیق اختر، ڈاکٹر مرتضی ملک، مبشر نذیر، مولانا عبدالباری ندوی، عبدالماجد دریابادی، حسن عسکری وغیرہ۔ ان کی کتابوں میں مذہب، عقلیات اور سائنس پر گراں قدر مباحث ہیں لیکن ایک تو یہ ابحاث کافی نہیں ہے اور دوسرے قدیم ہیں اور جدید اشکالات کو بہت کم زیر بحث لاتی ہیں۔ جدید فکری موضوعات پر انصاری سکول آف تھاٹ نے کافی اچھا کام کیا ہے لیکن انکا فوکس مغربیت، جدیدیت اور کیپٹل ازم وغیرہ جیسے موضوعات پر ہے، وہ مقبول عام الحادی لٹریچر و اعتراضات کو ڈائریکٹ زیر بحث نہیں لاتے۔ اس پس منظر میں اسوقت ہمیں اردو میں امام غزالی کے طرز پر ایسی خالص علمی اور فکری کتابوں کی ضرورت ہے جو جدید فلسفہ و نظریاتی سائنس کی آڑ میں مذہب پر کیے گئے اعتراضات کو زیر بحث لائیں اور وہ بیوقت عام فہم بھی ہوں۔

اسی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے کچھ لوگوں نے کام شروع کیا۔ حال ہی میں شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے خاندان کے ایک فرد مجیب الحق حقی صاحب کی ایک کتاب 'خدائی سرگوشیاں' کے نام سے سامنے آئی ہے۔ مصنف پہلے کافی عرصہ انگلش فورمز پر ملحدین کیساتھ علمی بحثوں میں متحرک رہے اور پھر انہوں نے اپنے علم اور تجربے کی بنیادی پر 'دی ڈیوائن وسپرز' کے نام سے کتاب لکھی جو مشہور سائیٹ ایموزون ڈاٹ کام پر بھی موجود ہے۔ خدائی سرگوشیاں اسی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ مصنف نے اس میں مذہبی عقائد و نظریات پر جدید فلسفہ اور سائنس کی روشنی میں اٹھائے گئے اعتراضات کو جدید اسلوب میں زیر بحث لایا ہے۔ دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''میں خود الحاد کے نظریاتی حملے کا شکار ہو چکا ہوں لیکن گھر کے ماحول اور مضبوط اخلاقی اور یقین کی بنیاد نے مجھے لرزنے تو دیا لیکن گرنے نہیں دیا۔ تشکیک کا سفر کچھ عرصے جاری رہا لیکن ہر بات کی تہہ تک استدلال اور سادہ منطق کے ساتھ پہنچنے کی میری عادت نے رفتہ رفتہ مجھ پر عیاں کیا کہ اسلام کے علاوہ ہر نظریہ اپنی بنیاد میں سنگین خامیاں رکھتا ہے۔ بس انہی ذہنی مشقوں اور تجربات کو عامتہ الناس کے فائدے کے لیئے شیئر کر رہا ہوں۔ اگر ایک تشکیک میں مبتلا مسلمان یقین کا موتی پالیتا ہے تو میں سمجھونگا کہ میری محنت کا پھل مل گیا''۔

کتاب خدائی سرگوشیاں سادہ استدلال اور منطق سے سائنس اور دین کے تعلق کو سمجھنے کی ایک کوشش ہے جس میں جدید نظریات اور سائنسی ابہامات کا تجزیہ عقلی بنیادوں پر کیا گیا ہے، مصنف نے اس میں معروف الحادی اعتراضات کا تنقیدی جائزہ لیا اور پھر اس کو علمی اصولوں کی کسوٹی پر پرکھا ہے۔ کتاب میں جابجا فلسفہ اور سائنس کی بحثیں موجود ہیں لیکن مصنف نے انکو اس قدر سادہ انداز میں پیش کیا ہے کہ عام آدمی بھی انہیں باآسانی سمجھ سکتا ہے، اپنے مخصوص طرزِ بیان اور جدید مثالوں سے مصنف نے ان خشک بحثوں کو بھی نیا آہنگ اور پُرتاثیر خوب صورتی بخشی ہے اور انہیں ہر قسم کے ذہن کے لیے قابلِ قبول بنا دیا ہے۔ کتاب کے موضوعات بہت اہم، اچھوتے اور منفرد ہیں مثلاً خالق، تخلیق اور انسانی شعور، وجود کا قفس، وجودیت کے پیرائے، روح، حقیقتِ کبریٰ اور انسانی عقل، شئے عدَم یا لاشئے، حصارِ وجود اور انسان، خدا کا طبعی ثبوت، ہم کون ہیں؟ وغیرہ۔

۔اللہ مصنف کی اس محنت اور اخلاص کو قبول فرمائے اور اسے انکے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔آمین

کریسرچ کا میکنزم اور الحاد کا فکری سقم

حقیقت کی تلاش انسان کی جبلّت ہے، اسی لیے انسان کا تجسّس ہر مظہر کا جواز طلب کرتا ہے۔ ہر مظہر اپنے اندر ایک سسٹم اور وہ سسٹم اپنے علمی پیرائے رکھتا ہے۔ اسی جواز کی تلاش حصول علم بنتا ہے۔ علم کیا ہے؟ کسی چیز یا مظہر یا موضوع کی علمی وضاحت یا عملی جانکاری۔ گویا ریسرچ یا تحقیق پوشیدہ علوم کی دریافت کی کاوش ہے۔

کبھی آپ نے سوچا کہ آخر انسان ہی کیوں ہر مظہر کے جواز کا متلاشی ہوتا ہے جبکہ دنیا میں زندگی بے شمار شکلوں میں موجود ہے؟ اسی لیے نا کہ انسان تجسّس، عقل اور دانش رکھتا ہے جو کسی اور زندگی میں اس پیمانے کی نہیں کہ وہ فکر و دانش سے کام لیکر اپنے اطراف کے ماحول اور نیچر کی ہیئت تبدیل کرنے کی سعی کرے۔ گویا علم اور انسان میں ایک خاص تعلق ہے۔ تجسّس کا تقاضا ہے کہ ہر بات کی تہہ تک پہنچا جائے، اسی لیے کسی بھی حاضر مظہر کی ابتدا یا پیدائش کی توجیہ کی تلاش بھی منطقی بات ہے۔ کائنات کی پیدائش کے ساتھ علوم کی پیدائش بھی ایک معمّہ ہے۔ مغرب اپنی دریافتوں پر بجا طور پر فخر کرتا ہے کیونکہ وہاں غور و فکر اور ریسرچ کا دور دورہ ہے، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ علمیت کی معراج پر پہنچنے والے یہ احباب خاص طور پر اہلِ فلاسفہ اور اسکالرز اس بہت اہم سوال کو نظر انداز کرتے ہیں۔

اس مضمون کی بنیاد یہ اہم نکتہ ہے کہ انسان کائنات سے جو کچھ علمی اور عملی طور پر حاصل کر رہا ہے، وہ دو طرفہ سسٹم کی بنیاد پر منحصر ہے۔ وضاحت اس کی یہ ہے کہ انسان کا دیکھنا، سننا کھانا پینا اور چلنا پھرنا اپنے پیچھے سسٹم رکھتا ہے۔ اس سسٹم کے دو حصے ہوتے ہیں، ایک انسان کے اندر جبکہ دوسرا باہر۔ جب ہم کچھ دیکھتے ہیں تو نظّارہ باہر ہوتا ہے لیکن ہمارا بصری نظام آنکھ کے پیچھے، ہم سنتے ہیں تو آواز باہر پیدا ہوتی ہے اور سمعی نظام ہمارے دماغ میں، اسی طرح ہم چلتے ہیں تو ارادہ اور پاؤں ہمارا ہوتا ہے لیکن ہمارے قدم پر زمینی ردّ عمل ہمیں حرکت میں لاتا

ہے۔ گویا حواس خمسہ اور ہمارا جسم دنیا سے رابطہ میں ہمارے معاون ہیں۔ اگر انسان کا ہر فعل داخلی و خارجی دنیا سے تعلق کے پیرائے رکھتا ہے تو غور و فکر اور تحقیق کا بھی اندرونی اور بیرونی نظم رکھنا فطری ہوگا۔ مثلاً ایٹم پر ریسرچ میں انسان جب اس کا مشاہدہ کرتا ہے تو نامعلوم علوم ایٹم کے اندر مقیّد ہوتے ہیں جبکہ کوئی ہم آہنگ مگر نامعلوم پیرایہ انسان کے دماغ میں بھی انسان کے تصرّف میں فعّال ہوتا ہے تبھی انسانی شعور کی گرفت میں نئی معلومات آتی ہیں۔ فی الوقت اس پیرائے کو ہم عقل مان تو لیتے ہیں مگر یہ عقل کے علاوہ کچھ اور بھی ہو سکتا ہے کیونکہ عقل اور بیرونی علوم میں کسی ہم آہنگ نظم کا کوئی ثبوت یا ٹھوس دلیل ہمارے پاس نہیں، جبکہ حواس کے دو طرفہ نظم کے بموجب اس سسٹم کا بھی ہونا عین فطری ہے۔ کسی بھی تسخیرِ علم میں عقل و دانش ایک بنیادی نہیں بلکہ سطحی توجیہ ہے کیونکہ عقل بھی بذات خود علم دریافت نہیں کرتی بلکہ کسی نظم کا جزو اور معاون ہی ہے۔ ہم عقل کو ایک مفرد یا واحد مظہر سمجھتے ہیں، مگر یہ ہماری کم علمی بھی ہو سکتی ہے کیونکہ عقل ''کیسے کام کرتی ہے'' ہم نہیں جانتے۔ اسی لیے یہاں پر ہم فرض کرتے ہیں کہ عقل ایک مرکب یا ملٹی ڈائمنشن مظہر ہے اور اس میں کوئی عنصر یا خاصیت ہے جو بیرونی علوم کے پیرایوں سے کوئی انسیت رکھتی ہے۔ ہمیں کسی ایسے داخلی مظہر کی تلاش کرنی ہوگی جو خارج میں موجود علم سے کوئی عقلی و منطقی ہم آہنگی رکھتا ہو۔ گویا تحقیق و دریافت اہم عمل ہے جو انسان کے تجسّس سے متعلّق تو ہے مگر جس کے کسی اندرونی و بیرونی دورخے پیرائے سے ہم آشنا نہیں ہیں۔ اسی تجسّس کی بنا پر یہ سوال فطری ہے کہ :

انسانی تجسّس اور کسی اسرار کے علمی پیرائے کی دریافت یعنی ریسرچ کے حاصل نتائج کے پیچھے کیا کوئی میکینزم mechanism نہیں؟

وہ کیا میکینزم ہے جو انسانی ذہن اور کائنات میں پھیلے علوم میں کوئی فطری ہم آہنگی compatibility رکھتا ہے؟

آئیں غور کرتے ہیں کہ حصول علم کے اس میکینزم کے پیرائے کیا ہیں یا کیا ہو سکتے ہیں؟

لیکن اس سے قبل اس بات پر بھی غور کر لیں کہ اتنے بنیادی سوالات اسکالر اور محقّق حضرات کی صرفِ نظر کا شکار کیوں رہتے ہیں۔

مشاہدہ یہی ہے کہ انسان بہت سے پر اسرار کائناتی مظاہر میں گھرا ہوا تو ہے مگر اُن کی حقیقت جانے بغیر بھی زندہ ہے، کیونکہ اس کا بہت سے رموز سے براہِ راست تعلق نہیں اور جن سے سابقہ ہے ان مظاہر میں ایسی مقناطیسیت ہوتی ہے کہ عاقل ترین انسان بھی اُن بھول بھلیّوں کے اندر ہی بھٹکتا رہتا ہے، مثلاً ہمارے شعور کی مقناطیسیت، عقل و دانش کا معمّہ اور نیند کی جاذبیت، کہ جن کا جواز دینے سے ماہرین عاجز ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ انسان کی توجّہ روز مرّہ کے فوری ردّ عمل کے معاملات پر ہی مرکوز رہتی ہے اور اسی لیے مسلسل ردّ عمل کے جبر کے تئیں انسان ان عوامل کے جواز کی لاعلمی سے صرف نظر کیے رہتا ہے، یعنی انسان بہت سے مظاہر کی حقیقت جانے بغیر بھی انہیں

لازم فطری وصف سمجھ کران کے اوصاف سے مستفیض ہوتا رہتا ہے۔ گویا یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسان کسی طاقتور انجانے مقناطیسی بھنور کے اندر زندگی گزارتا ہے جو اس کو بہت سے حقائق سے بے بہرہ کیے رکھتا ہے۔ مزید وضاحت اس کی یہ ہے کہ ہم بحیثیت انسان ایک مغلوب کر دینے والے سسٹم میں مشغول رہتے ہیں جس میں ہم کسی خاص بھول جانے والی ذہنی کیفیت میں ہی رہتے ہیں۔ ہم ایسے حال میں رہتے ہیں جس میں ہمارے فکری زاویے ہی ہمارے رویّے متعین کرتے ہیں خواہ وہ افکار کتنے ہی غیر مستند ہوں۔ مثلاً کائنات کی ابتدا یا پیدائش کا معمّہ ایک چکرا دینے والا واقعہ ہے جس کی حقیقت کی بے داغ جانکاری پر جب سائنسدان بے بس ہو گئے تو اپنے تجسّس کی مصنوعی تسکین کے لیے تشریح طلب ادھورے علم کی بنا پر ہی ایمان کا ایک محور تخلیق کر لیا جس کے تئیں سائنسدانوں نے یقین کر لیا کہ کائنات خود بنی حالانکہ یہ نظریہ ابھی بھی علمی اور تجرباتی طور پر ثابت شدہ نہیں۔ بہت سے فلسفی اور اسکالر ایسے ہی نیم یقین کے محور سے منسلک فکری دائرے میں فلسفیانہ کاوشیں کرتے ہیں۔ یقین کے یہ علمی و غیر علمی تاثر لاتغیّر constants کی طرح اکثر انسانوں کے ذہن پر مسلّط ہیں جو فکر کی انمٹ راہداریاں تخلیق کر دیتے ہیں کہ انسان انھی میں سے کسی فکری پگڈنڈی پر سفر کرتا ہے۔ انسان ایسے فکر کے خول کو توڑ نہیں پاتا کیونکہ لاشعوری طور پر (یا جبراً) اس کو قبول کر چکا ہوتا ہے جیسا کہ الحاد کے حلقے میں کائنات اور حیات کا خود پیدا ہونا ایک مستند خیال جانا جاتا ہے یا بہت سے عقیدے۔

یہی حال ماخذ علوم کی جانکاری جیسے انتہائی اہم سوال کا ہے۔ انسان تحقیق کے انہماک میں غرق تو ہو جاتا ہے لیکن اسی تحقیق کے حقیقی اجزائے ترکیبی جیسے عقل و دانش کے خارجی علوم سے کسی تعلق کو نظر انداز کیے رہتا ہے! انسان کو اس سے بھی غرض نہیں کہ وہ جاننے کی کوشش کرے کہ انسان علم کی تسخیر پر قادر ہی کیوں ہوا؟ ہم اپنے تجسّس اور شوق کے بموجب ریسرچ میں منہمک ہو کر نئے قوانین اور علوم دریافت تو کرتے ہیں مگر ریسرچ کے عمل کی علّت اور گہرائی پر غور اس لیے نہیں کرتے کہ یہ ہمارے روز مرّہ کے طرز عمل میں ایک فطری عطا کی طرح ہے جو ذہن میں کسی گہری چھاپ کی طرح کندہ ہے۔ یعنی انسان نیا علم حاصل کرتا ہے کیونکہ تجسّس کے تئیں اپنا فطری حق سمجھتا ہے اور بس!

اب ایک قدم آگے بڑھتے ہیں۔ تحقیق یا ریسرچ کے تئیں منطقی بات یہ ہے کہ انسان کسی فطری اسرار کو جاننے کے لیے باریک بینی سے متوجّہ ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ کوئی علمی پیرایہ وہاں پہلے سے موجود ہے۔ اس امر کی کوئی اور وضاحت نہیں کیونکہ ہر انسانی وضع کردہ سسٹم بھی اپنے پیچھے ایک فلاسفی، پلاننگ اور ترتیب رکھتا ہے جو کائناتی حقیقت بھی ہے۔ جب علوم موجود ہیں اور ظاہر بھی ہو رہے

ہیں تو یہ سوال منطقی ہیں کہ: علم کی تخلیق کیوں، کہاں اور کیسے ہوئی؟ علوم انسان تک کس سسٹم کے تحت پہنچ رہے ہیں؟ فطری معموں کی کلید کہاں سے عقل میں آتی ہے؟

خدا کو ماننے والے گروہ کے لیے تو یہ سوال کوئی مسئلہ نہیں کہ وہ خود کو مطمئن کرنے والے ایمانی جواب رکھتے ہیں، ہاں مگر خدا کو نہ ماننے والے اور سائنسی ذہن رکھنے والے فلسفیوں کے لیے یہ چیلنج سوال ہیں۔ اسی تناظر میں اب ہم ان سوالات کے جوابات کا جائزہ الحادی سائنس یا جدیدیت اور مذہب دونوں کے زاویوں سے لیتے ہیں کہ کون ان کی زیادہ مناسب توجیہ رکھتا ہے۔

کیا فکرِ الحاد علوم کے کسی مخزن وماخذ کے معمّے کو حل کرنے کی پوزیشن میں ہے؟

جب انسان علم کے سہارے خدا کا انکار کرنے پر مصر ہوا اور حیات وکائنات کے جواز کی تلاش کی تو اپنی عقل پر بھروسہ کیا اور کائنات کے تمام مظاہر کو کسی وحدانی نقطے سے ''اچانک ظاہر ہونے والے ''بے انتہا یا لامحدود طاقتور پھیلاؤ کا نتیجہ قرار دیا جسے عرف عام میں بگ بینگ کہا جاتا ہے۔ اسی کے بموجب اچانک تخلیق، ارتقاء اور فطری چناؤ natural-selection کے نظریات وضع کیے اور حواس وعقل کی بنا پر اپنے علم کی بنیاد کو وسیع کرتے ہوئے ہر ہر مظہر phenomenon کے پس پردہ سسٹم کی تشریح تجربات کے ذریعے کی اور اس کو سائنس کا نام دیا۔ اگر ہم یہ درست مان لیں کہ ہمارے اطراف سب کچھ خود ہی بنا اور زندگی خود ہی ارتقاء پذیر ہے تو پھر اسی نظریے کے بموجب ہمارے سوال یعنی علوم کے احیاء اور مخرج کا جواب اور منطقی تشریح یہی ہوگی کہ ہماری کائنات کے مظاہر اور ان سے متعلقہ علوم ایک ترتیب کے تحت عیاں ہوتے گئے۔ مثلاً ایٹم کے بنتے ہی پارٹیکلز کا انتہائی پیچیدہ سسٹم متعلّقہ علوم کے جلو میں وجود میں آگیا، یعنی ایک علم مستند ہوا اور اسی بنیاد پر فزکس، کیمسٹری، میتھ، الجبرا اور بے شمار علوم متعیّن ہوئے، پھر جب حیات بیدار ہوئی تو اس سے متعلّق زولوجی اور بوٹنی کے علوم پیدا ہوگئے۔ گویا الحادی مؤقف کے مطابق علوم اپنے اپنے وقت پر متعلقہ مظاہر کے تئیں پیدا ہوئے اور مزید ہو رہے ہیں! کیا یہ بات عقلی اور منطقی لگتی ہے کہ تمام کائناتی سسٹم اپنی توجیہ اور وضاحت کے علمی پیرائے کے ساتھ خود پیدا ہوئے اور ہو رہے ہیں؟

بات وہی ہے کہ انسان تحقیق کے دوران کچھ عوامل کو لاشعوری طور پر فرض کیے ایک ذہنی شکنجے کے زیر اثر غور وفکر کرتا ہے کہ اسے کسی مسٹری کا سبب معلوم کرنا ہے یا کوئی حل نکالنا ہے، اور اسی بِنا پر: ''علم کیوں ہے'' کے بجائے ''علم کیا ہے'' پر ہی توجّہ مبذول رکھتا ہے جبکہ ہمارے زیرِ غور یہ ہے کہ: علم کیوں ہے؟

فلسفے کی ایک شاخ نظریہ علم epistimology ہے جس میں علم کی نوعیت کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔اس میں بھی اصل مدّعا ان مستند ذرائع کی چھان بین ہے جن کے ذریعے علم حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً تجربہ، حواس، دلیل، تجزیہ، عقلیت اور منطق وغیرہ سے نتائج کا اخذ کرنا۔ مختصراً حصول علم کے حوالے سے حتمی سائنسی نظریہَ یہ ہے کہ انسان اپنے مشاہدے، تجربات، خیال، یادداشت، شعور اور دلائل وغیرہ سے علم حاصل کرتا ہے۔اس پر غور کریں تو علم کے ماخذ کے حوالے سے یہ ایک نہایت سطحی توجیہ ہے جس میں ریسرچ یا تحقیق میں معاون عوامل کا تذکرہ ہے نہ کہ ماخذ کا! اس کو کچھ جو سمجھا وہ ایک مغربی فلسفی پلاٹو کہ جس کا قول ہے کہ ''علم ہماری روح میں دفن آئیڈیاز کو سمجھنا ہے'' مگر مشکل یہ ہے کہ سائنس اور الحاد روح کو نہیں مانتے۔ اس سے ظاہر یہی ہوتا ہے کہ جدیدیت یا الحاد علم کے ماخذ کے حوالے سے بالکل اندھیرے میں ہے۔

یہ تو تھا مغربی اور الحادی سوچ میں موجود مخمصے اور جمود کا ایک جائزہ، اب دیکھتے ہیں کہ کیا مذہب ماخذ علوم اور ریسرچ کے پیچھے کسی سسٹم کا عقلی بیانیہ رکھتا ہے؟

یہاں ہم اسلام کے حوالے سے بات کریں گے۔ کیونکہ قرآن اللہ کا کلام یا انسانوں سے خطاب ہے اس لیے عموماً یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ تمام کائناتی علوم کا ماخذ وحی اور عقل ہے، جبکہ قرآن کچھ اور کہہ رہا ہے۔ قرآن ذات باری تعالیٰ سے انسانوں کی طرف علوم کی منتقلی کو اس طرح بیان کرتا ہے۔ ''وعلم آدم الاسماء کلّھا''، آدم کو تمام چیزوں کے نام سکھائے۔ البقرہ۔آیت ۳۱

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کو علوم وحی سے پہلے براہ راست ودیعت ہوئے کیونکہ تخلیق کے بعد آدمؑ کو تمام اشیاء کے نام بتائے گئے جس میں ظاہر ہے کہ پارٹیکل سے لیکر کہکشائوں تک ہر ہر معلوم و نامعلوم چیز کے نام شامل ہوئے اور جو بظاہر علومِ کائنات کی ''العلیم'' سے خلیفہ الارض یعنی انسان کی طرف منتقلی تھی، جبکہ آئندہ ادوار میں وحی کے ذریعے انسان کی تربیت وہدایت کی گئی۔ گویا وحی انتقال علوم نہیں بلکہ غالباً ہدایات اور ان ودیعت شدہ علوم کی یاددہانی یا بازگشت بھی ہو سکتی ہے! واللہ اعلم

لیکن یہاں ہمارے سامنے سوال صرف اس سسٹم یا کسی پنہاں میکینزم کو سمجھنا ہے جو ان علوم کو انسان کے لیے عیاں کرتا ہے۔

یہ بات واضح ہو گئی کہ انسان کی تخلیق سے پہلے علم موجود تھا کیونکہ کائنات موجود تھی، ہم اپنی محدود عقل سے یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ غالباً ہوا یہ تھا کہ آدمؑ کی تخلیق کے ساتھ کائنات کے جبّے جبّے اور ذرّے ذرّے کے علوم کے پاسورڈ یا کنجی یا کسی غیر مرئی ساخت کے ڈی کوڈر نام کی شکل میں آدمؑ کے دماغ میں منتقل ہو کر) کسی DNA میں (محفوظ ہوئے جو نسلاً آگے منتقل ہو رہے ہیں۔اس حوالے سے جو

وضاحت عقلی اور منطقی استدلال رکھتی ہے، وہ یہ ہے کہ کائناتی علوم دو حصّوں میں تقسیم کیے گئے، طبعی حصّے کو مظاہر کائنات میں اور دوسرے حصّے یعنی علمی پیرایوں کوانسان کے دماغ میں بیرونی علوم کے پاس ورڈز کے ساتھ محفوظ کر دیا گیا۔یعنی انسان علوم سے پُر کائنات میں ان علوم کے ڈی کوڈر لیکر داخل ہوا۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ انسان کو غور و فکر یعنی ریسرچ کی طرف مائل کیا گیااور بتایا گیا کہ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے وہ تمہارے لیے مسخر و مغلوب کر دیا گیا ہے: وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الاَرضِ جَمِيعًا مِّنهُ اِنَّ فِي ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَومٍ يَّتَفَكَّرُونَ۔(قرآن سورۃ ۴۵۔آیت ۱۳)''اس نے زمین اور آسمانوں کی ساری ہی چیزوں کو تمہارے لیے مسخر کر دیا، سب کچھ اپنے پاس سے ۔اس میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرنے والے ہیں''

گویا ایک طرف کائنات میں مظاہر ہیں جو اسرار لیے ہیں جن میں سسٹم پوشیدہ ہیں۔ دوسری طرف ان مظاہرِ کائنات میں پنہاں علوم تک رسائی کے کوڈ ہر انسان کے دماغ میں ڈی این اے کی کسی نامعلوم ڈائمنشن میں محفوظ ہیں۔ عملی زندگی میں غالباً ہوتا یہ ہے کہ کوئی شخص جب اپنی اُپج کے تئیں کسی شعبے میں دلچسپی لیتا ہے اور کسی اسرار کی گتھّی سلجھانا چاہتا ہے تو اس مخصوص مظہر میں عمل یا غور و فکر سے اس کے دماغ میں محفوظ اس اسرار سے متعلّقہ پاس ورڈز بیدار ہو کر ذہن میں اس سے منسلک نئے خیالات کو مہمیز دیتے ہیں جن کی روشنی میں انسان اس مظہر میں مزید غور اور تحقیق کرتا ہے جس سے وہاں موجود اسرار کی گتھی سلجھ کر کسی نئی دریافت، معلومات یا علم کی شکل میں عیاں ہو جاتی ہے،اس طرح کائناتی راز انسان کی عقلی دسترس میں آتے ہیں۔ یہاں یہ وضاحت بر محل ہو گی کہ جدید سائنس خیالات کے دماغ میں پیدا ہونے کے سسٹم سے بھی پوری طرح واقف نہیں کہ خیال کیوں پیدا ہوتے ہیں۔ لہٰذا انسانی تجسّس اور انہماک کا خیالات کی کسی نئی آبشار کے سوتے بن جانا بعید از قیاس بھی نہیں۔ یوں بھی سمجھیں کہ انسان کے تجسّس اور استغراق کی بنا پر پیدا ہونے والے تصوّرات دراصل بیرونی علوم کے کسی اسرار کے رہنما indicator ہیں جن کے تعاقب میں انسان ان کائناتی رازوں تک جا پہنچتا ہے جو ابھی مخفی ہیں۔ انسان کے علاوہ کوئی اور مخلوق طبعی و غیر طبعی علوم پر غالب نہیں آپاتی کیونکہ انسان کے علاوہ کوئی اور ذی حیات بہترین عقل اور کائنات کے طبعی و غیر طبعی علوم کے پاس ورڈ نہیں رکھتا۔ دوسری دلیل قرآن کا یہ فرمان ہے کہ ہر چیز کے جوڑے بنائے گئے ہیں،اس حوالے سے بھی ہر پنہاں علم ایک تالا ہے جو انسانی دماغ میں اپنی چابی رکھتا ہے۔

ریسرچ اور تفکّر حقیقتاً ً تجسّس اور نیابت کا کرشمہ ہے کہ جس کے بموجب انسان کو کائنات میں موجود ہر ہر مظہر phenomenon کی تہہ تک پہنچنا اور اس پر غلبہ پانا ہے۔ لیکن تفکّر کے اس کھیل میں جب انسان اپنے خالق کی طرف متوجّہ ہوتا ہے اور کسی عام اسرار کی طرح اپنے خالق کو سمجھنے کی سعی کرتا ہے تو الجھن میں مبتلا ہوتا ہے کیونکہ اس کے دماغ میں اس اسرار سے متعلّق کوئی

پاس ورڈ یا کوڈ موجود نہیں! انسان وجودیت کے حصار میں رہ کر عملِ تخلیق اور خالق کے پیرایوں کو اپنی عقل سے نہیں سمجھ سکتا کیونکہ عقل بظاہر دماغ کے مادّی واسطے میں ہی عمل انگیز ہوتی ہے اور مادّے کی کسی صلاحیّت کی وسعت اپنے بنیادی عنصر کی جبلّت پر منحصر ہوتی ہے جو ظاہر ہے کہ مابعد الطبعیات سے کم تر ہے۔ تو ایک کم تر چیز کسی برتر پیرائے کو نامکمل ہی سمجھ پائے گی۔ لہٰذا خالق کو جاننے اور رابطے کے لیے انسان کو اپنی روح کی کسی ڈائمینشن سے رابطہ کرنا ہوتا ہے کہ روح انسان کی تخلیق کے ماحول سے فطری تعلق رکھتی ہے۔

جدید انسان نے کائنات کے رازوں کو عقل کے کوزے میں قید تو کیا لیکن علم و تحقیق کی تعریف، توجیہ یا وضاحت کسی حقیقی عقلی پیرائے کے بجائے محض سطحی پیرائے میں ہی کر پایا۔ منکرِ خدا اسکالر کے لیے علوم کی پیدائش یا علوم کا مخزن و ماخذ بھی کائنات کی پیدائش کی طرح ایک پہیلی ہے جو وہ اب تک بوجھ نہیں پایا۔ اس دائرۂ سوچ پر تبصرہ اس طرح کر سکتے ہیں کہ کسی جاندار کے شعور کا ارتقاء اس کے مشاہدے کی صلاحیت پر منحصر ہوتا ہے۔ ایک رینگنے والا جاندار جو زمین سے چمٹا رہتا ہے، اس کی کائنات کی آگہی محدود ہوتی ہے۔ اس کی بہ نسبت زمین پر چلنے والے اور اُڑنے والے کائنات سے آگاہ تر ہوتے ہیں۔ انسانوں میں بھی عقل کی درجہ بندی سوچ اور فلسفے کی مضبوط بنیاد کی متقاضی ہوتی ہے۔ الحاد کی رینگتی سوچ جو روشن خیالی، جدیدیت و ترقّی پسندی کی پروردہ ہونے کی دعویدار تو ہے مگر بد قسمتی سے نہ علم knowledge کے ماخذ کی نشان دہی کر سکی اور نہ ہی حصول علم اور تحقیق کے میکینزم کا کوئی منطقی بیانیہ narrative سامنے لا سکی ہے۔ اگر ایسا کوئی بیانیہ ہے تو سامنے لایا جائے۔ یہ اسلام ہی ہے جو علوم کے منبع و ماخذ اور علوم کی انسانوں کو منتقلی اور انسانی تحقیقات و دریافتوں کی منطقی، عقلی اور سائنسی وضاحت رکھتا ہے۔ اسلام یہ بھی وضاحت رکھتا ہے کہ علوم کیوں ہیں۔ تحریر مجیب الحق حقی

شک کا مرض اور اس کا علاج

مولانا ابوالکلام آزاد کے تجربات کی روشنی میں

یہ نقطہ نظر بھی پیش نظر رہے کہ انسانی معلومات کے عدم سے حقیقت معدوم نہیں ہوسکتی۔ اگر کسی دوا کا خاصہ ابو بکر رازی اور ابن بیطار سے پہلے لوگوں کو معلوم نہ تھا تو اس کا یہ معنی نہیں کہ دنیا میں اس سے پہلے وہ دوا موجود بھی نہ تھی۔ کونین ہمیشہ سے موجود، اور جب سے موجود ہے، اسی وقت سے دافع تپ ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کا خاصہ تمہیں کل معلوم ہوا۔ بہر حال یہ مثال بعینہ امراض معنویہ از قبیل شکوک و شبہات و انکار جحود اور ان کے علاج کی بھی ہے۔ شک و شبہ کفر و انکار کا مرض ایک ہی ہے اور اس کا علاج بھی ایک ہی ہے ہمیشہ سے یکساں مرض، اور ہمیشہ سے یکساں علاج، یہ بات نہیں ہے کہ معلومات و مکشوفات کے بدلنے سے وہ بھی بدل جائے۔ (تذکرہ، صفحہ ۲۳۶۔۳۷)

شک اور غفلت کا روگ اور کامیابی کی توقع:

کیا دنیا میں کوئی کامیابی بلا ایمان مل سکتی ہے۔ کیا تم شک کا روگ اپنے پہلو میں لے کر دنیا کی چھوٹی سی چھوٹی کامیابی پا سکتے ہو۔ کیا تم دنیا میں ایک مٹھی بھر جو اور چاول بھی پا سکتے ہو جب تک تمہارے اندر طلب کے لیئے حق نہ ہو۔ کیا ایک لمحہ کیلئے دنیا کی کوئی کامیابی اپنا چہرہ تمھیں دیکھا سکتی ہے۔ جب تک کہ تم حق کی راہ میں قربانیاں دینے کیلئے تیار نہ ہو۔

خدا کی اس کائنات کے ایک ایک ذرے کے اندر اس حقیقت کی عالمگیر تصدیق موجود ہے۔ اور اس دنیا میں کامیابی کا کوئی چہرہ نہیں دیکھ سکتا جب تک وہ ایمان، حق اور صبر کی منزل سے نہ گزرے۔ اللہ کا ہر قانون ہر اڑنے والے پرندے کیلئے ہے۔ کیا اللہ اپنا قانون تمہارے لیئے بدل دے گا کیا خدا تمہاری غفلتوں کا ساتھ دے گا اگر تم اپنی غفلت کی وجہ سے اس دھوکے میں پڑے ہوئے ہو تو تم سے بڑھ کر اپنی موت کی طرف جانے والا کوئی نہیں ہے۔ (خطبات آزاد، صفحہ ۶۱)۔

شک کا عارضہ اور ہدایت کا ظہور:

اصل یہ ہے کہ انسان کا عارضہ شک و شبہات اور موت انکار جحود کا اصلی سرچشمہ خوف اس کی فکر و نظر کی ایک طبیعت ثانیہ ہے جو انسان کی ہدایت اصلی و اصلی کے بعد ہی اسباب مذکورہ قرآن و سنت کی بنا پر پیدا ہو گئی تھی، اور جس طرح ظہور ہدایت و دعوت الی الیقین میں حقیقت کا ظہور یکساں رہا ہے، ٹھیک اسی طرح اس طبیعت ثانیہ و عارضہ کا ظہور بھی ایک ہی صورت ایک ہی رنگ روپ، ایک ہی لب و لہجہ بلکہ ایک ہی طرح کی آوازوں اور بولیوں میں ہمیشہ ہوتا رہا۔ (تذکرہ، صفحہ ۲۲۴۔۲۵)۔

خلاف عقل یاماورائے عقل:

وہ ساری باتیں جن کاامکان انسانی دماغ میں آسکتاہے، عقل کے مطابق ہیں۔اس میں سے کوئی بات بھی عقل کے خلاف نہیں،البتہ اس کا علاج ہے کہ خود تمہاری ہی عقل راہِ خلاف میں گم ہے۔تم نے آج تک یہ موٹی سی بات بھی نہ سمجھی کہ کسی بات کے ماورائے عقل ہونے سے یہ لازم نہیں آتاکہ خلاف عقل بھی ہو۔(افکار آزاد، ص۱۲۶)۔

اگر تم غور کروگے تو معلوم ہو جائے گاکہ انسان کی ساری فکری گمراہیوں کااصلی سرچشمہ یہی بات ہے یاتووہ عقل وبینش سے اس قدر کورا ہو جاتاہے کہ ہر بات بے سمجھے بوجھے مان لیتاہے اور ہر راہ میں آنکھیں بند کیے چلتارہتاہے یا سمجھ بوجھ کااس طرح غلط استعمال کرتاہے کہ جہاں کوئی حقیقت اس کی شخصی سمجھ سے بالاتر ہوئی۔اُسنے فوراً جھٹلادی۔

گویاحقیقت کے اثبات ووجود کاساراادار ومدار صرف اسی بات پر ہے کہ ایک خاص شخص کی سمجھ ادراک کرسکتی ہے یانہیں۔

دونوں حالتیں علم وبصیرت کے خلاف ہیں اور دونوں کا نتیجہ عقل وبینش سے محرومی اور عقلی ترقی کا فقدان ہے۔جس عقل وبصیرت کا تقاضہ یہ ہواہو کہ حقیقت ووہم میں امتیاز کریں۔وہی متقاضی ہوں کہ کوئی بات محض اس لیئے نہ جھٹلادیں کہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ عقل کاپہلا تقاضہ ہمیں وہم پرستی وجہل سے روکتاہے دوسرا شک والحاد سے۔

قرآن کہتاہے دونوں حالتیں یکساں طورپر جَہل وکَوری کی حالتیں ہیں اور اہل علم وعرفان دونوں راہوں سے دور ہیں۔جونہ توجہل ووہم کی راہ چلتے ہیں نہ شک والحاد کی۔(افکار آزاد۔ص۷۵۔۱۴۷)۔

قرآن نے بیک وقت دونوں باتوں کی مذمت کی ہے:اس کی بھی کہ بغیر علم وبصیرت کے کوئی بات مان لی جائے اور...اس کی بھی کہ محض عدم ادراک(کسی بات کے دائرہ عقل میں ناسمانے) کی بناپر کوئی بات جھٹلادی جائے۔بل کذبوابمالم یحیطوابعلمہ(ترجمان القرآن، جلد سوم،صفحہ ۵۸۹)۔

امراض قلب وروح اور دارالشفائے وحی:

قلب وروح کی جتنی بیماریاں ہیں اصل مبدء ان کا دو قسموں سے باہر نہیں۔ایک مرض کا نام الحاد وانکار ہے۔ دوسری کا توہم وسوفسطائیت۔ باقی تمام بیماریاں اسی کی اتباع و عوارض وفروع ہیں۔اور دونوں قسموں میں ظہور مرض کے علائم وآثار وعواقب مشترک ہیں۔یعنی دونوں کا نتیجہ شک وجہل واضطراب اور فطرت کی طمانیت اور سرور وراحت قلبی کا ازالہ یعنی باصطلاح قرآن حکیم نفس مطمئنہ کا فقدان۔

پس مرض بلحاظ علت وظہور ہر حال میں صرف یہی ہوا کہ شک وظلمت،اور اس عالم میں وحی الہی اور حکمت نبوت اور ان سے ماخوذ ومکتب کے علاوہ جو کچھ ہے ''یقین'' ''برھان'' ''بصیرت'' اور ''فرقان'' نہیں ہے،اور اسی لیئے دعوت خاتم الادیان ومکمل الشرائع کی نسبت اکثر خطبات نبویہ میں یہ اعلان پاتے ہو کہ اس کا ظہور کرہ ارض کے کمال جہل وفقدان علم کے وقتوں میں ہوا۔یعنی اس لیئے ہوا تا کہ علم و نور سے دنیا کو بھر پور کر دے،اور علم ونور نہیں ہے مگر یقین زوال شک وریب۔ علی الخصوص اولین خطبہ جمعہ بالمدینہ میں فرمایا: پس ظاہر ہے کہ جن نام نہاد علوم کا ماحاصل خود ظلمت ظن وشک اور کوری وہم ورائے سے زیادہ نہیں،وہ مریضان یقین واعتقاد کے لئے کیونکر نقطہ شفاء ہو سکتے ہیں اور جو خود سر گشتہ راہ اور درماندہ ہے وہ دوسرے گم کردہ راہوں کی کیا رہنمائی کر سکتا ہے

مرض کا ازالہ دوا سے ہو سکتا ہے،نہ کہ خود تولید مرض سے۔

اگر دنیا کا اصلی مرض ''یقین'' اور ''بصیرت'' سے محرومی ہے،اور شک وگمان کی ہلاکت تو اس کا علاج وہ کیوں کر سکتے ہیں جن کا خود اعلان یہ ہے کہ ہمارا انتہائے فکر وادراک اس سے زیادہ نہیں کہ ہم نہیں جانتے اور نہیں کہہ سکتے کہ کیا ہے اور کس کے لیئے ہے۔!

اس کا علاج اور نسخہ ''شفاء لمافی الصدور۔''تو صرف اسی ''اعلم الخلائق واعرف العباد'' کے دار الشفائے وحی میں مل سکتا ہے جو شک کی جگہ یقین کا،ظلمت کی جگہ نور کا،عدم علم کی جگہ علم وبصیرت کا ظن وقیاس وگمان کی جگہ بینہ وحجت کا، برہان وفرقان کا دعوی اور اعلان کر رہا ہو۔ پھر تمہارے پاس بھی کوئی ''یقین'' اور ''علم وبصیرت'' ہے جس کو دنیا کے آگے پیش کر سکتے ہو۔(تذکرہ، صفحہ ۹۲۔۱۸۵۵)۔

ملحدین اور عقل کا غلط استعمال

جب سے انسان پیدا ہوا ہے تب سے اس میں ایک صلاحیت پائی جاتی ہے جس کو ہم شک وشبہ، حیرت یا سوال کرنے کی صلاحیت کہتے ہیں۔ لیکن انسانوں کے ایک بڑے ہجوم میں جس کی تعداد کم و بیش 7 ارب سے بھی زیادہ ہے اور ہر انسان کے پاس اپنا دماغ، اپنی سوچنے کی صلاحیت موجود ہے، یہ کیسے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کون سا انسان عقل و فہم میں بہتر اور خیر والا ہے، اور کون سا انسان عقل و فہم میں برائی والا یا شر والا ہے؟ یہاں پر لازم آئے گا کہ اختلاف جنم لے۔ لیکن یہ اختلاف ایک ایسے شخص کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ جو عقل و فہم کا بے دریغ استعمال کرتا ہے، اور خود کو نمایاں رکھنے کی کوشش میں لوگوں کے سامنے ایسے سوالات رکھتا ہے جس کا کوئی سر ہو نہ پاؤں تو آپ کبھی بھی اس شخص کو کسی نتیجہ پر نہیں پائیں گے۔ اس کی چند مثالیں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

ملحد آپ سے سوال کر سکتا ہے کہ اگر ''اللہ نے انسان کو پیدا کیا ہے''؟ تو انسان کو ''آنکھیں'' سامنے کی جانب کیوں عطا کیں؟ ایک آنکھ آگے اور ایک پیچھے کیوں نہ عطا کیں؟ تاکہ وہ آگے اور پیچھے دونوں جانب دیکھ سکتا؟ اب اہل منطق یہ سوال اٹھائیں گے کہ یہ فیصلہ کون کرے گا کہ انسان کا آگے والا حصہ کون سا ہے اور پیچھے والا حصہ کون سا؟ پھر یہ سوال بھی کیا جائے گا کہ اگر انسان کی ایک آنکھ آگے اور ایک پیچھے ہو گی تو لازم بات ہے کہ انسان کے ناک کا ایک سوراخ بھی پیچھے ہونا چاہیے تھا؟ تاکہ وہ جس طرف سے بھی کسی بدبودار چیز کو دیکھتا تو اس کی طرف اسی سمت میں متوجہ ہوتا؟ پھر یہ سوال کیا جائے گا کہ لازم آتا ہے کہ ''انسان کے آگے اور پیچھے 2 منہ بھی ہونے چاہیے تھے؟'' تاکہ وہ اپنی خوراک کو جس طرف کی آنکھ سے بھی دیکھتا اسی طرف سے اس کے خیر و شر یعنی وہ خوراک اس کے کھانے کے لیے درست ہے یا نہیں سمجھ کر کھانا دونوں جانب سے کھا سکتا؟ پھر یہ سوال بھی تو کیا جا سکتا ہے؟ گردن کیوں دی گئی؟ کیا صرف کھانا نگل لینے کے لیے دی گئی؟ نہیں بلکہ اس کو ارد گرد کے ماحول کو دیکھنے کے لیے حرکت کی طاقت عطا کی گئی؟ کیا وجہ ہے کہ انسان کو ایک کان کے ساتھ ساتھ دائیں اور بائیں بھی دو آنکھیں دی جاتیں تاکہ گردن کی حرکت کی حجت و علت ختم ہو جاتی۔ اور انسان کی یہ محتاجی ختم ہو جاتی؟

نوٹ: آپ اندازہ کریں کہ ملحد کے ایک سوال نے کیسے کیسے سوالات کو جنم دیا۔ اور پھر تصوراتی طور پر اگر ان سوالات کو حقیقی تجزیہ سے عمل میں لایا جائے تو سوچیں کہ انسان اگر مندرجہ بالا خصوصیات کا مالک ہوتا تو کتنا بے ڈھنگا اور بد صورت تصور ہوتا۔ ملحد اس بات کے قطع نظر کہ انسانی آنکھیں 180 ڈگری میں اپنے سامنے کی طرف سے دیکھ سکتی ہیں اور گردن کے مڑنے سے انسان اپنے ارد گرد 180 ڈگری اینگل کے وژن سے دیکھ سکتا ہے۔ انسان کا ''نظام انہضام، نظام دماغ، نظام پیشاب'' فطری طور پر آنکھوں والی جانب اس لیے رکھا گیا ہے کہ وہ اپنے اندر پائی جانے والی تبدیلیوں کو محسوس کر سکے۔ پیٹ کا درد، گردوں کا درد، دل کا درد سب کچھ سامنے کی طرف ہی انسان

کو محسوس ہوتا ہے۔ ہندؤں کے بگھوان کی مورتی کو دیکھیں جس کے 6 منہ یا 4 ہاتھ ہیں؟ کیا وہ ایک کامل تخلیق ہے؟ یا ہم یہ کیسے مان لیں کہ جو مورتی خدا ہونے کا دعویٰ کرتی ہو وہ اتنی بد صورت ہو اور اس میں اتنی قدرت موجود نہ ہو کہ وہ دو ہاتھوں، ایک منہ، اور دو ٹانگوں کے ساتھ ہوتے ہوئے ہر کام کو بجالائے؟ کیا خدا بد صورت بھی ہوتا ہے؟ معاذ اللہ، کیا دنیا میں ایسے انسان نہیں پائے جاتے جن کو ایک دکھائی دینے والی چیز اچھی اور دوسروں کو بری لگتی ہے؟ اس بات سے قطع نظر کہ وہ یہ بات مانتا ہے کہ انسان ایک حادثاتی کرشمہ ہے۔ لیکن یہ ماننے کو تیار نہیں کہ اس قدر پیچیدہ انتظام کسی خالق کے بنائے بغیر تخلیق پا ہی نہیں سکتا۔

اہل مذہب یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ جو اعتراض آپ نے اہل مذہب اور خدا کے ماننے والوں پر کیا اسی کا اطلاق ہم آپ پر کرتے ہیں کہ انسان نے ارتقائی مراحل طے کرتے کرتے بے شمار تبدیلیاں اپنے اندر دیکھیں. آخر کیا وجہ ہے کہ انسانی شعور ان تبدیلیوں پر قابو نہ پا سکا؟ یعنی ماحول سے اخذ شدہ تبدیلیوں کا محتاج نہ رہتا؟ اور اپنی مرضی سے اپنے جسم کو ڈھال لیتا؟ اور جو سوال آج کے جدت پسند انسان کے ذہن میں پائے جا رہے ہیں وہی سوالوں کا حل انسانیت کے لیے خود پیش کرتا؟ ملحدین اس کا جواب کبھی بھی نہیں دے سکتے۔ حتیٰ کے قیامت آجائے گی لیکن یہ لوگ شکوک وشبہات کی ایسی دلدل میں پھنسے رہیں گے اور موت کا سامنا کرنا پڑ جائے گا۔

یعنی سوالات کا ایسا سلسلہ شروع کر دیا جائے جس سے نفس مسئلہ کی خوب اکھاڑ پچھاڑ ہو، اور ہر سوال سے کئی نقطے اور پہلو کھلتے چلے جائیں۔ پیچیدہ در پیچیدہ علم اس شخص کے حصے میں آئے جو دوسری جانب فریق مخالف کے پاس موجود نہ ہو۔ یہ وہ طریق کار ہے جو صدیوں سے چلا آرہا ہے، اور اس نے دہریت کے پھیلاؤ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ قارئین کرام! اگر انسان واقعی میں ماحول سے اخذ شدہ تبدیلیوں کا حامل ہے تو آگ اس ماحول کا حصہ ہے، کیا وجہ ہے کہ ہندو ہزاروں سالوں سے انسان کو جلا رہے ہیں اور انسان جلتا جا رہا ہے؟ اگر واقعی جینیاتی تبدیلیاں انسان کی جسمانی تبدیلیوں کا باعث بنتی ہیں، اور ابتدائی طور پر مادہ نے انسان کی پہلی حالت ہونے کا شرف حاصل کیا ہے اور ماحول سے چھپکلی، پھر ڈائینو سارس، پھر بڑے دیو قامت بن مانس اور پھر بندروں کی شکل اختیار کر کے موجودہ انسانی شکل تک پہنچا ہے؟ تو لازم طور پر ہمیں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ وقت کی رفتار انسان کو ایسا کرنے سے روک رہی ہے ورنہ ان تبدیلیوں پر اربوں سال نہ لگتے۔ ہم ان سے سوال کر سکتے ہیں کہ انسان کو دوڑنے سے سانس کیوں چڑھ جاتا ہے کیا یہ خامی نہیں؟ یا پھر یہ پوچھ سکتے ہیں کہ انسانی آنکھ بھی تو اسی ماحول کی عطا کردہ ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ انسانی آنکھ سورج کے نیچے یا سامنے کھڑے ہو کر اسے دیکھنے سے قاصر ہے؟ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ سوال کر دیا جائے کہ انسان یا مادہ کی میل اور فی میل سیکس کیوں تشکیل پائے؟ کیا وجہ ہے کہ جو ملحدین انسانیت کا نام لے لے کر عورت کو مرد کے برابر حقوق دینے کی بات کرتے ہیں، یہ ماحول انسان کو صرف مرد رہنے دیتا یا پھر صرف عورت یعنی فی میل، آج کی یہ ہل چل

جس میں عورت کے حقوق کے نام پر عورت کو جگہ جگہ ذلیل کیا جاتا ہے وہ نہ ہوتی؟ کیا آپ یہ بات سمجھنے کو تیار ہیں کہ اگر دنیا میں صرف مرد ہی مرد پیدا ہوتے اور مرد ہی میں بچہ جننے کی طاقت ہوتی تو جنگوں میں لڑنے والے حاملہ مردوں کو تلواروں، گولیوں اور دوسرے ہتھیاروں سے جب قتل کیا جاتا تو کتنے مرد اولاد سے محروم ہو جاتے؟ کیا ملحد بتا سکتے ہیں کہ مردوں کو کیا کہا جاتا؟ ماں یا باپ؟ ملحدین اگر بیس سوال کر سکتے ہیں تو یقین مانیں کہ ان کے خلاف بیس ہزار سوال کیے جا سکتے ہیں۔ یہ صرف اس لیے ہے کہ ان کے دماغ کو منتشر کر دیا جاتا ہے۔

ملحد کا کوئی سوال آپ کو کسی نتیجہ پر نہیں پہنچا سکتا جبکہ مذہب آپ کو کسی نہ کسی نتیجہ پر پہنچا دیتا ہے۔ مثلاً: ملحدین آپ سے سوال کرتے ہیں کہ ''ہم آپ کے نبی محمد ﷺ کو نہیں مانتے کیونکہ یہ سب قصے کہانیاں ہیں (معاذ اللہ)، تاریخ میں کسی محمد ﷺ کا یا عیسی علیہ السلام کا کوئی وجود نہ تھا۔ تو اہل مذہب جواب دیں گے کہ اللہ کے انبیاء کو دیکھنے والی ایک بہت بڑی جماعت موجود تھی۔ محمد ﷺ کو دیکھنے والے ایک لاکھ سے زائد مسلمان صحابہ رضی اللہ عنھم موجود تھے، جن سے ان کے لاکھوں تابعین اور تبع تابعین نے نقل کیا کہ رسول اللہ ﷺ کو اللہ نے نبی بنایا۔ ان کے خاندانوں اور ان کا سلسلہ نسب موجود ہے۔ آج بھی ان کی اولادیں موجود ہیں۔ جن سے تاریخ کی ضمانت لی جاتی ہے. جبکہ ملحدین کے پاس اپنی تاریخ کا کوئی بھی پہلو محفوظ نہیں۔ وہ نہیں بتا سکتے کہ انسان نے سب سے پہلے کیا الفاظ بولے؟ وہ نہیں بتا سکتے کہ ان الفاظ کو سننے والے کتنے تھے؟ یا تھے بھی یا نہیں؟ ان کے پاس اس سوال کا جواب نہیں کہ ان میں کتنے میل اور کتنے فی میل تھے؟ انہوں نے علم کی ترسیل کس طرح کی، کوئی حتمی جواب موجود نہیں؟ سب سے پہلے جس انسان نے لباس پہنا اس کا کیا نام تھا؟ سب سے پہلے جس انسان نے آگ جلائی وہ کون تھا؟ یا کس انسان نے کس انسان کا نام رکھا؟

نوٹ: یہ موازنہ نہیں ہے بلکہ تاریخ کے خیر و شر کو سمجھنے کی ایک مثال ہے۔ یعنی کوئی بھی ملحد جو دین کو نہیں مانتا وہ آپ کو کسی نتیجہ تک نہیں پہنچا سکتا۔ لیکن مذاہب نتیجہ خیز ہوتے ہیں اور دین اسلام نے مسلمانوں کو جن نتائج سے آگاہ کر دیا ہے اس کی مثال کسی مذہب میں موجود نہیں۔ مسلمان جانتے ہیں کہ اللہ نے کائنات کی تخلیق سے 50 ہزار سال پہلے تقدیر یعنی پلان مرتب کیا۔ پھر کائنات اور اس میں موجود اشیاء کی تخلیق کی۔ پہلا انسان آدم تھا، وہ ایک مرد تھا، اس کی پسلی سے حوا کو پیدا کیا گیا۔ آدم علیہ السلام کے ذریعے شیطان اور شیطان کے ذریعے آدم علیہ السلام کو آزمایا گیا۔ پھر ان کو جنت میں رکھا گیا۔ جنت میں اللہ نے ان کو ایک ابتلاء یا آزمائش میں مبتلا کیا۔ آدم سب سے پہلے بولے۔ آدم علیہ السلام کو علم دیا گیا۔ آدم علیہ السلام کو کثیر اولاد حوا علیھا السلام کے ذریعے عطا کی گئی۔ آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا گیا۔ آدم علیہ السلام کو زمین میں موجود تین رنگوں کی مٹی سے پیدا کیا گیا۔ یعنی سرخ، سیاہ اور سفید۔ آدم علیہ السلام سے

اب تک کے لوگ سب اسی ابتلاء میں مبتلا ہیں۔ موت اس لیے دی جاتی ہے کہ انسان کے اعمال کا محاسبہ آخرت میں دیا جا سکے۔ قیامت قائم ہو۔ سب سے پہلی موت آدم کی اولاد کو ہی آئی۔ سب سے پہلے آدم کی اولاد ہی کو دفنایا گیا۔ انسان کو اس امتحان کا نصاب دیا گیا۔ وہ دین اسلام ہے۔ انسان کو اسی پر عمل پیرا ہو کر اللہ سے اپنے گناہوں سے نجات حاصل کرنی ہے۔ یہ ہے وہ نتیجہ جس تک دین رہنمائی کرتا ہے۔

ملحد یہ سوال بھی کرتا ہے کہ انسان کو آگ میں کیوں ڈالا جائے گا، اگر آگ ہی میں ڈالنا تھا تو پیدا کیوں کیا۔ جبکہ اگر آپ بغور جائزہ لیں تو وہ یہ سوال تب کرتے ہیں جب انہوں نے دین کی طرف سے پیش کردہ فلسفہ آزمائش کو پس پشت ڈال دیا ہوتا ہے اور اس کے بارے میں کوئی ملحد کچھ بھی علم نہیں رکھتا۔ ملحد آپ سے یہ سوال کر سکتا ہے کہ اللہ نے عورت کے حیض کو پلید قرار دیا ہے، وہ عورت کو اس کے بغیر بھی تو پیدا کر سکتا تھا جبکہ یہی سوال ہم ماحول کو خدا ماننے والوں سے کر سکتے ہیں کہ آپ کا نظریہ حقیقت پر مبنی ہے تو اس مسئلہ پر انسان نے اپنے ارتقاء میں جن بری تبدیلیوں سے اپنے جسم میں اچھی تبدیلیاں پیدا کیں، اس میں عورت بھی حیض سے نجات حاصل کر لیتی۔ آج کا ملحد سائنس کا ڈنکا بجانے میں مگن ہے، میڈیکل سائنس پر فخر کرتا ہے لیکن اربوں سالوں سے موت جیسی بیماری پر آج تک قابو نہ پا سکا؟ آپ جانتے ہیں کہ اگر انسان واقعی ماحول کا بیٹا ہوتا اور اپنے اندر کی تبدیلیوں کا مالک خود ہوتا تو آج یہ دنیا جس کے 7 براعظم ہیں، انسانوں کے جم غفیر کے لیے تھوڑی پڑ جاتی۔ جو انسان آج 5 یا 10 مرلہ کی زمین کے لیے ایک دوسرے کو قتل کر دیتا ہے، وہ کتنا جھگڑالو ہوتا۔ افزائش نسل کے لیے جانوروں کی حد تک اپنی طاقت کا استعمال کرتا۔ ممکن ہے ماں، باپ، بیٹی اور بہن بھائی جیسے مقدس رشتے وجود میں نہ ہوتے۔ جو توازن موت نے انسان اور اس کی زندگی اور اس کے معاشرے میں پائی جانے والی بے شمار تبدیلیوں کی وجہ سے قائم رکھا ہے، وہ زندہ انسانوں کا وہ ہجوم جو شاید ایک کے اوپر ایک رہتا۔ اور کائنات کتنی غیر متوازی ہوتی۔

ملحدین کا طریقہ واردات علوم فلاسفہ کی بنیاد پر ہے۔ ''فلسفہ'' کا معنی ''عقل و دانش'' سے محبت ہے، لیکن فلسفہ کی کوئی جامع تعریف موجود نہیں۔ مسائل کی تحقیق کے نام پر دوسرے علوم کے ''قوانین'' اور ''اصول و ضوابط'' کا ناقدانہ انداز میں جائزہ لے کر اپنی مرضی کی تردید کر دینے کا نام ''فلسفہ'' ہے۔ فلسفہ کا مسئلہ یہ ہے کہ ''دلیل'' کسی چیز کو نہیں مانتے۔ اگر آپ کسی فلسفی کو دلیل کے طور پر قرآن کی آیت یا رسول اللہ ﷺ کے فرمان کو پیش کریں گے تو فوری طور پر دلیل کو ایک مغالطہ کہے گا۔ لیکن جب آپ سائنسی حوالے سے کسی بھی اصول پر دلیل مانگیں گے، وہ تجربہ کو مثال بنا کر دلیل مانے گا۔ فلسفیوں کا یہ انداز فکر ان پر کڑی تنقید کرتا ہے جیسے ''تجزیاتی فلسفہ'' جس میں اشیاء کے اجزاء کو سمجھ کر کل کی تعریف کی جاتی ہے۔ اس میں بے شمار خامیاں ہیں، اور اس کو مندرجہ ذیل مثال سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ آپ کے سامنے قرآن کا ایک جز لکھ دیا جائے گا۔ ومکروا ومکر اللہ واللہ خیر الماکرین ملحد اس آیت پر اعتراض کرے گا کہ اللہ قرآن

میں خود کہہ رہا ہے کہ ''اور جو مکر کرے گا اللہ اس کے ساتھ مکر کرے گا اور اللہ بہتر مکر کرنے والا ہے۔''اس سے تو ثابت ہوا کہ اللہ مکر کر سکتا ہے بلکہ کرتا ہے، اس لیے اس قرآن میں جو بھی ہو گا اس کو ہم مکر بھی تسلیم کریں گے۔اب ایک اہل دین ''اصول ترجمہ اور تفسیر'' کو مد نظر رکھ کر سورۃ آل عمر آن کی اس آیت کا ''سیاق وسباق'' دیکھے گا۔اس کے بعد لغوی اعتبار پر ''مدعی معترض'' کے پیش کردہ لفظ کا اصطلاحی معنی پیش کرے گا کہ عربی زبان میں ''مکر'' سے مراد تدبیر کرنا بھی ہے۔پھر وہ اس آیت کے شان نزول کو بیان کرے گا۔اس کے بعد سمجھائے گا کہ بنی اسرائیل کے مکر کو واضح کرنے کے لیے اللہ نے قرآن میں اس آیت کو نازل کیا۔اس کے بعد وہ اس آیت سے قبل اور بعد والی آیات پیش کر کے معاملہ صاف کر دے گا کہ بھائی یہ آیت تو سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے رفع آسمانی پر دلالت والی آیت سے قبل اللہ نے نازل فرمائی، اور معاملہ صاف ہو جائے گا۔اب یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔آپ ملحدین سے ایسا سوال کر سکتے ہیں کہ ''تجزیاتی فلسفی'' کے پاس ''دین'' کے علم میں ''دین کی تاریخ'' کا علم بھی موجود ہے؟ کیا اس کے پاس ''اصول حدیث اور اصول تفسیر'' کا علم بھی موجود ہے؟ اور کیا اس کے پاس ''عربی ادب اور گرامر'' کا علم بھی موجود ہے؟ جس سے یہ بات ثابت کی جا سکے کہ ''تجزیاتی فلسفی'' کسی بھی مذہب یا دین جس کو ''فلسفی'' ایک کل کے طور پر مانتے ہیں اور اجزائے دین سے اپنی عقل کے تحت ''کل'' پر جو تجزیہ کرے گا وہ بالکل درست کرے گا؟ یہ ایک نہایت احمقانہ اور جاہلانہ بات ہے۔فلسفی یا ملحدین دین کے ماننے والوں کے بد اعمال کو بنیاد بنا کر بطور حجت پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔مثال کے طور پر اگر بد قسمتی سے ایک عالم دین شراب پیتا ہے تو وہ کسی بھی دیندار کے سامنے یہ اعتراض رکھ سکتے ہیں کہ شراب کے حلال و حرام کا تصور بالکل غلط ہے۔(معاذ اللہ) کیونکہ میں نے ایک عالم کو شراب پیتے دیکھا ہے۔ لیکن جب اس سے سوال کیا جائے گا کہ بھائی یہ بتاؤ؟ کیا اللہ نے دین اسلام میں شراب کو کسی جگہ بھی حلال کہا ہے تو وہ اس کا جواب دینے سے قاصر ہو گا۔اسی طرح اگر کوئی زنا کرتا ہے، ڈاکہ ڈالتا ہے، اور وہ نمازی بھی ہے تو شریعت نے کبھی اس کو نہ زنا کرنے کا حکم دیا ہے نہ ہی ڈاکہ ڈالنے کا۔وہ اس کے اپنے نفس کی بد اعمالی ہے۔اس کا تعلق کسی صورت دین سے نہیں ہے۔

آج کے دور میں ''ملحدین'' کے کام میں جتنی جدت موجود ہے، پہلے موجود نہ تھی۔ ملحدین عیسائیوں، قادیانیوں، منکرین حدیث، ہندوؤں، بدھ مت، یہودیوں اور دیگر مذاہب کے کیے گئے اعتراضات کو جمع کرتے ہیں اور اس کو انٹرنیٹ، سوشل میڈیا کے ذریعے عوام زد عام کرتے ہیں۔ان نظریات کو پھیلانے سے ملحدین کو یہ فائدہ ہوتا ہے کہ کالج، یونیورسٹیوں کے طلبہ و طالبات جو دین سے کوسوں دور ہوتے ہیں، وہ ان کے ورغلاوے میں آجاتے ہیں، اور آہستہ آہستہ دین سے مکمل دور ہو کر دہریے ہو جاتے ہیں۔

آج کی دہریت کو کیمونزم، سوشلزم، مارکس ازم، بدھ ازم، ہندوازم جیسے نظریات کی بہت سپورٹ حاصل ہے۔ایسے دہریوں کو ''سیاسی فلسفی'' کہتے ہیں۔ان کا کام صرف اور صرف اسلام کو نشانہ بنانا ہے۔دینی ریاستوں میں رائج نظام کو بنیاد بنا کر اس کو بے جا ''اسلام'' پر تھوپنے کی کوشش کرتے ہیں مثلاً ''کرنل قذافی'' نے اپنے ساتھ ''خواتین گارڈز'' رکھی تھیں۔اب اس کو بنیاد بنا کر اسلام کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ''داعش'' جیسی تنظیموں کو خود پروان چڑھاتے ہیں، اور ان سے مسلمانوں کا ہی قتل عام کروا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اسلام ایک عدم برداشت اور دہشت گردی والا مذہب ہے۔اسلام قتل وغارت کا درس دیتا ہے۔میڈیا میں اربوں روپیہ انویسٹ کرتے ہیں، طالبان سے خودکش حملہ کی قبولیت کا ڈھونگ رچاتے ہیں اور اسلام کو بدنام کرتے ہیں۔اسلام نے کبھی کسی مسجد، کسی جلسہ یا جلوس یا کسی دوسری عبادت گاہ کو تباہ کرنے سے گریز کا حکم دیا ہے۔لیکن اگر آپ ان ملحدین سے پوچھیں تو وہ تاریخ کی من گھڑت روایات بیان کرنے کے علاوہ کچھ جواب نہیں دے پاتے۔

آج کے الحاد کو ''تعلیمی فلسفہ'' کی بہت سپورٹ حاصل ہے۔کچھ عرصہ قبل ہی یہ دیکھنے میں آیا کہ امریکہ اور کینیڈا کی یونیورسٹیوں میں ''الحاد کیا ہے یا دہریت کیا ہے'' کے عنوان سے کتب شامل کی گئی ہیں۔اور یہ نچلی سطح پر سکولوں میں بھی رائج کی گئی ہیں۔ایشیائی ممالک میں ان کتب کو صرف روس اور چائنہ کے چند اداروں میں ہی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔اس کا ایک انداز یہ دیکھنے کو ملا کہ افغانستان، پاکستان اور ہندوستان کے تعلیمی بورڈ میں اسلام سے پھیلنے والی تعلیمات کو متشدد ثابت کیا گیا ہے۔اور ایسی شخصیات جن کا تعلق صرف دین سے ہو اور خاص دین کی تعلیم دینا ان سے منسوب ہو ان شخصیات کے نام کتب نصاب سے نکال دیے گئے ہیں۔جیسے پاکستان کی مثال لی جائے ''خالد بن ولید'' کا نام کتب نصاب سے نکالا گیا ''ملالہ یوسفزئی'' کا نام ڈال کر، اور ''سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا یا سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا'' کا نام نصاب سے نکالا گیا۔ ''نیلسن منڈیلا'' کا نام نصاب میں ڈال دیا گیا۔سورۃ الانفال، سورۃ الاحزاب جیسی سورتیں نصاب سے نکالی گئیں جس کا مقصد یہ بتایا گیا کہ اس سے بچوں میں انتہا پسندی اور دہشتگردی پھیلنے کا خطرہ ہے۔لیکن اس طرف توجہ نہیں دی گئی کہ اس نصاب کو پڑھانے والے کیا یہ قابلیت رکھتے ہیں کہ ساتھ ساتھ بچوں کی مثبت تربیت کو بھی مد نظر رکھیں کہ کل کو ان کے دلوں میں اسلام کے متعلق کوئی منفی خیال نہ آئے۔چھوٹی چھوٹی چیزوں کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے لیکن یہ تمام چھوٹی چھوٹی چیزیں بہت بڑے بڑے مسائل پیدا کرتی ہیں۔ایمانیات اور دینیات نفس میں نتیجہ اخذ کرنے کی صلاحیت پیدا کرتے ہیں۔الحاد بندے میں تشکیک، شبہات اور غیر سنجیدگی، جلد بازی اور عدم ٹھہراؤ پیدا کرتا ہے۔اس بات سے قطع نظر کہ کوئی ملحد اللہ کو نہیں مانتا، یہ بات سمجھ لیں کہ آپ جب بھی

کسی ملحد سے بات کریں گے تو آپ کو اس میں خود پسندی سے زیادہ کچھ نظر نہیں آئے گا۔ اللہ مجھے اور آپ کو دین پر زندہ رکھے اور خاتمہ بالا یمان فرمائے۔ آمین۔

عبدالسلام فیصل

کالجز/یونیورسٹیز کے سٹوڈنٹس سے ایک درخواست

آج سے دو سو برس پیشتر ایک آدمی اچھا مسلمان ہو سکتا تھا اور رہ سکتا تھا خواہ اس نے کبھی امام غزالی اور ابن عربی کا نام بھی نہ سنا ہوتا۔ اس وقت نرا ایمان کافی تھا کیونکہ اس کی حفاظت ہوتی رہتی تھی۔ آج کا مسلمان اگر ان عقائد کے بارے میں تفصیلی اور نظری علم نہیں رکھتا جن پر اس کا ایمان ہے تو اس کے ایمان کی سلامتی ہر دم خطرے میں ہے۔ ہاں کسی شخص کو فطرتاً سادگی کا ایک ناقابلِ تسخیر حصار میسر ہو تو اور بات ہے۔ آج علم کا کوئی بھی شعبہ چاہے وہ سماجی ہو یا سائنسی، اسکی ہر قسم کو مغرب نے دین کے لیے اجنبی بنانے میں کامیابی حاصل کر لی ہے، آج دنیا کو چلانے والا، انسانی ذہن کی تربیت کرنے والا، انسان کے عملی مقاصد پورا کرنے والا کوئی بھی جدید علم یا ڈسپلن ایسا نہیں ہے جو مذہبی ذہن و دینی شعور کو اپنے اندر داخل ہونے کا راستہ فراہم کرتا ہوں، آج کا ہر علم بلا استثنا دینی شعور کے مسلمات و متعقدات

سے یا تو براہ راست اپنی قوت انکار کے ساتھ متصادم ہے یا اس سے ایک تحقیر کے ساتھ لا تعلق ہے۔اس جدید علمی ماحول نے اپنے سے تربیت پانے والے اذہان میں بھی یہ مذہب بیزار رویے اور مزاج پوری طرح انجیکٹ کر دیے ہیں۔یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی بھی مغربی علم اس علم کے اور یجنل مقدمات و مقاصد کے ساتھ اس علم کی منطق کی مطابقت کرتے ہوئے حاصل کیا جائے اور اس علم کے حصول کے نتیجے میں وہ آپ کو اپنے دینی شعور کے لیے معاون نظام استدلال فراہم کر سکتا ہو۔تو ایسی صورتحال میں سب سے بڑی تبدیلی یونیورسٹی کالجوں میں رونما ہونی یقینی تھی۔

وہ لوگ جن کو کسی متمدن شہر کی یونیورسٹی یا کالج کے شعبہ انگریزی، فلسفہ، نفسیات یا سماجیات کے آتش کدے سے گزرنے کا اتفاق ہوا ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ مغربی امداد اور مغربی ایجاد کے جلو میں نظریات کس طرح آئے ہیں اور ان کی چوٹ کہاں کہاں پڑتی ہے۔ الحادی لٹریچر کی تشہیر اور سوشل میڈیا پر جارحانہ اور سرگرم ملحدین نے علمی چیلنجز کا ماحول اور ذہنی تبدیلی کے لیے اثر انگیز حالات پیدا کر دیے ہیں۔ایک مسلمان جس کا گزر ان ریگ زاروں سے ہے، ان اداروں میں یا اس مواد کو پڑھ رہا ہے لیکن ان چیلنجز سے نمٹنے کے لئے مناسب ذہنی، روحانی اور مذہبی آگاہی نہیں رکھتا' اسکا پھسلنا بہت آسان ہے۔اس ریگ زار سے گزرنے والے کی اسی دینی و علمی پیاس اور کرب کو دور کرنے کا سامان کرنا اس دور کی سب سے بڑی دینی خدمت ہے۔

افسوس کہ آج کے دور میں علماء سے تعلق نا ہونے کے برابر ہے، پھر ایسے علماء جو جدید ذہن کے اشکالات کو پوری طرح سمجھ کے انکو دور کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں' کا ملنا بہت مشکل ہے۔ایک بڑا مسئلہ ہمارے نوجوانوں کے لیے ان اشکالات کو کسی کے سامنے زبان پر لانے کا بھی ہے۔ان مسائل سے نبٹنے اور اس علمی خلا کو پر کرنے کے لیے سب سے آسان اور موثر طریقہ یہ تھا کہ ایک آن لائن ریسورس تشکیل دیا جائے جس میں ہر جدید و قدیم اشکال کو بالکل جدید و علمی انداز میں ہر پہلو سے زیر بحث لایا جائے اور تشکیک کا شکار ہونے والے مسلم نوجوان بغیر کسی بڑی جدوجہد کے اس سے استفادہ کر سکیں۔ مذہب فلسفہ اور سائنس پیج اور الحاد ڈاٹ کام سائیٹ اسی سلسلے کی ایک کوشش ہے جنکا قیام دو سال پہلے میں عمل میں لایا گیا۔اس پیج اور سائیٹ کے قیام کا سب سے بڑا مقصد اپنی عوام کو وہ معلومات فراہم کرنا ہے جس سے یہ واضح ہو کہ اسلام پرستی مربوط اور حقیقی وریشنل ہے اور الحاد پرستی محض ایک عقلی سراب ہے۔ان دو سالوں میں ہماری سائیٹ پر تقریبا تمام اہم موضوعات زیر بحث آچکے ہیں، گزشتہ سال کے مڈ سے ہمارا فوکس مذہب متعلقہ اہم موضوعات کو گہرائی میں زیر بحث لانے پر رہا، اس میں قرآن، حدیث، سیرت، تاریخ، ریاست، جہاد، اقلیتیں وغیرہ کے تعلق سے تقریبا تمام اہم اشکالات موضوع وائز زیر بحث آئے، آجکل پیج پر مذہب، فلسفہ اور سائنس کے تعلق سے اٹھائے گئے اشکالات زیر بحث ہیں۔

قارئین ! الحاد ڈاٹ کام جس فکری محاذ پر یہاں پہرہ داری کا فریضہ انجام دینے کے لیے کوشاں ہے اس کا پایہ تکمیل کو پہنچنا آپ کے تعاون بغیر ممکن نہیں۔ جو خصوصی تعاون اس سلسلہ میں آپ سے درکار ہے وہ یہ کہ الحاد ڈاٹ کام کی تحریرات کو اس کے مخاطب طبقے تک زیادہ سے زیادہ پہنچانے میں آپ ہمارا ہاتھ بٹائیں۔ یہ سب تحریری محنت اگر اس کے ضروت مند طبقے تک پہنچ ہی نہیں پاتی یا اپنے مخاطب طبقے کی پوری توجہ ہی نہیں لے پاتی تو عملاً بے فائدہ رہتی ہے۔ ہمارے قارئین جانتے ہیں کہ یہ سب تحریری محنت کسی گروہی یا فروعی چیز کو کھڑا کرنے کے لیے نہیں ہو رہی بلکہ امت کی کچھ محکم بنیادوں کو اذہان میں پختہ کرنے کے لیے ہے۔ آپ پر یہ بھی مخفی نہ ہو گا، الحاد ڈاٹ کام کو لوگوں تک پہنچنے کے لیے کسی مسلکی نفری یا تنظیمی نیٹ ورک کی سہولت حاصل نہیں ہے۔ ہمارے پاس اپنے مخاطب طبقے تک پہنچنے کے لیے آپ قارئین کے سوا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ ہماری درخواست ہے کہ پیج اور سائیٹ کا حلقہ بڑھانے میں آپ ہمارا ساتھ دیں۔ اس کے لیے ابھی تک کئی صورتیں اختیار کی جاتی رہی ہیں مثلاً اپنے سوشل میڈیا حلقے میں تحاریر کی شئیرنگ، گروپس و پیجز پر ہماری تحاریر کی تشہیر وغیرہ۔ اسکا فائدہ بھی ہوا لیکن اب چونکہ چیلنج صرف سوشل میڈیا تک محدود نہیں رہا ہے اس لیے ضرورت اس بات کی ہے اس مصنوعی دنیا سے باہر بھی اس ریسورس کا تعارف کروایا جائے۔ اپنی نجی محفلوں میں اسکا تذکرہ کیا جائے۔ جیسا کہ اوپر لکھا کہ اس فتنے سے سب سے زیادہ کالج، یونیورسٹی کے سٹوڈنٹ متاثر ہو رہے ہیں اس لیے ان حلقوں میں آواز لگانے کی ضرورت زیادہ ہے۔ ہمارے وہ قارئین جو خود یا انکے دوست احباب کسی کالج، یونیورسٹی سے منسلک ہیں، وہ خود یا انکے ذریعے ان کالجز یونیورسٹیز میں اسکی پروموشن کے لیے ایک تحریکی انداز میں کوشش کر سکتے ہیں۔ ایک آسان اور سمپل طریقہ یہ ہے کہ پیج اور سائیٹ کے تعارفی پوسٹرز جنکا لنک نیچے دیا جا رہا ہے، کا پرنٹ لے کے اپنے کالج/یونیورسٹی کے مختلف ڈیپارٹمنٹس کے نوٹس بورڈ پر یا دوسرے ایسے اہم یا زیادہ نوٹس ہونے والے مقامات پر چسپاں کر دیا جائے۔

استفادہ مضمون: حامد کمال الدین

مولانا ابوالکلام آزادؒ اور دہریت سے ایمان کیطرف واپسی کا سفر

ہم جیل میں تھے اور یہ خیال پیدا نہیں ہوا تھا کہ مولانا اپنے مفصل حالات مجھے لکھا دیں، ان میں جو مذہبی انقلاب ہو چکا تھا اس کی تفصیل جاننے کی فکر تھی ایک دن عرض کیا'' آپ نے پیر گھرانے میں آنکھ کھولی پھر آپ کے مذہبی خیالات میں یہ حیرت انگیز انقلاب کیونکر ہو گیا۔۔؟ کہنے لگے ''لکھ کر جواب دوں گا'' چند دن بعد ذیل کی تحریر میرے ہاتھ میں دے دی جو آج بھی میرے پاس محفوظ ہے:

آپ کا یہ سوال میرے لئے سب سے زیادہ اہم ہے. میں پیدائشی طور پر مسلمان ہوں لیکن آپ یہ سن کر تعجب کریں گے کہ پیدائشی اور خاندانی ورثے میں مجھے جو مذہب ملا تھا میں اس پر قانع نہیں رہا اور جوں ہی مجھ میں اتنی طاقت پیدا ہوئی کہ کسی چیز کو اپنے سے الگ کر سکوں میں نے اسے الگ کر دیا اور پھر ایک خالی دل و دماغ لے کر طلب و جستجو میں نکلا اس جستجو میں مجھے بہت سی منزلوں سے گزرنا پڑا اور پے در پے کئی ذہنی انقلاب میرے دماغ پر طاری ہوئے بالآخر میں نے اپنا مقصود حاصل کر لیا اور یہ وہی مقام ہے جہاں اپنے آپ کو اب پاتا

ہوں بلاشبہ یہ اسلام ہے لیکن وہ اسلام نہیں ہے جو محض رسم و تقلید کا مجموعہ تھا اور مجھے پیدائشی ورثے میں ملا تھا میں ایسا اس لئے مسلمان نہیں ہوں کہ مجھے خاندانی طور پر ایسا ہی ہونا چاہئے، بلکہ اس لیے ہوں کہ میں نے اپنی طلب و جستجو سے اس کا سراغ پایا ہے مجھے یقین اور اطمینان کی تلاش تھی اور وہ مجھے یہی ملا۔۔۔

انسانی دماغ، خاندان، تعلیم، سوسائٹی، اور گردوپیش کے مؤثرات (اثر انداز ہونے والی اشیا) کی مخلوق ہوتا ہے علی الخصوص مذہب کے بارے میں خاندانی تقلید کا اثر اس درجہ قوی ہے کہ اس سے باہر نکلنے کا کبھی ہمیں وہم و گمان بھی نہیں گزرتا۔۔۔۔ کتنے ہی انسان ہیں جو اپنی شہ زوری میں بڑی بڑی آہنی زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں گے لیکن وہ اس رشتے کو چھو بھی نہیں سکتے جو آبائی تقلید کا ان کی گردن میں پڑا ہے فی الحقیقت انسان کی تمام غفلت و گمراہی کی اصلی بنیاد یہی ہے، اور میں یقین کی گھاٹیوں میں سرگرداں رہا۔۔۔ عرصے تک میٹیریلزم (مادہ پرستی) اور ریشنلزم (قوم پرستی) کے جلوہ سراب کو آب حیات سمجھتا رہا. اس راہ کی جتنی بیماریاں ہیں، وہ بھی مجھے لگیں اور جتنے نسخے ہیں، وہ بھی میں نے استعمال کیے. بالآخر جب قدم جستجو سے تھک گئے، اور ہمت نے جواب دے دیا، تو اچانک پردہ ظلمت چاک ہوا اور نظر اُٹھائی تو حقیقت گم گشتہ کا چہرہ بے نقاب سامنے موجود تھا. اس منزل پر پہنچ کر یہ سب سے بڑی بنیادی سچائی مجھ پر کھل گئی کہ مذہب کی راہ عقل و ادراک سے نہیں بلکہ خالص اور بے میل جذبات سے طے کی جاسکتی ہے. اور مذہبی سچائی کا پالینا اس لیے کٹھن نہیں ہے کہ وہ مشکل ہے، بلکہ اس لئے کہ وہ بہت ہی آسان ہے، اور انسان کی سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ وہ سامنے کی آسان اور عام چیزوں کو ہمیشہ نظرانداز کر دیتا ہے۔!

ایک راہ گم کردہ مسافر برسوں تک کوہ و صحرا کی خاک چھان کر بالکل مایوس ہو گیا ہو، اور عالمِ مایوسی میں کسی درخت کے نیچے گر کے بے ہوش ہو گیا ہو، لیکن جب بے ہوشی سے بیمار ہو، تو دیکھے کہ اپنے وطن میں خاص اپنے محبوب گھر کی چھت کے نیچے پڑا آرام کر رہا ہے! یہ دیکھ کر اس کا کیا حال ہو گا؟ یقین کرنا چاہیے. میرا یہی حال ہوا۔

میری پیدائش ایک ایسے خاندان میں ہوئی تھی، جو صدیوں سے مذہبی بزرگی اور پیشوائی رکھتا تھا، اور ہزاروں لاکھوں آدمی اس کے سامنے اطاعت اور تعظیم کا سر جھکاتے تھے. میں نے جب ہوش سنبھالا تو اپنے چاروں طرف بزرگی اور تقدس کا جلوہ دیکھا، اور ایک بت کی طرح اپنے خاندان کو معظم و محترم پایا۔ میں ابھی بچہ ہی تھا کہ ہزاروں آدمی آتے تھے اور بوجہ پیرزادہ ہونے کے میرے ہاتھ پاؤں چومتے تھے. اپنے بزرگوں کے سوا جس آدمی کو دیکھتا تھا، اپنے آگے جھکا ہوا اور ادب و تعظیم سے مرعوب پاتا تھا. بڑے بڑے قابل اور معمر آدمی آتے

تھے اور وہ میرے سامنے (جب کہ میری عمر آٹھ نو برس سے زیادہ نہ تھی) اس ادب واحترام سے بیٹھتے تھے، گویا میں سچ مچ کوان کا بت ہوں میرے منہ سے جو بات نکلتی، خواہ وہ کتنی ہی فضول اور بے معنی ہوتی، لیکن وہ بڑے ہی اعتقاد اور احترام کے ساتھ سر جھکائے ہوئے سنتے اور ہر بات پر آمنّا اور صدّقنا کرتے۔۔۔۔!

ظاہر ہے ایسی فضا میں پرورش پانے کا قدرتی اثر میرے دماغ میں کیا پڑ سکتا تھا۔ سب سے پہلے تو یہ کہ میں اپنا خاندانی شان وشکوہ دیکھ کر اسی میں سرشار رہ جاتا اور تحصیل علم کے لیے میرے اندر کوئی طلب وکاوش پیدا ہی نہ ہوئی جیسا کہ بڑے بڑے پیروں اور پیشواؤں کی اولاد اپنے موروثی عزت واحترام کی وجہ سے عموماً بے پرواہ ہو جاتی ہے، اور اکثر صورتوں میں جاہل واپاہج بن کر رہ گئی ہے. پھر اگر والد مرحوم کی کوشش، خاندانی روایات کا اثر اور ذاتی شوق وطلب کی وجہ سے ایسا نہ ہونے پاتا، جب بھی ظاہر ہے کہ ایسی موروثی اور گہری مذہبی فضا میں کسی نئ فکر اور جستجوؤں کی راہ کا کھلنا، تقریبا محال تھا۔

اپنی موجودہ حالت سے بلند تر حالت کی طلب جبھی پیدا ہو سکتی ہے، جب کوئی نہایت ہی قوی خارجی محرّک موجود ہو، لیکن یہاں نہ صرف یہ بات تھی کہ کوئی ایسا محرّک موجود نہ تھا بلکہ ایسے محرکات کے لیے اس کی آب وہوا موافق ہی نہ تھی۔ میرے خاندان کی تمام پرانی روایات نہایت سخت راسخ الاعتقادی کی چلی آتی تھیں. گھر میں شب وروز ان باتوں کا چرچا اور اعتقاد رہتا تھا، جو ایسے اعتقاد کا لازمی نتیجہ ہیں ۔ والد مرحوم بھی نہایت سخت راسخ الخیال شخص تھے. ۔ کیوں؟" اور "کس لئے؟" کی اُن کے اعتقاد میں گنجائش ہی نہ تھی۔ مسلمانوں میں جو مذہبی عقائد کے اسکول آزاد خیال اور اعتقادی امور کو فکر واجتہاد کے ساتھ قبول کرنے والے ہیں، وہ اُن کے بھی سخت مخالف تھے، اور تمام عمران کے رد میں قلم وزبان سے کام لیتے رہے تھے۔ ان کی دو تہائی تصنیفات انھی کے رد میں ہیں۔ میرے تمام استاد جن سے میں نے ابتدا سے لے کر آخر تک تعلیم حاصل کی، ایسے ہی خیالات کے تھے، اور اب میں سوچتا ہوں، تو ان میں سے بعض کی سختی یہاں تک بڑھی ہوئی تھی کہ ایک خفیف سے اختلاف رائے پر بھی بالکل کافر، یعنی اسلام سے خارج ہو جانے کا فتوی دے دیتے تھے. جو نصاب تعلیم میں مجھے پڑھایا گیا اور مذہبی علوم کی جن کتابوں کی تعلیم دی گئی، وہ بھی سرتاسر اسی مسلک پر مشتمل تھیں۔

پس ایسی حالت میں کیونکر امید کی جاسکتی ہے کہ ایک لمحے کے لئے بھی میرا دماغ اس دائرے سے باہر کا کوئی تخیّل کر سکتا، یا کسی مزید طلب اور جستجو کی خلش میرے اندر پیدا ہو سکتی؟ قدرتی طور پر میری بڑی سے بڑی ترقی بھی اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی تھی کہ میں اپنی خاندانی روایات کے مطابق ایک اچھا کامیاب پیر اور مولوی ہوتا، جس کے ہاتھ چومنے والوں کا حلقہ بہت دور تک پھیلا ہوا نظر آتا۔۔

لیکن یہ بات نہایت عجیب سمجھی جائے گی کہ نتیجہ بالکل اس کے برعکس نکلا۔ اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ کیوں۔ تو میں اِس وقت بھی اِس کا جواب نہیں دے سکتا۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ ابھی میری تعلیم ختم نہیں ہوئی تھی اور زیادہ سے زیادہ میری تیرہ برس کی عمر تھی کہ میرا دل اچانک اپنی موجودہ حالت اور ارد گرد کے منظر سے اُچاٹ ہو گیا اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں کسی اچھی حالت میں مبتلا نہیں ہوں. یہ بے اطمینانی بڑھتی گئی، حتیٰ کہ مجھے اُن ساری باتوں سے، جو لوگوں کی نظروں میں انتہا درجہ عزت واحترام کی باتیں تھیں، ایک طرح کی نفرت ہو گئی، اور میں اندر ہی اندر اُن باتوں پر شرم اور ذلت محسوس کرنے لگا. اب جو لوگ میرا ہاتھ پاؤں چومتے، تو مجھے محسوس ہوتا کہ گویا ایک بہت ہی سخت بُرائی کا کام ہو رہا ہے۔ چند دن پہلے یہی منظر میرے لئے نہایت ہی فخر و غرور کا باعث تھا۔

چند دنوں کے بعد یہ جذبہ ایک دوسرے رخ پر بہنے لگا. اپنی حالت کے احتساب نے اپنے عقائد وافکار کے احتساب پر توجہ دلائی، اور اب جو میں نے اپنے مذہبی عقائد کا جائزہ لیا، تو اُس بجز آبائی تقلید، دیرینہ رسم پرستی، اور موروثی اعتقاد کے اور کچھ نہ تھا'' میں ایسا کیوں یقین کرتا ہوں۔۔۔۔؟''

اِس کا جواب مجھے اس کے سوا کچھ نہیں ملتا تھا کہ ''چونکہ ایسا ہی مجھے بتایا گیا ہے'' یا'' چونکہ ایسا ہی میرے باپ دادا کو اعتقاد تھا'' یہ جواب میرے دل میں شک اور اضطراب کا ایک طوفان برپا کر دیتا اور میں اپنے تمام پر شکوہ عقیدوں اور سارے طلسم نما خیالات کے ساتھ بے اختیار بہنے لگتا۔ کیا فی الحقیقت خدا کا وجود ہے۔؟ اور کیا واقعی مذہب کے تمام بتائے ہوئے عقائد حقیقت رکھتے ہیں۔؟ اگر ایسا ہی ہے تو اتنی بڑی حقیقت اور سچائی میں اتنا اختلاف کیوں ہے؟ مذہب اگر ہدایت اور امن کے لئے ہے، تو پھر وہی انسان کے تمام اختلافوں اور جھگڑوں بلکہ انتہا درجہ خونریزیوں کا سبب کیوں بن گیا ہے؟ حقیقت ایک ہی ہو سکتی ہے. ایک سے جو زیادہ ہے وہ تو حقیقت نہیں ہے۔

پھر اگر دنیا کے اتنے بے شمار مذہبوں میں سے کسی ایک مذہب کو مان بھی لیا جائے، تو بھی مشکل کہاں ختم ہوتی ہے؟ ہر مذہب کے اندر بھی تو بے شمار اختلافات پائے جاتے ہیں، اور بہت سی جماعتوں میں اس کے ماننے والے بٹ گئے ہیں؟ ایک کیوں حق پر ہے اور دوسرا کیوں حق پر نہیں؟''

یہ تین سوال تھے، جو 14 برس کی عمر میں مجھ پر اس طرح چھا گئے تھے کہ خون اور گوشت کی جگہ میرے اندر صرف انہی کی گونج بھری ہوئی محسوس ہوتی تھی. گرہ کو جس قدر کھینچا جائے اُتنا ہی اور زیادہ الجھ جاتی ہے۔ اسی طرح میں جس قدر حل کرنے کی کوشش کرتا تھا اتنا ہی زیادہ الجھاؤ بڑھتا جاتا تھا۔

میں نے ہر طرح کی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا. مختلف مذہبوں کی کتابیں بار بار دیکھ ڈالیں. میں اس وقت بمبئی میں تھا. وہاں مجھے متعدد عیسائی، یہودی، پارسی، بہائی، ناستک (دہریہ) اور ہندو عالموں سے ملنے اور بحث و مباحثہ کا موقعہ ملا، لیکن ان کی باتیں میری الجھن کو اور زیادہ کرتی تھیں. ان کے جوابات اور مباحث سن کر مجھے معلوم ہوتا تھا کہ میری پریشانی اس سے کہیں زیادہ ہونی چاہیئے. جس قدر میں سمجھے ہوا تھا. بالآخر یہ اندرونی تکلیف یہاں تک بڑھی کہ میں بیمار ہو گیا۔۔

غذا بند ہو گئی نیند اُچاٹ ہو گئی اس اثنا میں میں نے ماڈرن فلاسفی اور سائنس کی مختلف شاخوں کا مطالعہ کیا، جس قدر مطالعہ مشرقی زبانوں کے تراجم سے کر سکتا تھا. اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مذہب کی طرف سے میری بے اطمینانی اور زیادہ گہری ہو گئی. اب مجھ پر وہ دروازہ کھلا، جو اس راہ میں ہمیشہ کھلا کرتا ہے، یعنی مذہب اور عقل کی تطبیق و اتحاد کا طریقہ. اس کے بھی متعدد اسکول ہیں. میں نے سب کا مطالعہ کیا، اور اس سے اتنا ضرور ہوا کہ ایک عارضی سکون مجھے ہو گیا. اسی زمانے میں میں نے سر سید احمد خان مرحوم کی کتابوں کا مطالعہ کیا جس کی نسبت سمجھا جاتا ہے کہ انھوں نے موجودہ زمانے میں مذہب اور ماڈرن سائنس کو ملانے کے لئے ایک نئے اسکول کی بنیاد ڈالی، مجھ پر ان کی تصنیفات کا بہت اثر پڑا، حتی کہ کچھ دن تک میرا یہ حال رہا کہ میں بالکل ان کا مقلد اور پیرو ہو گیا تھا۔

مگر یہ واقعہ عارضی تھا بہت جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ منزل مذہب کی طرف لے جانے والی نہیں ہے بلکہ مذہب سے انکار کی ایک نرم اور ملائم صورت ہے. آخری نتیجہ میرے دل و دماغ پر حاوی ہو گیا تھا۔ یعنی گو میں زبان سے صاف صاف اقرار نہیں کرتا تھا، لیکن میرے اندر قطعی انکار و الحاد کی آواز گونج رہی تھی. میں اب ایک پکا دہریہ ہو گیا تھا. میٹیریلزم اور ریشنلزم کے اعتقاد پر میرے اندر فخر و غرور تھا. اور مذہب کے نام میں جہل و توہم کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا، تاہم وہ چیز کہاں تھی جس کی ڈھونڈھ میں نکلا تھا؟ یعنی دل کا اطمینان؟ وہ تو اب اور زیادہ دور ہو گئی تھی. میرے اضطراب کی اندھیاری میں تسلی کی ایک ہلکی کرن بھی دکھائی نہیں دیتی تھی!

14 برس سے لے کر 22 برس کی عمر تک میرا یہی حال رہا. میرا ظاہری روپ ایک ایسے مذہبی آدمی کا تھا جو مذہب کو عقل و علم کے ساتھ ساتھ چلاتا ہے. لیکن میرے اندر اعتقاد میں قطعی الحاد تھا اور عمل میں قطعی فسق۔

یہی منزل میری آخری مایوسی کی منزل تھی، اور اسی کے بعد اچانک امید کی روشنی میرے سامنے چمکی. میں جس طرح اس ہاتھ کو نہیں بتلا سکتا، جس نے مجھے اندھیری میں ڈھکیلا، اسی طرح میں اس ہاتھ کے لیے بھی کچھ نہیں کہہ سکتا، جس نے اچانک مجھے اجالے میں پہنچا دیا،

تاہم یہ حقیقت ہے کہ روشنی نمودار ہوئی اور نو برس خاک چھاننے کے بعد میں نے اپنی منزلِ مقصود خود اپنے ہی پاس موجود پائی. تمام شکوک دور ہو گئے. تمام دھوکے مٹ گئے جس یقین اور اطمینان کی تلاش تھی، وہ مجھے حاصل ہو گیا۔

اب مجھے معلوم ہوا کہ مذہب اور عقل کے میدان بالکل الگ الگ ہیں، اور دونوں کی ایسی پوزیشن نہیں ہے کہ ان کو باہم مخالف سمجھ کر توڑنے یا جوڑنے کی کوشش کی جائے. مادہ اور محسوسات کی راہ ہم ادراک سے طے کر سکتے ہیں، مگر مذہب جس حکم کا پیام لاتا ہے، اس کے لیے ہمارے پاس صرف جذبہ ہے، اور یہ بڑی بھول ہے کہ چاندی سونا تولنے کے کانٹے سے ہوا اور روشنی کا بھی وزن معلوم کرنا چاہیں. مجھے معلوم ہوا کہ جس مذہب کو دنیا اسلام کے نام سے پہچانتی ہے، فی الحقیقت وہی مذہبی اختلافات کے سوال کا اصلی جواب ہے۔ اسلام دنیا میں کوئی نیا مذہب قائم نہیں کرتا چاہتا، بلکہ اس کا مشن خود اس کے بیان کے مطابق صرف یہ ہے کہ دنیا میں تمام مذہبوں کے ماننے والے اپنی اصلی اور بے میل سچائی پر قائم ہو جائیں، اور باہر سے ملائی ہوئی جھوٹی باتوں کو چھوڑ دیں. اگر وہ ایسا کریں، تو جو اعتقاد ان کے پاس ہو گا، اس کا نام قرآن کی بولی میں اسلام ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ خدا کی سچائی ایک ہے ابتدا سے موجود ہے، اور تمام انسانوں اور قوموں کے لیے یکساں طور پر آتی رہی ہے. دنیا کا کوئی ملک، کوئی گوشہ نہیں، جہاں خدا کے سچے بندے نہ پیدا ہوئے ہوں اور انھوں نے سچائی کی تعلیم نہ دی ہو، لیکن ہمیشہ ایسا ہوا کہ لوگ کچھ دنوں تک اس پر قائم رہے، پھر اپنے خیال اور وہم سے طرح طرح کی نئی اور جھوٹی باتیں نکال کر اس طرح پھیلا دیں کہ وہ خدا کی سچائی انسانی ملاوٹ کے اندر گم ہو گئی۔ اب ضرورت تھی کہ سب کو جگانے کے لئے ایک عالمگیر صدا بلند کی جائے۔۔ یہ اسلام ہے وہ عیسائی سے کہتا ہے کہ سچا عیسائی بنے۔ یہودی سے کہتا ہے کہ سچا یہودی بنے، پارسی سے کہتا ہے کہ سچا پارسی بنے۔۔ اسی طرح ہندوؤں سے کہتا ہے کہ اپنی اصلی سچائی کو دوبارہ قائم کر لیں. یہ سب اگر ایسا کر لیں، تو وہ وہی ایک ہو سچائی ہو گی جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ سب کو دی گئی ہے. کوئی قوم نہیں کہہ سکتی کہ وہ صرف اسی کی میراث ہے. اسی کا نام ''اسلام'' ہے اور وہی ''دین الفطرۃ'' ہے، یعنی خدا کا بنایا ہوا نیچر، اسی پر یہ تمام کارخانۂ ہستی چل رہا ہے. سورج کا بھی وہی دھرم ہے. زمین بھی اسی کو مانے ہوئے ہر آن گھوم رہی ہے، اور کون کہہ سکتا ہے کہ ایسی ہی اور کتنی زمینیں اور دنیائیں ہیں، اور ایک خدا کے ٹھرائے ہوئے ایک ہی قانون پر عمل کر رہی ہیں۔۔!!

پس قرآن لوگوں کو ان کے مذہب سے چھڑانا نہیں چاہتا، بلکہ ان کے اصلی مذہب پر ان کو دوبارہ قائم کر دینا چاہتا ہے۔ دنیا میں بے شمار مذہب ہیں۔ ہر مذہب کا پیرو سمجھتا ہے کہ سچائی صرف اسی کے حصے میں آئی ہے، اور باقی سب باطل پر ہیں، گویا قوم اور نسل کی طرح سچائی کی بھی میراث ہے اب اگر فیصلہ ہو تو کیونکر ہو۔۔؟؟ اختلاف دور ہو تو کس طرح ہو؟ اس کی صرف تین ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔

ایک یہ کہ سب حق پر ہیں، یہ ہو نہیں سکتا. دوسری یہ کہ سب باطل پر ہیں. اس سے بھی فیصلہ نہیں ہوتا. کیونکہ پھر حق کہاں ہے؟ اور سب کا دعوٰی کیوں ہے؟ اب تیسری ایک صورت رہ گئی، یعنی سب حق پر بھی ہیں اور سب ناحق پر بھی. یعنی اصل ایک ہے اور سب کے پاس ہے. ملاوٹ باطل ہے. موجب اختلاف ہے، اور سب اسی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اگر ملاوٹ چھوڑ دیں اور اصلیت کو پرکھ کے صاف کر لیں، تو وہ ایک ہی ہو گی اور سب کی جھولی میں نکلے گی۔!

قرآن'' یہی کہتا ہے، اور اس کی بولی میں اسی مشترک اور عالمگیر اصلیت کا نام اسلام ہے.

شک اور انکار کے بعد یقین اور اعتقاد کے حصول میں میرے نظر و فکر کا کیا عالم رہا اور میرے تمام لاینحل (ناقابل حل) سوالوں کے کیا کیا جواب ملے؟ یہ بہت لمبی داستان ہے اور میری موجودہ تصنیفات انہیں کی شرح ہیں''

حوالہ کتاب 'ذکر آزاد از عبدالرزاق ملیح آبادی'، کمپوزنگ سالم فریادی

علمی گمراہی کا سفر

یہ کوئی طے شدہ ضابطہ تو نہیں ہے مگر موجودہ دنیا میں اکثر ایک مسلمان کی علمی گمراہی کا سفر ان مراحل سے ہو کر گزرتا ہے.

☆منطق، فلسفے اور سائنس سے شدید ترین مرعوبیت

اس پہلے مرحلے پر وہ مذہب بیزار مغربی اقوام کی مادی ترقی سے آخری درجے میں مرعوب ہونے لگتا ہے. وہ اس ترقی کے پیچھے مختلف فلسفوں، منطق اور سائنس کو کھڑا پاتا ہے. مغربی اقوام سے اس کے لگاؤ کا یہ حال ہوتا ہے کہ ان کا برا بھی اسے اچھا لگنے لگتا ہے. امور غیب جیسے ملائکہ، حیات بعد الموت وغیرہ کو بھی یہ سائنس کی لیبارٹری میں لے آنے کے متمنی ہو جاتے ہیں. انہیں ہر شے کے لئے اب فقط دلیل نہیں بلکہ 'امپیریکل ایویڈینس' درکار ہوتا ہے. گویا یہ سمجھ کر نہیں بلکہ دیکھ کر ایمان لانا چاہتے ہیں. انہیں 'ریشنلسٹ' کہا جاتا ہے.

☆مذہبی طبقے سے نفرت

اس کی نظر موجودہ عالم اسلام کی علمی پستی اور معاشی بدحالی کی جانب جاتی ہے تو اسے اس کے بڑے ذمہ دار مذہبی ٹھیکے دار محسوس ہوتے ہیں. لہذا اسے مولوی حضرات سے بناء تفریق نفرت ہونے لگتی ہے. وہ انہیں ہر اس معاشرتی، سماجی یا معاشی مسائل کا بھی مجرم گردانے لگتا ہے جن سے ان کا دور کا بھی کوئی تعلق نہ ہو. انہیں ہر اس شخص سے الجھن ہونے لگتی ہے جس کی شرعی داڑھی ہو یا جو مسواک کرتا ہو یا ٹوپی پہنتا ہو. انہیں 'ناراض باغی طبقہ' یا پھر 'نیو لیفٹسٹ' بھی کہہ سکتے ہیں. احادیث کا انکار اس میں شک نہیں ہیں کہ اسلامی تاریخ اور احادیث کے ذخیرے میں بہت سی ایسی مثالیں موجود ہیں جو ایک انسان کو چکرا دیتی ہیں. مگر مسلمانوں نے ہمیشہ احادیث کے ذخیرے کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے اور ان کا انکار یا اقرار بعد از تحقیق اپنایا ہے. یہ شخص تحقیقی معیارات کو اپنانے کی بجائے مختلف احادیث (اخبار احاد) کا

انکار اپنی ناقص سمجھ یا عقل کی بنیاد پر کرنے لگتا ہے. گویا ایسا نہیں ہے کہ وہ قطعی ثبوت کی بنیاد پر کسی ظنی حدیث کو ماننے سے انکار کر رہا ہو بلکہ اس کے قبول ورد کا واحد معیار اسکی محدود عقل یا سمجھ ہوتی ہے. انہیں غلط طور پر لبرل کہا جاتا ہے. ہمارے نزدیک اگر انہیں نام دینا ہی ہے تو 'نیو لبرل' کہہ لیجیئے.

☆قران حکیم کی من مانی تفسیر

اس مقام پر ایک شخص قران حکیم میں درج آیات کی من مانی تفسیر کرنے لگتا ہے. ایسی تفسیر جو اس کے حساب سے موجودہ سائنس، فلسفے اور منطق سے مطابقت رکھتی ہو. گویا وہ قرآن حکیم کے اپنے پیغام کو سمجھنے کی بجائے، اس میں سے اپنے من پسند فلسفے برآمد کرنے میں جت جاتا ہے. اس مقام پر وہ مسلمانوں کی پوری تاریخ اور علمی ورثے کو ایک سازش سمجھتا ہے. لہذا نہ تواتر کی پرواہ کرتا ہے اور نہ ہی اجماع کا خیال کرتا ہے بلکہ لغت سے کھیل کر قرانی الفاظ کو وہ وہ معنی فراہم کرتا ہے کہ انسان دنگ رہ جائے. دوسرے الفاظ میں وہ پہلے اپنی ناقص عقل سے قران کی ایک غلط تفسیر کرتا ہے اور پھر اسی غلط تفسیر کو قران کا اصل مقصود سمجھنے کی غلط فہمی پال لیتا ہے. اس سمجھ کی راہ میں کوئی قوی سے قوی حدیث بھی آجائے تو اسے یکسر مسترد کر دیتا ہے اور اگر کوئی آیت رکاوٹ بنے تو اسے اصطلاحی مفہوم دے دیتا ہے. انہیں 'منکرین حدیث' کہا جاتا ہے. گو یہ اکثر خود کو 'قرانسٹ' کہلانا پسند کرتے ہیں.

☆مذہب کا انکار

یہ طبقہ مذہب سے اس درجے بدظن ہو چکا ہوتا ہے کہ اسے تمام مذاہب جعلی محسوس ہوتے ہیں. یہ خدا کے وجود کو تسلیم کرتا ہے، اسے خالق مانتا ہے، حیات بعد الموت تک کو تسلیم کرتا ہے مگر کسی بھی قسم کی شریعت کا منکر ہو جاتا ہے. اس کے نزدیک مذاہب لوگوں کے اپنے بنائے ہوئے ہیں جنہوں نے انسانیت کو فساد اور خون خرابے کے سوا کچھ نہیں دیا ہے. یہ خدا تک پہنچنے کے اپنے طریق بناتے ہیں جس کے لئے مختلف مراقبے اور طریقے اختیار کرتے ہیں. یہ مغرب اور ہند میں یکساں مقبولیت حاصل کر رہے ہیں. لفظ خدا کا استعمال یہ کم ہی کرتے ہیں. اسکی جگہ یہ ایسی اصطلاحات خدا کیلئے استعمال کرتے ہیں جو جدید ذہن کیلئے زیادہ قابل قبول ہیں جیسے 'سپریم کانشیسس نیس' یا 'کاسمک انٹلیجینس' وغیرہ. اوشو سے لے کر سدھ گرو تک یہی سلسلہ چل رہا ہے. انہیں 'اسپریچولسٹ' کہا جاتا ہے.

☆ خالق کا اقرار مگر رب کا انکار یہ افراد اس حقیقت کو تو تسلیم کرتے ہیں کہ اس کائنات کو لازمی بنانے والی ایک ذات موجود ہے. وہی ذات ہر شے کی خالق ہے مگر اس کائنات کو تخلیق کرنے کے بعد وہ ہم سے لاتعلق ہو گئی ہے. جس طرح ایک گھڑی ساز کوئی زبردست گھڑی

تخلیق کرتا ہے، اس میں بہترین مشینری لگاتا ہے مگر پھر اسے چھوڑ دیتا ہے. جب تک مشینری چلتی رہتی ہے، گھڑی بھی چلتی رہتی ہے. جس دب اس کی مشینری میں ٹوٹ پھوٹ ہونے لگتی ہے اسی دن گھڑی بھی ختم ہو جاتی ہے. ٹھیک اسی طرح شائد خالق نے اس کائنات کو تخلیق کر کے اس میں بہترین نظم تو رکھ دیا مگر اسکے بعد وہ اس سے لاتعلق ہو گیا. اب جب تک یہ ستاروں سیاروں کا نظم خود بخود چل رہا ہے تب تک کائنات قائم ہے. ایک دن یہ نظم خود ہی تباہ ہو جائے گا اور ہم سب مٹ جائیں گے. نہ کوئی دوسری زندگی ہو گی اور نہ ہی کسی کے سامنے جواب دہی. یہ آسان الفاظ میں روز جزاء کے منکر ہیں اور انہیں اس طرح کے مفروضات بہت بھاتے ہیں کہ کسی خلائی مخلوق نے ہزاروں سال پہلے زمین پر آکر کلوننگ کے ذریعے ہماری نسل کو بنا دیا. ان افراد کو انگریزی زبان میں 'ڈیسٹ' کہا جاتا ہے.

☆ہم نہیں جانتے

یہ افراد کہتے ہیں کہ خدا کے وجود اور خدا کے انکار دونوں کیلئے آج تک جو استدلال اور شہادتیں ہم تک پہنچی ہیں. وہ اس امر کیلئے ناکافی ہیں کہ ہم خدا کے وجود کو حتمی طور پر تسلیم کر سکیں یا پھر حتمی طور پر اس کا انکار کر سکیں. لہٰذا یہ اس بحث میں ہی نہیں پڑنا چاہتے کہ کائنات کو بنانے والا کوئی خدا ہے یا اسکی کوئی اور سائنسی توجیح ممکن ہے؟ ایسے احباب کو ہم 'ایگنوسٹک' کے نام سے موسوم کرتے ہیں. ایک سچا ایگنوسٹک پیغام اور دلیل کو لپک کر قبول کرتا ہے. افسوس کے ایسے ایگنوسٹک تعداد میں کم ہیں. اکثر ہمیشہ ایگنوسٹک ہی بنے رہنا چاہتے ہیں، چاہے ان پر بات کتنی ہی واضح کیوں نہ ہو جائے.

☆خدا کا انکار

یہ وہ افراد ہیں جو کسی بھی خالق کے وجود کا انکار کرتے ہیں. یہ دراصل اپنی حقیقت میں ایگنوسٹک ہی ہوتے ہیں مگر مذہب دشمنی یا مذہب کے نام پر کی گئی خونریزی و زیادتی سے اتنے زیادہ نالاں ہوتے ہیں کہ خدا کے ہونے کا کوئی بھی امکان ماننے سے انکار کر دیتے ہیں. ان کا ایک طبقہ خاموش رہتا ہے مگر ایک بڑا طبقہ خدا کے انکار تک محدود نہیں ہے بلکہ تصور خدا سے دشمنی پر اتر آیا ہے. انہیں 'ایتھیسٹ' یعنی ملحد کہا جاتا ہے.

☆خلاصہ

جیسا کے ابتداء میں ہم نے عرض کیا کہ بیان کردہ مراحل کوئی حتمی ضابطہ یا اصول یا فارمولا نہیں ہیں. آپ ان مراحل کو ان بڑے فلسفوں کا ایک مختصر جائزہ کہہ سکتے ہیں جن سے آج کا ایک مسلم ذہن گزرتا ہے یا گزر سکتا ہے. گمراہی کا یہ سفر موجودہ دنیا میں اس قدر مزین

کر کے پیش کیا جارہا ہے کہ مسافر اسے گمراہی نہیں بلکہ شعوری ارتقاء سمجھ بیٹھتا ہے. اچھی بات یہ ہے کہ یہ سفر صرف اپر سے نیچے نہیں آتا بلکہ نیچے سے اپر بھی جاتا ہے. یعنی بیان کردہ مراحل کی ترتیب کو اگر الٹ دیں تو ایسے بیشمار انسان موجود ہیں جو الحاد کی دلدل سے نکل کر خدا کی بھرپور معرفت کا سفر کرتے ہیں. یہی وجہ ہے کہ دعوت دین کیلئے انتہائی نامساعد حالات کے باوجود امریکہ ہو، کوئی بھی یورپی ملک ہو یا پھر کوئی افریقی ریاست. ہر جگہ اسلام سب سے زیادہ قبول کیا جانے والا مذہب ہے.

تحریر عظیم الرحمان عثمانی

الحادی فتنوں سے بچاؤ کیسے۔۔؟

تمام مذاہب کو اس وقت فکری محاذ پر سب سے بڑا چیلنج لامذہبیت کا درپیش ہے۔پرنٹ، الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کے ذریعے ایک منظم انداز میں مذاہب کے خلاف شکوک و شبہات کی یلغار کی گئی ہے۔ ملحدین وجود باری تعالیٰ، تصور رسالت، عقیدۂ آخرت، کتاب اللہ اور انبیائے کرام علیہم السلام کی تاریخی حیثیت کو جھٹلاتے اور طرح طرح کے سوالات کے ذریعہ ذہنوں کو پراگندہ کرنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ جو مذاہب ان عقائد و مسائل میں پہلے ہی تضاد کا شکار اور کمزور بنیادوں پر کھڑے تھے، وہ ان کے فلسفیانہ وساوس کی یلغار کے سامنے زیادہ دیر نہ ٹھہر سکے اور الحاد ان کے معاشروں میں بہت آسانی سے جڑ پکڑتا چلا گیا۔ یہودیت، عیسائیت، ہندومت کا دہریت کے سامنے اتنی آسانی سے سجدہ ریز ہو جانا دہریوں کو اعتماد بھی دلا گیا، وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ شاید تمام مذاہب ہی ایسے خود ساختہ اور متضاد نظریات کی بنیاد پر کھڑے اور مکر و فریب کے ذریعے پیروکار جمع کیے ہوئے ہیں، لیکن الحادی نظریات کو مسلم معاشروں میں سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا اور پڑ رہا ہے۔

ملحدین کے لیے قرآن اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخی حیثیت کو چیلنج کرنا علمی، عقلی اور تاریخی طور پر ممکن نہیں تھا۔ باقی عقائد توحید، آخرت وغیرہ کا تعلق مابعد الطبیعات سے ہے جنہیں مشاہداتی اور تجرباتی علم کی روشنی میں مکمل طور پر ثابت یا رد نہیں کیا جا سکتا، اور اسلام ان مسائل میں دوسرے مذاہب کی نسبت بہت واضح اور محکم دلائل و براہین بھی رکھتا ہے، اس لیے انہوں نے اسلام پر حملہ کرنے کی دوسری راہ نکالی مثلاً کمزور اور من گھڑت روایات کا سہارا لے کر اکابرین اسلام کی کردار کشی، اسلام کا تمسخر، اسلامی سزاؤں کے خلاف پراپیگنڈہ، عقائد میں فلسفیانہ انداز میں شکوک و شبہات پیدا کرنا، مسلمانوں کے اختلافات کو ہوا دینا، مسلمان علماء کی کردار کشی کرنا وغیرہ۔ یہ ہر ملحد کے خاص موضوعات ہیں۔ یہ اسلام اور مسلمانوں کی بدنامی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور ان کی دل آزاری کے لیے انتہائی گری ہوئی حرکات کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔ پرنٹ میڈیا میں یہ تجزیہ نگاروں، کالم نگاروں، صحافیوں اور شاعروں کی شکل میں موجود ہیں جو مسلمانوں کو مختلف طریقوں سے اسلام کے متعلق شکوک و شبہات میں ڈالتے، زہریلے مضامین، جھوٹی کہانیاں پیش کرتے اور معمولی قصے کو بڑھا چڑھا کر مذہبی منافرت پھیلاتے ہیں، سوشل میڈیا دیکھیں تو اسلام کے خلاف ایک پورا محاذ نظر آتا ہے۔ مختلف پیجز اور عجیب و غریب ناموں کی فیک آئی ڈیز سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جھوٹا پراپیگنڈہ، فریبی اور گمراہ کن تحاریر اور ان سے بھی بڑھ کر گستاخانہ جملے، تصاویر تقریباً روز دیکھنے کو ملتی ہیں۔

گزشتہ دو سال سے میری دلچسپی کا محور یہی لوگ رہے ہیں۔ سوشل میڈیا پر ان کے پیجز لائک کیے، ان کے گروپس میں شمولیت اختیار کی، ان سے دوستیاں لگا کے ان کے رویوں، نفسیات کا مطالعہ کیا۔ الحاد کے فروغ کے لیے کام کرنے والوں میں سیکولر، لبرل فاسشٹ، عیسائی، قادیانی لوگوں کے علاوہ کچھ ایسے مسلم جوان بھی نظر آئے جو اپنے دینی عقائد و نظریات کے علمی دلائل سے ناواقفیت اور ان کے خلاف جھوٹے پراپیگنڈے کی وجہ سے دین سے بد ظن اور بے زار ہوئے یا سہل پسندی اور عیاشی کے حصول میں دین سے دور نکلتے چلے گئے اور چند ایسے بھی دیکھے جو تعلیم یافتہ اور منصف مزاج ہیں اور جن شکوک و شبہات کا وہ شکار ہیں، ان موضوعات پر غیر جانبداری سے لکھنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کا انداز بھی باقیوں سے کافی بہتر اور علمی ہے۔ مجھے دینی راستے سے ان کے بھٹک جانے کی جو سب سے بڑی وجہ یا وہ کمی جس کی وجہ سے یہ مطالعہ اور تحقیق کے باوجود حق تک نہیں پہنچ سکے یا کنفیوژن کا شکار ہوئے، نظر آئی، وہ ایک صالح، علم و عمل والے شخص کی صحبت، ایک امین ناصح کے مشورے اور راہنمائی کا نہ ہونا تھی۔ بہت سے ایسے ہیں جنہوں نے سینکڑوں بڑی اچھی اور تحقیقی کتابوں کا مطالعہ کیا، لیکن ہدایت نہیں پاسکے بلکہ الٹا مزید گمراہ ہوتے چلے گئے۔ ایک ایسے ماحول میں جہاں ایک طرف الحاد کی محنتیں عروج پر ہوں اور جدید سیکولر تہذیب کی چمک دھمک آنکھیں خیرہ کر رہی ہو اور دوسری طرف خود مذہب کا یہ حال ہو کہ کئی قسم کے مسالک و مکاتب فکر پیدا ہو گئے ہوں، بھانت بھانت کی بولیاں بولی جا رہی ہوں اور کتابیں تصنیف کی جا رہی ہوں، اس افراتفری کے ماحول میں اپنی مرضی سے چند اچھے برے رائٹرز کی اہم دینی موضوعات پر کتابیں منتخب کر کے ان کا مطالعہ شروع کر دینا، ہر گری پڑی کتاب کو پڑھ لینا، کتاب کا محض ٹائٹل اور پرنٹنگ خوبصورت دیکھ کر اسے پڑھنے بیٹھ جانا، نہ کتاب کے انتخاب میں کسی مربی اصلاح، اچھے علم والے سے مشورہ کرنا اور نہ شکوک و شبہات پیدا ہونے کی صورت میں کسی مصلح کی رہنمائی کی سعی کرنا، ایسی خشکی اور بوریت ہی پیدا کر سکتا ہے جو مذہب سے ہی بد دل یا بے زار کر دے۔

یہ بے لگام مطالعہ کی عادت ہمارے معاشرے میں بہت عام ہے حالانکہ غور کیا جائے تو یہی فتنوں کی اصل جڑ ہے۔ ایک بزرگ عالم لکھتے ہیں ''جتنے گمراہ فرقے پیدا ہوئے، ان کے بانی سب اہل علم ہیں، لیکن سب کے سب بغیر استاد اور رہبر والے، پس شروع شروع میں تو ٹھیک چلتے ہیں، لیکن جب موڑ یا چوراہا آتا ہے، وہیں بھٹک جاتے ہیں اور عجب و کبر میں مبتلا ہو کر کسی کی سنتے بھی نہیں ہیں۔'' (مجالس ابرار ج: ۱، ص: ۴۷) ایک اور جگہ لکھتے ہیں ''ہر فتنے کے بانی پر غور کیجیے تو یہی معلوم ہو گا کہ یہ کسی بڑے کے زیر تربیت نہیں رہا ہے۔ جب آدمی بے لگام ہوتا ہے اور کوئی اس کا مربی اور بڑا نہیں ہوتا تو بگاڑ شروع ہو جاتا ہے اور وہ جاہ اور مال کے فتنے میں مبتلا ہو جاتا ہے۔'' (مجالس ابرار ج: ۲، ص: ۲۵)

مولانا عبدالماجد دریابادی رحمہ اللہ کی مثال سب کے سامنے ہے۔ مولانا ایک ایسی نابغہ روزگار شخصیت کے مالک جنھوں نے جس موضوع پر قلم اُٹھایا حق ادا کر دیا، ایک جید عالم دین، بے مثل ادیب، مرثیہ نگار، آب بیتی نگار، عظیم کالم نویس، صحافی اور مفسر قرآن تھے۔ کالج کے زمانے میں اسی آزاد اور بے لگام مطالعہ کی عادت میں کسی لائبریری میں موجود مستشرقین کی چند مشہور کتابیں پڑھ بیٹھے، پھر ایسے ملحد بنے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بھی گستاخیاں کرتے رہے، قابل گردن زنی قرار پائے، سالوں مذہب کے خلاف لکھا اور کھل کر لکھا۔ پھر علامہ شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی جیسے علم و عمل والے دوستوں کی صحبت اور کتابوں سے روشنی ملنی شروع ہوئی۔ اسلامی تصوف کی طرف آئے مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ سے اصلاحی تعلق شروع ہوا شروع ہوا، مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ نوٹ فرمائیں کہ ایک جید عالم کو اپنی روحانی اصلاح کے لیے مستقل بیعت ہونا پڑا، عوام کو اس کی کتنی ضرورت ہو گی، پھر یہ تو آج سے ستر اسی سال پہلے کی مثال ہے۔ اب تو حالات مزید بد تر ہو چکے ہیں۔ اس دور میں اتنی آزاد خیالی اور فتنے نہیں تھے، مطالعہ اور دینی تعلیم و تربیت کا رواج تھا جبکہ آج کے دور میں نہ دینی تربیت کا کوئی نظام ہے اور نہ مطالعے کا کوئی رجحان، لوگ علمی لحاظ سے بالکل کورے اور کھوکھلے ہیں، دوسری طرف کتابوں اور میڈیا کے ذریعے ایسے فتنے سامنے آ رہے ہیں جو علماء کو بھی پریشان کر دیں، ایسے ماحول میں تو عوام کو خصوصی طور پر پڑھنے، سننے میں بہت احتیاط اور بڑوں سے مشورے کی ضرورت تھی، لیکن افسوس پہلے سے بھی زیادہ بے احتیاطی کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے۔ ایک عالم شیخ جمال زرابوزو لکھتے ہیں کہ ”آج کے دور میں بہت سے مسلمان ایسے ہیں جنھوں نے مغرب میں پرورش پائی یا پھر اپنی تعلیم مغرب سے حاصل کی۔ یہ لوگ جو لٹریچر پڑھتے ہیں وہ زیادہ تر غیر مسلم مصنفین کا ہوتا ہے۔ اس لٹریچر میں بہت سے ایسے افکار بیان کیے جاتے ہیں جو بظاہر تو بہت مفید، بے ضرر اور اسلامی تعلیمات کے عین مطابق نہ سہی تو اسلامی اصولوں سے زیادہ دور بھی نظر نہیں آتے۔ لیکن اگر ان افکار کا بغور جائزہ لیا جائے اور ان کے پسِ پشت فلسفہ کو سمجھا جائے تو کسی بھی سلیم فطرت انسان پر یہ بات واضح ہو جائے کہ ان کا اسلامی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں بلکہ بسا اوقات یہ آپ کو گمراہی اور الحاد کی طرف لے جاتے ہیں۔“

اس دور میں علم و عمل والوں کی صحبت کی اہمیت اور ضرورت پہلے سے زیادہ ہے لیکن بہت سے لوگوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ انہیں بیعت، اصلاح، تصوف کے الفاظ سے ہی سخت چڑ ہے، وہ صوفیاء کی کرامات، شطحیات، جعلی صوفیاء کے واقعات اور تصوف کی مخصوص اصطلاحات کو اپنی مرضی کے مطالب اور معانی کے ساتھ پیش کر کے تصوف کا رد کرتے نظر آتے ہیں۔ ہم مانتے ہیں کہ اسلامی تصوف میں غیر اسلامی عقائد و نظریات کی آمیزش ہوئی اور جعلی خانقاہوں اور پیروں کی آمد سے بہت نقصان ہوا، بہت سی خانقاہیں جہاں مسلمانوں کو ایزد پرستی کا

درس دیا جاتا تھا، ان کی روحانی اصلاح ہوتی تھی، آج شخصیت پرستی بلکہ قبر پرستی کا مرکز بنی ہوئی ہیں اور جہاں ہر طرف اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے جلوے نظر آتے تھے، آج وہ خانقاہیں قوالی کی محفلوں میں تبدیل ہو گئی ہیں بلکہ شرک و بدعت کا مرکز بن گئی ہیں، شاید اقبال نے بھی اسی حالت کو دیکھ کر فرمایا تھا۔

یہ معاملے ہیں نازک جو تری رضا ہو تو کر کہ مجھے تو خوش نہ آیا یہ طریق خانقاہی

لیکن دوسری طرف ہمیں یہی اقبال مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا روم کے متعقد بھی نظر آتے ہیں اور ان کی شاعری میں بھی تصوفانہ رنگ نظر آتا ہے۔ اصل میں ضرورت افراط و تفریط سے بچنے کی ہے۔ ہمارے خیال میں اسلامی تصوف کو گمراہی سمجھنے والے بھی اصلاح کے معاملے پر متفق ہیں صرف انہیں مروجہ تصوف پر اعتراض ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا جعلی ڈاکٹروں کی وجہ سے کسی نے ڈاکٹروں کے پاس جانا اور علاج کروانا چھوڑا؟ جس طرح روحانی علاج کے شعبے میں ہزاروں جعلی ڈاکٹر موجود ہیں، اسی طرح جسمانی علاج کے شعبے میں بھی ہیں، جنہیں علاج یا اصلاح کی طلب ہوتی ہے، انہیں کوئی مسئلہ نہیں ہوتا، وہ اپنا معالج ڈھونڈ ہی لیتے ہیں۔ مزید جب دین کے کسی دوسرے شعبہ پر غلط لوگوں کے قبضے اور کمیوں کوتاہیوں کی وجہ سے اس شعبے کو نہیں چھوڑا جا سکتا، تزکیہ و احسان یا تصوف و سلوک تو دین اسلام کی روح اور جان ہے، اس کو کیسے چھوڑا جا سکتا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ تو اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ ایک ایسا رکن ہے جس کی تکمیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد میں شامل تھی، اس کا انکار کیسے کیا جا سکتا ہے؟ اس گئے گزرے دور میں بھی ایسی خانقاہیں اور مراکز موجود ہیں جہاں اہل علم و عمل بالکل اسلامی طریقہ پر لوگوں کی اصلاح فرما رہے ہیں۔ یہ اللہ کی سنت بھی ہے کہ جب بھی کوئی کتاب بھیجی ساتھ ایک رسول لازمی بھیجا جو لوگوں کو اس کی تعلیم دیتا اور ان کا تزکیہ کرتا۔ اسی طرح لوگ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہے تو صحابہ بن گئے اور جو صحابہ کی صحبت میں رہے تابعین بن گئے، تابعین کی صحبت میں رہے تو تبع تابعین بن گئے، یہ سلسلہ علم و دین ابھی تک چل رہا ہے۔ مولانا تھانوی رحمہ اللہ کی کتاب سے ایک اقتباس پیش کر کے بات ختم کرتا ہوں۔ لکھتے ہیں:

"ہر شبہ کا جواب دینے سے شبہات رفع نہیں ہو سکتے، تم منشاء کا علاج کرو، جیسے ایک گھر کے اندر رات کو اندھیرے میں چوہے، چھچھوندر کودتے پھرتے تھے، گھر والا ایک ایک کو پکڑ کر نکالتا مگر پھر وہ سب کے سب دوبارہ اندر آ جاتے۔ ایک عاقل نے کہا کہ میاں! یہ سب اندھیرے کی وجہ سے کودتے پھرتے ہیں، تم لیمپ روشن کر دو، یہ سب خود ہی بھاگ جائیں گے، چنانچہ لیمپ روشن کیا گیا تو وہ سب اپنے اپنے بلوں میں گھس گئے۔ اسی طرح یہاں بھی سمجھو کہ یہ وساوس و شبہات جو آپ کو پیش آتے ہیں، ان کا منشاء ظلمت قلب ہے، جس کا

علاج یہ ہے کہ قلب میں نور پیدا کر لو۔ وہ نور نور محبت ہے۔ یہ محبت و عشق وہ چیز ہے کہ جب یہ دل میں گھس جاتی ہے تو پھر محبوب کے کسی حکم اور کسی قول و فعل میں کوئی شبہ وسوسہ نہیں پیدا ہوتا۔ اگر ایک فلسفی پروفیسر کسی عورت پر عاشق ہو جائے اور وہ عورت اس سے یوں کہے کہ سر بازار کپڑے اتار کر آئو تو میں تم سے بات کروں گی، ورنہ نہیں! تو فلسفی صاحب اس کے لیے بھی تیار ہو جائیں اور یہ بھی نہ پوچھیں گے کہ بی بی! اس میں تیری مصلحت کیا ہے؟ اب کوئی اس سے پوچھے کہ آپ کی وہ عقل اور فلسفیت اس عورت کے سامنے کہاں چلی گئی؟ عشق مولی کے کم از لیلی بود گوئے گشتن بہر او اولی بود میں نہایت پختگی سے دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ جن مسلمانوں کو آج کل مذہب میں شکوک و اوہام پیدا ہوتے ہیں، ان کے اس مرض کا منشاء قلت محبت مع اللہ ہے، ان کو اللہ و رسول کے ساتھ محبت نہیں اور محض برائے نام تعلق کو تعلق کہا جاتا ہے۔ تعلق مع اللہ کے حاصل ہونے کا واحد طریق صرف یہ ہے کہ اہل اللہ کی صحبت حاصل کی جائے، اہل محبت کی صحبت میں یہ خاصیت ہے کہ اس سے بہت جلد محبت پیدا ہو جاتی ہے جیسا کہ اہل غفلت کی صحبت سے غفلت پیدا ہوتی ہے، پھر جب محبت اور تعلق مع اللہ حاصل ہو جائے گا، یہ لم و کیف باطل اور وساوس و شبہات سب جاتے رہیں گے۔" (اشرف الجواب از مولانا اشرف علی تھانوی صفحہ 561، 562)

تحریر محمد سعد

مولانادریابادی کے سفر دہریت کی داستان

پیدائش مذہبی گھرانے میں ہوئی، ماں اور بڑی بہن تہجد گزار، والد صوم صلاۃ کے پابند، دادا مفتی اور نانا ایک مشہور عالم، گھر میں دینی تربیت کا ماحول تھا اس کے علاوہ ایک مولوی صاحب بھی پڑھانے آتے، بارہ تیرہ سال کی عمر میں تو گویا پورے ملا بن گئے تھے، نویں جماعت میں تھے قرآن کے موضوع پر ایک مضمون تیار کر کے صوبے کے سب سے بڑے اخبار ''اودھ اخبار'' میں بھیج دیا۔ مضمون پرچہ کی زینت بنا اور یہاں سے ان کی ادبی زندگی کا آغاز ہو گیا۔ کالج کے لئے انہیں کیننگ کالج لکھنؤ میں داخل کرایا گیا۔ اختیاری مضامین کے طور پر منطق، تاریخ اور عربی لئے۔ یہ وہ مضامین تھے جن میں ان کی اہلیت کالج کے معیار سے کہیں زیادہ تھی۔ انگریزی لازمی مضمون تھا لیکن اس مضمون میں بھی کوئی پریشانی نہ ہوئی ایک تو اس سے طبعی مناسبت تھی دوسرا انگریزی اخبار و جرائد مطالعے میں بھی رہا کرتے تھے۔

ایک روز شام کی سیر کے دوران نگاہ ''رفاہ عام لائبریری'' پر پڑی، قدم لائبریری کی جانب اٹھ گئے۔ اندر کتابوں کا بازار نظر آیا، ایک کتاب نکلوائی اور پڑھنے بیٹھ گئے، اس دن کے بعد جب بھی سیر کو نکلتے تو یہیں کتابوں کی سیر کرتے رہتے۔ مطالعہ کی کثرت نے ان کے اندر کے ادیب کو بیدار کرنا شروع کر دیا تھا۔ کالج کے ابتدائی سال تھے عمر ناپختہ تھی مگر کتابوں کے شغف نے اتنی معلومات فراہم کر دی تھی کہ تصنیف و تالیف کی جانب مائل ہو گئے۔'' محمود غزنوی'' پر مفصل مقالہ لکھ ڈالا، اس مقالہ میں تاریخ یمنی سے استفادہ کرتے ہوئے یہ بتایا کہ غزنوی پر بخل کا الزام لغو ہیں یہی کام مولانا شبلی بھی انہی دنوں کر رہے تھے کہ فرزندان اسلام پر مغرب کے لگائے گئے الزامات کی تردید تاریخی حوالوں سے کر رہے تھے۔ کتاب ایک پبلشر نے شائع کر کے ان کا نام بھی مصنفوں کی فہرست میں ڈال دیا، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے تعلقات دیگر اہم ادیبوں سے بھی استوار ہوتے چلے گئے۔ ایک دن اک عزیز کے پاس ایک انگلش کتاب محض اتفاقاً دیکھنے میں آئی، ہر چیز کے پڑھنے اور پڑھ ڈالنے کا مرض تو شروع ہی سے تھا، بے تکان اس کتاب کو بھی پڑھنا شروع کر دیا، جوں جوں

آگے بڑھتے گئے، گویا اک نیا عالم عقلیات کا کھلتا گیا اور عقائد و اخلاق کی پوری پرانی دنیا جیسے زیروزبر ہوتی چلی گئی!۔۔ Element of Social Science کتاب کا نام تھا اور مصنف ڈاکٹر ڈریسیڈیل جس کے بارے میں بعد میں پتا چلا کہ یہ اپنے وقت کا ایک کٹر ملحد تھا۔ کتاب مذہب پر نہ تھی اور نہ بظاہر اسکا کوئی تعلق ابطال مذہب سے تھا، اصول معاشرت اور آداب معاشرت پر تھی، لیکن ایک بارود بچھی ہوئی سرنگ تھی۔ اس کا اصل حدف وہ اخلاقی بندشیں تھیں جنہیں مذہب اب تک علوم متعارفہ کے طور پر پکڑے ہوئے تھا اور ان پر اپنے احکام کی بنیاد رکھے ہوئے تھا۔ مثلاً عفت و عصمت، کتاب کا اصل حملہ انہی بنیادی اخلاقی عقائد پر تھا۔۔ کتاب کے مطابق یہ جنسی خواہش تو جسم کا ایک طبعی مطالبہ ہے اسے مٹاتے رہنا اور اس کے لئے باضابطہ عقد کا منتظر رہنا ایک فعل عبث ہے، بلکہ صحت اور جنسی قوتوں کی بالیدگی کے لئے سخت مضر ہے۔ اس لئے ایسی پابندیوں کو توڑ ڈالو اور مذہب و اخلاق کے گڑھے ہوئے ضابطہ زندگی کو اپنے پیروں سے روند ڈالو۔ ایسے ہی کتاب کی زد ہر ایسی قدر پر پڑتی جو مذہب اور اخلاق کو ہمیشہ عزیز رہے۔ کوئی پختہ کار مرد ہوتا تو وہ ان باتوں کو محض باتیں سمجھ کر نظر انداز کر دیتا مگر یہ سولہ سال کا نوجوان طفل نادان تھا اس سیلاب کی تاب نہ لا سکا۔ مذہب کی حمایت و نصرت میں اب تک جو قوت جمع تھی، وہ اتنی شدید بمباری کی تاب نہ لا سکی اور شک و بدگمانی کی تخم ریزی مذہب و اخلاقیات کے خلاف خاصی ہو گئی۔ یہ سوچنے لگ گئے کہ اب تک کس دھوکے میں پڑے رہے، تقلیدا ابتک جن چیزوں کو جزو ایمان بنائے ہوئے تھے وہ عقل و تنقید کی روشنی میں کیسی بودی، کمزور اور بے حقیقت نکلیں، اس کتاب میں ''ایمان'' پر براہ راست حملہ نہیں کیا گیا تھا مگر ان چیزوں کو کمزور بنا دیا گیا تھا جو ایمان کو قائم رکھتی ہیں۔ پروپیگنڈے میں یہی کوشش کی جاتی ہے کہ براہ راست حملہ نہ ہو بلکہ اطراف و جوانب سے گولہ باری کر کے قلعے کی حالت مخدوش کر دی جائے۔ عبدالماجد ابھی اس کتاب کو پڑھ کر پوری طرح گرے نہیں تھے مگر سنبھل بھی نہ سکے تھے۔

یہ ایک نیا موضوع تھا جو اب تک ان کی نظر سے نہیں گذرا تھا۔ شک و ارتیاب کی تخم ریزی ہو ہی چکی تھی اور ملحد اور نیم ملحد فلسفیوں کی انگریزی میں کمی نہیں تھی۔ لکھنؤ کی ''ورمالائبریری'' قریب ہی تھی، وہاں سے چارلس بریڈلا، بوشنر، انگرسول، ہیوم، اسپنر کی کتابیں پڑھنے کو ملتی رہیں اور تشکیک کو غذا اور الحاد کو خوب تقویت پہنچتی رہی۔ ایک ضخیم کتاب جو کئی جلدوں پر مشتمل تھی International Library of Famous Literature کے نام سے دکھائی، یہ کتاب بھی مذہبیات کی نہیں ادب محاضرہ کی تھی، ساری دنیا کے ادبیات کے بہترین انتخابات کو اس میں جمع کیا گیا تھا، اس کی ایک پوری جلد قرآن اور اسلام کے ذکر پر مشتمل تھی۔ اس میں ایک پورے صفحے کا فوٹو ''بانی اسلام'' کے نام سے شامل کیا گیا تھا اور نیچے مستند حوالہ کہ فلاں قلمی تصویر کا عکس ہے' درج کیا گیا تھا، گویا ہر طرح سے صحیح و معتبر۔ جسم پر عبا، سر پر عمامہ اور چہرہ مہرہ پر بجائے کسی قسم کی نرمی کے غصیلہ پن، تیوروں پر خشونت کے

بل پڑے ہوئے، ہاتھ میں کمان، شانہ پر ترکش، کمر میں تلوار۔۔ گویا تمام تر ایک ہیبت ناک وجلاد قسم کے بدوی سردار قبیلہ کی شبیہ۔۔ نوجوانی میں فرنگیت سے مرعوب ذہنیت اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ خود اس فوٹو میں کوئی جلعسازی بھی ہو سکتی ہے اور انکی کوئی بات غلط بھی ہو سکتی ہے۔۔ جو رہی سہی کسر تھی وہ اس تصویر نے نکال دی، ذات رسالت سے اعتقاد دیکھتے دیکھتے دل سے مٹ گیا۔ رئیسانہ ٹھاٹ کے باوجود ان کی تربیت دینی خطوط پر ہوئی تھی، آباؤاجداد سے ایک دینی روایت ساتھ چلی آرہی تھی، لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا دین کی آغوش میں پلا بڑھا یہ نوجوان پہلے، دوسرے حملے میں ہی چت ہو گیا، گمراہی کے کتنے دروازے ہیں اور شیطان کی آمد کے لئے کتنے راستے کھلے ہوئے ہیں، یہ کون جانتا ہے۔۔؟! نماز اب بھلا کہاں باقی رہ سکتی تھی، پہلے وقت سے بے وقت ہوئی، پابندی گئی، پھر ناغے اور کئی کئی ناغے ہونے لگے، یہاں تک کہ بالکل غائب ہو گئی، وضو، تلاوت، روزہ وغیرہ سے کوئی واسطہ ہی نہ رہا، شروع شروع میں کچھ خوف اور لحاظ والد کا رہا لیکن یہ کب تک کام دیتا، جو اسوقت اللہ اور اسکے رسول سے بغاوت پر آمادہ تھا وہ باپ بیچارے کو کیا خاطر میں لاتا۔

مذہبی مطالعہ اس وقت بھی کچھ ایسا کم نہ تھا لیکن فرنگی الحاد کے جس سیلاب عظیم سے ٹکراؤ تھا اس سے مقابلے کے لئے وہ مطالعہ ہر گز کافی نہ تھا، کفر کے اندھیروں میں اترنا ہی تھا کہ ایسے ہی دوستوں کی تلاش بھی شروع ہو گئی۔ کالج کے ایک ساتھی طالب علم محمد حفیظ سید سے یارانہ بڑھا۔ وہ بھی ملحد ہو چکا تھا اور ہندوانہ تصوف وفلسفے کا گرویدہ تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ عبدالماجد ملحد یا منکر اور حفیظ تین چوتھائی ہندو ۔ ملاقاتیں بڑھتی گئیں اور ملحدانہ رنگ چڑھتا گیا۔ دبے دینی کی لے بڑھ رہی تھی، عبدالماجد نے کسی کے پاس لنکن کی ریشنلسٹ پریس ایسوسی ایشن کی ارزاں قیمت مطبوعات کی فہرست دیکھی، مسلک عقلیت (ریشنلزم) کے پرچار کے نام سے یہ سب کتابیں رد مذہب و تبلیغ الحاد کے لئے تھیں، پہلے یہ کتابیں مانگ مانگ کر پڑھیں، پھر جب لت پڑ گئی اور نشہ اور تیز ہو گیا تو فیس ادا کر کے انجمن کا باضابطہ ممبر بن گئے، فخر سے اپنے آپ کو ریشنلسٹ کہتے اور اپنے اس ننے منے کتب خانے کو دیکھ کر خوش ہوتے۔ ہندوستان میں اس ایسوسی ایشن کی کوئی شاخ نہیں تھی اس کے پندرہ روزہ نقیب 'ریشنلسٹ ریویو' کو قیمت بھیج کر اسکے خریدار بن گئے۔ رفتہ رفتہ اب اسلام کے نام سے بھی شرم آنے لگی۔ اسی دوران علامہ شبلی کی کتاب ''الکلام'' منظر پر آئی، عبدالماجد نے مطالعہ کیا۔ ان کے مطابق کچھ خامیاں تھیں سو تنقید کے لئے قلم اٹھالیا۔ ایک رسالہ ''الناظر'' جو لکھنؤ سے شائع ہوا کرتا تھا اس کے ایڈیٹر ظفر الملک کو شبلی سے کد تھی، عبدالماجد کو اس سے بہتر دوسرا کوئی رسالہ دکھائی نہ دیا۔ رسالے نے بھی خوش آمدید کہا۔ عبدالماجد کا ایک طویل مقالہ چھے اقساط میں شائع ہوا۔ یہ قسطیں ایک طالب علم کے نام سے شائع کروائیں۔ (شبلی سمجھتے رہے کہ یہ کام مولوی عبدالحق کا ہے، مگر یہ راز بعد میں کھل گیا)۔ مختلف مضامین کی ترتیب و تسوید جاری رہی اور اس میں عبدالماجد کی عقل ہی ان کی امام اور رہبر تھی۔ جو بھی مذہبی عقیدہ ان کی عقل کے معیار پر پورا نہ

اتر تا وہ بقول عبدالماجد ناقص تھا۔ مضامین میں عبدالماجد کا لہجہ کڑوا اور مسموم ہوتا حتی کہ مذہب و سائنس کے اختلافات کی تفصیل درج کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکال لائے کہ مذہب اب چند روزہ مہمان ہے۔ جوں جوں سائنس کی تعلیم عام ہوتی جائے گی اسی نسبت سے مذہب کا اثر بھی زائل ہوتا جائے گا۔ ان تمام مضامین کا مقصود دراصل مذہب کو مجموعہ توہمات ظاہر کرنا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اکثر مسائل میں بانیان مذہب غلطیوں اور غلط فہمیوں کا شکار رہے۔ وہ تعلیمات مذاہب کو اللہ کی نہیں بلکہ انبیاء کی خود ساختہ سمجھتے تھے۔ عبدالماجد کے ان مضامین کا ردّ عمل بھی ہوا۔ جن کا خلاصہ یہ تھا کہ استدلال نہایت سطحی ہے، قرآن کریم کی بعض آیات کو سمجھنے میں ٹھوکر کھائی ہیں۔ مصنف کا قلم اندھے کی لکڑی کی طرح ہے جو چاروں طرف گھوم رہی ہے کسی کے بھی لگ جائے۔

عبدالماجد کا الحاد اپنی جگہ لیکن ''الکلام'' پر تنقیدی اقساط اور دوسرے کئی مضامین کے ذریعے وہ اپنے آپ کو ایک ادیب تسلیم کروا چکے تھے۔ بعض ادیبوں سے ان کے تعلقات بھی استوار ہو چکے تھے جو ان کے خاندان سے واقف تھے انہیں دکھ ہوا کرتا تھا کہ کیسے اشرف خاندان کا چراغ کن ہواؤں کے سامنے ہے۔ ان کی تہجد گزار ماں کو جب علم ہوا تو دل پر قیامت گذر گئی۔ وہ جو دوسروں کو نماز و روزے کی تلقین کیا کرتی تھیں ان کا اپنا بیٹا منکر نماز و روزہ تھا۔ والد عبدالقادر صاحب وقت سے پہلے بوڑھے ہو چکے تھے۔ سب نے خوب سمجھایا، پر سب بے سود۔ عبدالماجد کا مطالعہ وسیع تھا، الحاد بھی استدلال پر مبنی تھا، منطق و فلسفہ ان کے خاص مضامین تھے، کوئی ان سے نہ جیت سکا، کوئی قائل نہ کر سکا۔ سب نے انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر دعاؤں کا سہارا پکڑ لیا اور معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''ذہنی، فکری، عقلی اعتبار سے تو تماتر ایک فرنگی تھا، مسلمانوں سے میل جول بہت کم ہو گیا تھا لیکن ابھی بھی جذباتی حیثیت سے ایک مسلمان ہی تھا، ایک روشن خیال مسلمان، مسلم قومیت سے میری جڑیں کٹنے نہ پائی تھیں، مسلم قومیت دین اسلام کے بعد ایک بڑی نعمت ہے، کوئی صاحب اسے بے وقعت و بے قیمت نہ سمجھیں، مجھے آگے چل کر اس کی بڑی قدر معلوم ہوئی۔ حالت یہ تھی کہ کوئی غیر مسلم جب کبھی اسلام پر معترض ہوا، ارتداد کامل کے باوجود اپنا دل اسکی تائید کے بجائے اسکو جواب دینے پر ہی آمادہ کرتا۔ اکتوبر 1911 کا ذکر ہے، ایک بڑی مسیحی کانفرنس میں شرکت کے لیے مشہور معاند اسلام پادری زویمر بھی بحرین سے آئے، انکی شہرت عداوت اسلام کی، ان سے قبل یہاں پہنچ چکی تھی۔ میں بی اے کا طالب علم تھا اور عقیدۃً تمام تر منکر اسلام۔ اپنے ایک دوست مولوی عبدالباری ندوی کو ساتھ لے، جھٹ ان سے ملنے پہنچا، پادری صاحب اخلاق سے پیش آئے لیکن حسب عادت چوٹیں اسلام پر کرنا شروع کر دیں۔ آپ یقین کیجیے کہ جوابات جس طرح ندوی صاحب نے عربی میں دینا شروع کئے اسی طرح میں نے بھی انگریزی میں۔ پادری صاحب پر یہ کسی طرح کھلنے نہ پایا کہ میں تو خود ہی اسلام سے برگشتہ و مرتد ہوں، کسی پادری یا آریہ سماجی یا کسی اور کھلے ہوئے دشمن اسلام کا اثر مطلق مجھ پر نہ تھا۔ متاثر

جو کچھ بھی میں ہوا تھا، وہ تمام تر اسلام کے مخفی دشمنوں سے اور انکی تحقیقات سے ہوا تھا، جو زبان پر دعوی کمال بے تعصبی کا رکھتے تھے، لیکن اندر ہی اندر زہر کے انجکشن دیتے جاتے۔"(آپ بیتی صفحہ، 243)

دوسری طرف اپنی سوچ میں شدت پسندی کا یہ حال تھا کہ کالج کے سالانہ امتحان کے فارم میں مذہب کے فارم میں اسلام کے بجائے "ریشنلسٹ" لکھنا باعث فخر سمجھتے۔انٹر کے بعد اسی کالج میں بی اے میں داخلہ لیا، مضامین بھی وہی خاص تھے، عربی اور فلسفہ۔مذہب کی مخالفت کے لئے فلسفہ ہی بڑا سہارا ہو سکتا ہے کیونکہ تمام تر تکیہ "عقل" پر کرتا ہے۔کالج کی لائبریری میں جتنی کتابیں فلسفے کی تھیں سب پڑھ ڈالیں۔ملحدوں و نیم ملحدوں کی کتابوں کے ساتھ وہ کتابیں بھی سامنے آئیں جنکا موضوع نفسیات تھا ان سے الحاد کو مزید تقویت ملی۔ آب بیتی میں لکھتے ہیں:

" اسلام اور ایمان سے برگشتہ کرنے اور صاف و صریح ارتداد کی طرف لانے میں ملحدوں اور نیم ملحدوں کی تحریریں ہر گز اس درجہ موثر نہیں ہوئیں جتنی وہ فنی کتابیں ثابت ہوئی جو نفسیات کے موضوع پر اہل فن کے قلم سے نکلی ہوئی تھیں۔بظاہر مذہب سے کوئی تعلق نہیں رکھتی تھیں، نہ نفیانہ اثباتا، لیکن اصلی زہر انہی بظاہر بے ضرر کتابوں کے اندر گھلا ہوا ملا۔مثلا ایک شخص گزرا ہے ڈاکٹر ماڈسلی اسکی دو موٹی موٹی کتابیں اس زمانہ میں خوب شہرت پائے ہوئے تھیں، ایک مینٹل فزیالوجی (عضویات دماغی) اور دوسری مینٹل پیتھالوجی (مرضیات دماغی)۔اس دوسری کتاب میں اختلال دماغی اور امراض نفسیاتی کو بیان کرتے کرتے یک بیک وہ بدبخت مثال میں وحی محمدی کو لے آیا اور اسم مبارک کی صراحت کے ساتھ ظالم لکھ گیا کہ مصروع شخص کے لیے یہ بالکل ممکن ہے کہ وہ اپنا کوئی بڑا کارنامہ دنیا کے لئے چھوڑ جائے۔۔! ایمان کی بنیادیں کھوکھلی تو پہلے ہی ہو چکی تھیں اب ان کم بخت 'ماہرین فن' کی زبان سے اس قسم کی تحقیقات عالیہ سن کر رہا سہا ایمان بھی رخصت ہو گیا اور الحاد و ارتداد کی منزل تکمیل کو پہنچ گئی۔!

ایمان کو عزیز رکھنے والے خدا کے لئے ان تصریحات کو غور سے پڑھیں۔"(آب بیتی صفحہ 240)

اس دوران ایک آنریری مجسٹریٹ جو عبدالقادر صاحب کے قرابت دار بھی تھے 'کی صاحبزادی عفت النساء سے عبدالماجد کی ملاقات ہوئی اور اس سے محبت کرنے لگے۔آتش عشق بڑھی تو شاعر بھی بن گئے، غزلوں پر غزلیں ہونے لگیں۔ان کچھ دنوں کے لئے وہ نہ مسلمان تھے نہ ملحد بس عاشق بن گئے تھے۔کچھ غزلیں جمع ہوئیں تو سوچا کہ اکبر الٰہ آبادی کو دکھادیں۔اکبر کی جانب سے حوصلہ افزا جواب آیا تو دوسری غزل روانہ کی جس کا شعر تھا:

جانبازیوں کو خبط سے تعبیر کر چلے

تم یہ تو خوب عشق کی توقیر کر چلے

اکبر نے خوب داد دی اور خوشی اور تعجب کا اظہار کیا۔ محبت میں دیوانگی کی حد عبدالماجد ضرور چھو رہے تھے مگر اپنے علمی مرتبے سے بھی غافل نہ تھے۔ ان کی دو کتابیں۔ ''سائیکالوجی آف لیڈر شپ ''اور ''فلسفہ اجتماع ''آگے پیچھے شائع ہوئیں۔ انہوں نے ان کتابوں میں پیغمبران عظام پر تعریضات کی تھیں اور ان پر خود غرضی کے الزامات لگائے تھے۔ یہ ایسی جسارت تھی کہ اخبارات ورسائل خاموش نہ رہ سکے۔ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ مخالفانہ تبصرے شائع ہوتے چلے گئے۔ سب سے اہم فتویٰ وہ تھا جو احمد رضا خان بریلوی کی جانب سے شائع ہوا اور عبدالماجد کو کافر قرار دیا گیا۔ اس کے ساتھ بہت سے فتوے ان کی عدم تکفیر میں بھی شائع ہوئے۔ جن میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی، سید سلمان ندوی اور مولانا شیر علی جیسے جید نام بھی تھے۔ یہ حضرات سمجھتے تھے کہ عبدالماجد غلط راستے پر پڑ گیا ہے اگر نرمی کا برتاؤ کیا جائے تو جلد ہی راستے پر آجائے گا اگر سختی کی گئی تو مزید ضد پر آجائے گا۔ علما کا یہ برتاؤ اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ عبدالماجد کی علمی وقعت کے قائل تھے۔ وہ دھیرے دھیرے نرمی کے ساتھ انہیں اسلام کی طرف لانا چاہ رہے تھے۔ ان کتابوں کی وجہ سے انکے خاندان میں بھی چہ مگویاں بڑھ گئی تھیں ماں نے یہ حل سمجھا کہ اس کی شادی کر دی جائے۔ چنانچہ 2 جون 1916 کو اس کا نکاح لکھنؤ میں انجام پا گیا۔ ممتاز شعرا نے تاریخیں نکالیں اور سہرے لکھے۔

منکر ہو نہ کوئی اپنی ہمتائی کا

یہ کام کبھی نہیں ہے دانائی کا

اللہ نے اب غرور ان کا توڑا

دعوی تھا مرے دوست کو یکتائی کا (سید سلیمان ندوی)

انہی دنوں عبدالماجد سخت معاشی پریشانیوں کا شکار بھی ہوئے، والد فوت ہو چکے تھے، پیسہ جس بنک میں تھا وہ دیوالیہ ہو گیا۔ آخر دار المصنفین اعظم گڑھ ان کے کام آگیا۔ دارالمصنفین کی فرمائش پر جارج برکلے کی مشہور انگریزی کتاب کا ترجمہ ''مکالمات برکلے ''کے نام سے کیا جو اس خوبی سے ہوا کہ ہمیشہ کے لئے زندہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ''معارف ''کے لئے معاوضے پر لکھنا شروع کر دیا اور گزر بسر

ہوتی رہی۔ 1919 کے اوائل میں نظام حیدر آباد سے ان شرائط پر وظیفہ کی منظوری ہوئی کہ وہ سال میں 1 تصنیف پیش کیا کریں گے اور اسکے خاکے کا مسودہ محکمہ احتساب کی نظر سے گزارنا ہوگا، محکمے کی منظوری کے بعد وہ کتاب مکمل کریں گے۔ شرائط شائد اسی لئے لگائی گئی تھی کہ عبدالماجد کے الحادی نظریات کو جانچ سکیں۔ 125 روپے ماہانا تاحیات منظور ہوگئے جو گھر بیٹھے انہیں ہر ماہ ملنے لگے۔ اس دور میں متعدد ترجمے ان کے قلم سے نکلے جن میں ''تاریخ، تمدّن، تاریخ اخلاق یورپ'' اور نامور ان سائنس'' بڑی اہم ثابت ہوئیں۔

مد کے بعد جزر

نظریات وافکار کی جنگ جو دس سال سے ان کے باطن میں چھڑی ہوئی تھی اس کے خاتمے کا دور آنے ہی والا تھا۔ ایک ہلچل جو مچی تھی اس کو قرار ملنے ہی والا تھا۔ تشکیک والحاد کے اس حملے سے جس سے وہ مغلوب ہوئے تھے اب اس سے نجات کا دن قریب آرہا تھا۔ ان کی عقل پر ابر جہالت پھاڑ کر ایک نیا سورج طلوع ہونے اور ان کے اندر ایک نیا انسان بیدار ہونے والا تھا۔ اور اس نئے انسان کی بیداری میں ان مسلمان دوستوں کا بڑا ہاتھ تھا جو ان کے دور الحاد میں بھی ان کے ساتھ ہی رہے۔ اپنی آپ بیتی میں لکھتے ہیں''

''مخلصانہ کوششیں اگر تھوڑی بہت کسی کی چپکے چپکے کار گر ہوتی رہیں ان دو ہستیوں کی: ایک نامور ظریف شاعر اکبر الہ آبادی، بحث و مناظرہ کی انہوں نے کبھی چھاؤں بھی نہیں پڑنے دی اور نہ کبھی پند و موعظت ہی کی طرح ڈالی۔ بس موقع بہ موقع اپنے میٹھے انداز میں کوئی بات چپکے سے ایسی کہہ گزرتے، جو دل میں اتر جاتی اور ذہن کو جیسے ٹھوکے دے دیتے کہ قبول حق کی گنجائش کچھ تو بحر حال پیدا ہو کر رہتی۔ ایک روز بولے 'کیوں صاحب، آپ نے تو کالج میں عربی لی تھی، پھر اب بھی اس سے کچھ مناسبت قائم ہے؟ علم وزبان کوئی بھی ہو ، بحر حال اسکی قدر تو کرنی ہی چاہیے'۔ میں نے کہا 'اب اس کے لکھنے پڑھنے کا وقت کہاں ملتا ہے'۔ بولے 'نہیں کچھ ایسا مشکل تو نہیں، قرآن کی بے مثل ادبیت کے تو اہل یورپ بھی قائل ہیں، اور سنا ہے کہ جرمن یونیورسٹیوں میں قرآن کے آخری پندرہ پارے عربی ادب کے کورس میں داخل ہیں، آپ عقائد نہیں، زبان ہی کے اعتبار سے قرآن سے ربط قائم رکھئے اور جتنے منٹ بھی روزانہ نکال سکتے ہوں اسے پڑھ لیا کریں، جتنے حصے آپ کی سمجھ میں نہ آئیں، انہیں چھوڑتے جایئے اور یہ سمجھ لیجیئے کہ وہ آپ کے لیے نہیں لیکن آخر کہیں تو کچھ فقرے آپ کو پسند آہی جائیں گے، بس انہی فقروں کو دو چار بار پڑھ لیا کیجیے، آپ کے لیے کوئی قید باوضو ہونے کی بھی نہیں''۔ یہ ایک نمونہ تھا انکی تبلیغ کا۔ دوسری ہستی مولانا محمد علی جوہر تھے، بڑی زوردار شخصیت تھی انکی۔۔ کبھی خط میں اور کبھی زبانی، جہاں ذرا بھی موقع پاتے، ابل پڑتے اور جوش خروش کے ساتھ، کبھی ہنستے ہوئے، کبھی گرجتے ہوئے اور کبھی آنسو بہاتے ہوئے تبلیغ کر ڈالتے۔ انکی عالی دماغی

،ذہانت، علم اور اخلاص کا پوری طرح قائل تھا اس لیے کبھی کوئی گرانی دونوں کی تبلیغ سے نہ ہوئی۔ایک تیسرا نام اور سن لیجیے، یہ اپنے ایک ساتھی مولوی عبدالباری ندوی تھے۔دھیماد ھیما انکا اچھا ہی اثر پڑتا رہا۔''

اس تبدیلی میں کافی حصہ ان کتابوں کا بھی تھا جو ان کے مطالعے میں رہتی تھیں۔کتابوں ہی نے انہیں بھٹکایا اور اب کتابیں ہی انہیں راہ راست پر لا رہی تھیں۔مذہبی یا نیم مذہبی قسم کے فلسفیوں کا مطالعہ شروع ہوا، حکیم کنفیوشس کو پڑھا، پھر بدھ مت، پھر تھیاسوفی جو ہندو فلسفہ تصوف پر مشتمل کتاب ہے اور اس میں سارا زور روح اور اسکے تقلبات پر اور رنگ کچھ حاضرات و عملیات سے ملتا ہے 'پڑھی، اسکے علاوہ ہندو فلسفہ کے بڑے شارح و ترجمان ڈاکٹر بھگوان داس کی ساری تحریریں پڑھ گئے، کرشن جی کی بھگوت گیتا کے بھی جتنے نسخے انگریزی میں مل سکے سب پڑھ ڈالے۔۔ان کتابوں نے جیسے آنکھیں کھول دیں اور ایک بالکل ہی نیا عالم روحانیات یا ماوراء مادیات کا نظر آنے لگا۔خود لکھتے ہیں:

''ڈیڑھ دو سال کے اس مسلسل مطالعہ کا حاصل یہ نکلا کہ فرنگی اور مادی فلسفہ کا جو بت دل میں بیٹھا ہوا تھا، وہ شکست ہو گیا اور ذہن کو یہ صاف نظر آنے لگا کہ اسرار کائنات سے متعلق آخری توجیہہ اور قطعی تعبیر ان فرنگی مادیین کی نہیں بلکہ دنیا میں ایک سے ایک اعلی و دل نشین توجیہیں اور تعبیریں اور بھی موجود ہیں اور روحانیات کی دنیا سراسر وہم و جہل اور قابل مضحکہ و تحقیر نہیں، بلکہ حقیقی اور ٹھوس دنیا ہے، عزت و توقیر، عمق اور تحقیق و تدقیق کے اعتبار سے گوتم بدھ اور سری کرشن کی تعلیمات ہر گز کسی مل، کسی اسپنسر سے کم نہیں، بلکہ کہیں بڑھی ہوئی ہیں اور حکمائے فرنگ انکے مقابلے میں بہت پست و سطحی نظر آنے لگے۔اسلام سے ان تعلیمات کو بھی خاصہ بعد تھا لیکن بحر حال اب مسائل حیات، اسرار کائنات سے متعلق نظر کے سامنے ایک بالکل نیا رخ آگیا اور مادیت، لاادریت و تشکیک کی جو سر بفلک عمارت برسوں میں تعمیر ہوئی تھی، وہ دھڑام سے زمین پر آرہی۔دل اب اس عقیدہ پر آگیا کہ مادیت کے علاوہ اور اس سے کہیں ماوراو مافوق ایک دوسرا عالم روحانیت کا بھی ہے، حواس مادی محسوسات، مغیبات و مشہودات ہی سب کچھ نہیں، انکی تہہ میں اور ان سے بالاتر 'غیب' اور مغیبات کا بھی ایک مستقل عالم اپنا وجود رکھتا ہے۔''الحاد و ارتداد کا یہ دور دس سال تک رہا، پھر ان تدریجی تبدیلیوں کے ساتھ آہستہ آہستہ اسلام کی طرف آنا شروع ہوئے۔ابھی ابتداء ہی تھی کہ مولانا شبلی کی سیرۃ النبی کی جلد اول پریس سے باہر آگئی، دل کا اصلی چور تو یہیں تھا اور نفس شوم کو جو سب سے بڑی ٹھوکر لگی تھی وہ سیرت اقدس کی ہی تو تھی اور خاص طور پر غزوات و محاربات کا سلسلہ۔ظالموں نے نجانے کیا کچھ ان کے دل میں بٹھا دیا تھا اور ذات مبارک کو نعوذ باللہ ایک ظالم فاتح دکھایا تھا۔خود لکھتے ہیں:

"شبلی نے اصل دوا اسی درد کی کی، مرہم اسی زخم پر رکھا۔ کتاب جب بند کی تو چشم تصور کے سامنے رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر ایک بڑے مصلح ملک و قوم اور ایک رحم دل و فیاض حاکم کی تھی، جس کو اگر جدال و قتال سے کام لینا پڑا تھا تو پھر بالکل آخری درجہ میں، ہر طرح پر مجبور ہو کر، یہ مرتبہ یقیناً آج ہر مسلمان کو رسول و نبی کے درجہ سے کہیں فروتر نظر آئے اور شبلی کی کوئی قدر و قیمت نظر نا آئے گی لیکن اس کا حال ذرا اسکے دل سے پوچھئے جس کے دل میں نعوذ باللہ پورا بغض و عناد اس ذات اقدس کی طرف جما ہوا تھا۔ شبلی کی کتاب کا یہ احسان میں کبھی بھولنے والا نہیں"۔(آپ بیتی)

اسکے بعد مثنوی مولانا روم مطالعہ میں آئی، پڑھنا شروع کی تو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے جادو کر دیا ہو، کتاب چھوڑنا چاہیں بھی تو کتاب نہیں چھوڑ رہی، ایسی کشش و جاذبیت کہ دیوانوں کی طرح ایک مستی کا عالم طاری ہے، نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کا، بس کمرہ بند کر کے خلوت میں کتاب پڑھے جا رہے ہیں کہیں آنسو نکلے اور کہیں چیخ بھی پڑے، ادھر کتاب ختم ہوئی ادھر شکوک و شبہات بغیر کسی رد و قدح میں پڑے اب دل سے کافور تھے، پھر یہی حال مکتوبات مجدد سرہندی کو پڑھ کر ہوا۔ الحاد کی گرہ کھل چکی تھی۔ مدتوں بعد وضو کر کے مصلے پر آئے اور خدا کے حضور کھڑے ہو گئے کہ جسے وہ بھول چکے تھے۔ گناہوں کا خیال آیا تو چیخیں نکل گئیں۔ عفت کی آنکھ کھلی شوہر کو اس حال میں دیکھا تو شکر ادا کیا، شوہر کے آنسوؤں میں پھر اس کے آنسو بھی شامل ہو گئے، رات بھر یہی حالت رہی اور فجر کی نماز مسجد میں جا کر پڑی۔ ایک دن گھر پر بیٹھے بیٹھے اپنے نکاح کا خیال آ گیا کہ میں تو اس وقت کسی اسلامی رسم کا قائل ہی نہ تھا جب نکاح ہو رہا تھا تو میں دل میں ہنس رہا تھا، بس نمائش میں بیٹھا تھا۔ دل سے تو قبول نہیں کیا تھا۔ بس تجدید نکاح کی ٹھان لی بیوی سے ذکر کیا تو بولیں یعنی آپ مجھے بیوی بنانے پر آمادہ نہ تھے؟ کہا بالکل تھا، مگر ایسے جیسے کہ ایک ہندو ہوتا ہے، نکاح کے وقت جب آیات پڑھی جا رہی تھیں تب میں یہی سوچ رہا تھا کہ یہ کلام الٰہی نہیں ہے۔ ایک مولوی صاحب کو بلوایا اور دوبارہ نکاح پڑھوایا۔

تجدید اسلامی کے بعد جوش اٹھا تو آستانہ اجمیری پر حاضری دی۔ قوالیوں کی آوازیں چہار سو تھیں، عرس کا زمانہ تھا، ہر جانب لوگ ہی لوگ تھے۔ عبدالماجد کھدر کا لباس پہنے ہوئے تھے، گورا رنگ، داڑھی سفید گول اور نورانی، نکلتا ہوا قد، آنکھوں پر چشمہ، سر پر ٹوپی۔ عارفانہ کلام پڑھا جانے لگا تو عبدالماجد بھی جھوم اٹھے۔ لوگ حیران تھے مگر ان کے قلب کی کیفیت کو کوئی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ پھر چشم فلک نے انہیں درگاہ خواجہ بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ، شاہ مینا، خواجہ نظام الدین اولیاء کے چکر کاٹتے دیکھا۔ دولت ایمان تو اب بلاشبہ نصیب ہو گئی تھی لیکن ابھی تک رواجی تصوف و خانقاہی مشیخیت میں ٹھوکریں کھا رہے تھے۔ اپنی اصلاح کے لیے کسی سے باقاعدہ بیعت ہونے کی

ضرورت محسوس کر رہے تھے لیکن عام آدمی تو نہ تھے کہ آنکھ بند کر کے کسی کے بھی مرید ہو جائیں ان کا مرشد بھی انہی کے معیار کا ہونا چاہیئے تھا۔ کبھی سوچا کہ مولانا محمد علی جوہر سے بیعت کریں تو کبھی کسی دوسرے کا خیال آتا۔ خود لکھتے ہیں:

''مرشد کی تلاش ایک عرصہ سے جاری تھی، تصوف اور سلوک کا ذخیرہ جتنا کچھ بھی فارسی، اردو اور ایک حد تک عربی میں ہاتھ لگ سکا تھا، پڑھ لیا گیا تھا، اتنی کتابیں پڑھ ڈالنے اور اتنے ملفوظات چاٹ جانے کے بعد اب آرزو اگر تھی تو ایک زندہ بزرگ کی۔ حیدر آباد اور دہلی اور لکھنو جیسے مرکزی شہر اور اجمیر اور کلیر، دیوہ اور بانسہ، رودلی اور صفی پور، چھوٹے بڑے 'آستانے' خدا معلوم کتنے دیکھ ڈالے اور سن گن جہاں کہیں کسی بزرگ کی بھی پائی، حاضری میں دیر نہ لگائی، حال والے بھی دیکھنے میں آگئے اور قال والے بھی، اچھے اچھے عابد، زاہد، مرتاض بھی اور بعض دوکاندار قسم کے گیسو دراز بھی، آخر فیصلہ یہ کیا کہ انتخاب کے دائرے کو محدود کر کے حلقہ دیوبند کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔۔ وصل بلگرامی بولے کہ 'بہت دوڑ دھوپ آپ کر چکے، ذرا ہمارے مولانا (مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ) کا بھی تجربہ کیجیے، سب کو بھول جایئے گا، تھانہ بھون اگر دور ہے تو قصد السبیل اور تربیت السالک وغیرہ تو میرے پاس ہی ہیں، انہیں تو دیکھ ڈالیے'۔ اچھا! ان خشک مولوی صاحب نے تصوف پر بھی کچھ لکھا لکھایا ہے؟ خیر، دیکھ ڈالنے میں کیا مضائقہ ہے۔ دوسری صبح کتابوں کے ساتھ وصل میرے ہاں لکھنو میں موجود۔ کتابیں پڑھ کر جب بند کیں تو عالم ہی دوسرا تھا؛

اب نہ کہیں نگاہ ہے اب نہ کوئی نگاہ میں

اپنا جہل اپنے سامنے آئینہ معلوم ہوا کہ اب تک جو کچھ اس سلسلہ میں پڑھا تھا، سنا تھا، جانا تھا، وہ بس جھک ماری تھی، تصوف کی حقیقت، طریق کی تعریف، آج پہلی بار دل و دماغ کے سامنے آئی، قصد السبیل پڑھتا جاتا تھا اور سطر سطر پر، پردے نگاہوں سے ہٹتے جاتے تھے، رہ رہ کر طبیعت اپنے ہی اوپر جھنجھلائی تھی کہ اب تک کیوں نہ پڑھا تھا، بارہ برس کی مدت کوئی تھوڑی ہوتی ہے''۔ (حکیم الامت، صفحہ نمبر 10، 11)

تھانوی رحمہ اللہ سے مراسلات شروع ہوئے، ایک سال تک مراسلات پر دلوں کا حال بیان ہوتا رہا پھر خود تھانہ بھون پہنچ گئے۔ طویل نشستیں رہیں، اتنے متاثر ہوئے کہ ایک جگہ لکھا کہ اگر میں عقیدہ تناسخ کا قائل ہوتا تو کہہ اٹھتا کہ امام غزالی رحمۃ اللہ دوبارہ تشریف لے آئے ہیں۔ بیعت کی بات کی تو حضرت تھانوی نے ان کا سیاسی میلان دیکھتے ہوئے مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کو کہا کہ وہ عبدالماجد کو بیعت کر لیں۔ عبدالماجد دیوبند گئے اور حضرت مدنی کے ہاتھ پر بیعت فرمائی۔ بیعت مدنی رحمہ اللہ سے ہوئی مگر عقیدت اور اصلاح کا

تعلق تھانوی رحمہ اللہ سے ہی رہا۔ شیخ کی وفات کے بعد انکی سوانح عمری، حکیم الامت نقوش وتاثرات، لکھی جو پانچ سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے کتاب کیا ہے ایک فلسفی مرید کے اپنے مرشد و مصلح کے ساتھ بیتے لمحات، ملاقاتوں کے احوال اور عقیدت و عشق میں ڈوبے ہوئے تاثرات کا مجموعہ ہے۔ اس کے علاوہ حضرت تھانوی کی ایک مشہور کتاب مناجات مقبول جو قرآنی و حدیثی دعاؤں کا خوبصورت گلدستہ ہے۔ اسکی عام فہم زبان میں شرح لکھی، شرح ایسی ہے کہ قاری دعائیں پڑھنے کے بجائے دعائیں مانگنے پر مجبور ہو جاتا ہے، دعاؤں میں مزا آنے لگتا اور الفاظ کی چاشنی اور عاجزانہ انداز قلب کی کیفیت بدلت دیتا ہے۔

کچھ عرصہ بعد دریا باد منتقل ہوئے اور اس کی خاموشی میں کام کرنے کا خوب موقع ملا۔ کئی ایسے ادبی مضامین قلم سے نکلے کہ جو ہمیشہ یاد رکھے گئے، غالب کا ایک فرنگی شاگرد، مرزا رسوا کے قصّے، اردو کا واعظ شاعر، پیام اکبر، اردو کا ایک بدنام شاعر، گل بکاؤلی، مسائل تصوف اور موت میں زندگی وغیرہ ان مضامین نے تنقید کی دنیا میں ایک نئی جہت کا آغاز کیا۔ تجدید اسلام کے بعد ایسے دور سے گذر رہے تھے کہ ان کا میلان زیادہ تر قرآن اور متعلقات قرآن ہی پر وقف ہو گیا تھا، تصوف بھی انکا خاص موضوع رہا، سو ایک کتاب ''تصوف اسلام'' لکھ ڈالی اور رومی کے ملفوظات کو بھی ترتیب دیا اور قرآن کے انگریزی ترجمے اور تفسیر جیسے بلیغ کام کا بھی آغاز کیا۔

بیسویں صدی کا ہندوستان ''اخبارات'' کا ہندوستان تھا، کئی اکابرین نے صحافت کے نئے باب رقم کئے تھے، ہندوستان کی سیاسی و مذہبی لہروں کی گونج اخبارات میں سنائی دے رہی تھی۔ خود عبدالماجد ایک عرصہ اخبارات ورسائل سے وابستہ رہے تھے، سو جانتے تھے کہ ہنگامی اور اہم موضوعات کو عوام تک پہنچانے کے لئے اخبارات سے بہتر کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے۔ سوچا کیوں نہ اپنا ایک اخبار ہی نکالا جائے، ادیب دوستوں سے مشاورت کے بعد اخبار کا نام ''سچ'' تجویز کیا گیا۔ تیاریاں مکمل ہوئیں اور عبدالماجد کی زیر ادارت ہفتہ وار اخبار پابندی سے نکلنا شروع ہو گیا۔ اس وقت رد بدعات، معاشرے میں پھیلی فکری غلط فہمیوں کی اصلاح، تجدد اور ترقی پسندی کے پردے میں مغرب نقالی کا رد اخبار کے خاص موضوعات تھے۔ یہ دور کئی قسم کے فرقوں کی پیدائش، سیاسی افراتفری اور انتشار کا دور تھا، اس لیے سچ کو اپنی زندگی میں بڑی بڑی لڑائیاں بھی لڑنا پڑیں، آج اس سے جنگ ہے تو کل اس سے۔ شروع میں توجہ اصلاح رسوم و رد بدعات پر زیادہ تھی اس لیے قدرۃ اہل بدعات بھی ناراض رہے اور وہابیت کا ترجمان ہونے کے القاب ملے، پھر جب سعودی شریفی آویزش پر نکتہ چینی شروع تو بدعتیوں کا پشت پناہ کہا گیا، بعض ہم خیال طبقات کی دشمنی بھی مول لینی پڑی لیکن سچ لکھنے کے لئے عبدالماجد نے کبھی مصلحت کو آڑے آنے نہ دیا۔ تنقید کی تو ہمیشہ ذاتیات کا پہلو بچا کر، حق کو حق اور باطل کو باطل بلا کسی مسلک، جماعت کے خیال اور بغیر کسی تعصب کے کہا۔ اپنے سابقہ تجربہ کی وجہ سے الحاد کی طرف جانے والے تمام راستوں سے واقف تھے اس لیے بلاوجہ کی تجدد پسندی، روشن خیالی،

مذہب بیزاری اور فلسفیانہ مغالطے پھیلانے والوں سے مقابلہ ہر محاذ پر رہا، اسی طرح الحاد براستہ انکار حدیث سے تو مدتوں جنگ رہی۔ نیاز فتح پوری کے الحاد و فتنہ نگار کے علمی رد کے لیے مہینوں اپنے کو وقف رکھا۔

سچ کی ہنگامہ آرائیوں میں مصروف رہ کر عبدالماجد اپنے خاص علمی کاموں سے دور ہوتے جارہے تھے، قرآن مجید کے انگریزی اور اردو ترجمے و تفسیر کے لئے کافی وقت درکار تھا اس کے لیے آخر "سچ" کو اس کارنامہ عظیم کی خاطر بند کر کے پوری جانفشانی سے تفسیر کا کام شروع کیا اور دریاباد کی تنہائیوں میں وہ کارنامہ سرانجام دینے لگے جو علوم دینی میں ایک اہم باب کا اضافہ کرنے والا تھا۔ عبدالماجد مغربی علوم کے ماہر اور قدیم اور جدید تاریخ پر گہری نظر رکھنے والے تھے، بائبل کے تمام ادوار انکی نظر میں تھے اور شروع میں پادریوں کی علمی یلغار کا مقابلہ بھی کرتے رہے تھے۔ اس کے علاوہ فلسفہ شروع سے انکا خاص موضوع رہا تھا، ایک عرصہ تک مغربی فلسفہ سے متاثر ہو کر الحاد و تشکیک کا شکار رہے تھے اس لیے اسکی حقیقت کو بھی دوسروں سے زیادہ سمجھتے تھے، شروع کی زندگی تو گزری ہی ہمہ وقت فرنگی علوم وفنون، فلسفہ و نظریات کی فتنہ سامانیوں اور معاشرے میں پھیلی فکری گمراہیوں کے علمی رد میں تھی۔ اپنی گزری عمر کے اس سارے علم اور تجربے کا نچوڑ اس تفسیر میں پیش کیا، تفسیر میں مغربی مفکرین، فلسفیوں، مبلغین کے اعتراضات اور پروپیگنڈے کے علمی جوابات بھی موجود ہیں اور اسکے اثرات سے پیدا ہونے والے لادینیت الحاد و تشکیک کے امراض کا شافی علاج بھی۔ مغربی فلسفہ زدہ یورپ پلٹ معاشرہ کے لیے یہ تفسیر آب حیات سے کم نہیں۔ مولانا نے اس میں رسمی تعبیرات اور اختلاف اقوال کے بجائے عصر حاضر کے انسان کے ذہن کے مطابق قرآنیات کی تفہیم و تشریح پر توجہ مرکوز رکھی اور قرآنی آیات والفاظ کی جو عصری تطبیق پیش کی اس میں تفسیر بالرائے سے بچنے کی کوشش میں اکابر علمائے تفسیر کی تحقیق کو بھی مد نظر رکھا اس لیے جہاں تفسیر میں بائبل، تورات، وید، گیتا، بدھ تعلیمات، مجوسی مفکرین، قدیم وجدید فلسفیوں کے حوالہ جات اور انکے مدلل جوابات نظر آتے ہیں وہاں عظیم مفسرین کرام کی تفاسیر کے اقتباسات کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ آپ کو مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی چونکہ ہر قدم پر ہدایات اور مشاورت میسر رہی اس لیے قرآن کے فقہی اور قانونی پہلو بھی مستند ہیں۔ مزید مولانا چونکہ اردو کے بہت بڑے ادیب اور انشاپرداز بھی تھے اس لیے تفسیر محض خشک علمی ابحاث پر مشتمل نہیں بلکہ یہ اردو تفسیری ادب میں بھی بلند مقام رکھتی ہے، اس میں علم وادب اور لفظ دانی و معنی شناسی کے حسین امتزاج نے ادب سے لگاؤ رکھنے والے کی تشنگی بھی دور کی ہے۔ تفسیر ماجدی لکھتے لکھتے کئی اور کتابیں بھی ظہور میں آئیں جو بعد میں "اعلام القرآن، ارض القرآن، مشکلات القرآن" وغیرہ کے نام سے شائع ہوئیں۔ یہ کام مکمل ہوا تو خاکے لکھنا شروع کر دیئے جنہیں کتاب کی صورت ملنے لگی۔ کسی عالم دین سے کب توقع تھی کہ وہ سوانح نگاری، خاکہ نگاری اور انشائی تحریروں میں بھی دماغ کھپائے گا لیکن عبدالماجد نے تو جیسے تہہ کر

لیا تھا کہ وہ ادب کے ہر گھر میں جھانکے بنا نہیں رہیں گے۔ شاعری بھی کی اور غزل کو ہاتھ لگایا، تنقید بھی کی اور تحقیق تو ان کا خیر میدان ہی تھا۔ یوں مسائل القصص، الحیوانات فی القرآن، ارض القرآن، اعلام القرآن، بشریت انبیاء، سیرت نبوی قرآنی، اور مشکلات القرآن جیسی کتب پڑھنے والوں کے سامنے آئیں۔

عبدالماجد کی صحت ہمیشہ سے ہی ناساز رہی تھی۔ ملیریا کے سالانہ حملوں اور مسلسل نزلے کے باعث بینائی متاثر ہو چکی تھی۔ 80 سال پار کرنے کے بعد قوت ارادی بھی جواب دینے لگی۔ ایک دن اپنی بیٹیوں کو پاس بلا کر اپنی کتابوں کی تقسیم بھی کروادی کہ انگریزی کی کتابیں ندوہ کے دارالمطالعے کو اور اردو، عربی اور فارسی کی کتب مسلم یونیورسٹی کو دے دیں۔ دسمبر کا مہینے کا آخر تھا کہ نیا حملہ فالج کا ہوا، حواس قائم نہ رہے تھے، بار بار غفلت طاری ہو جاتی تھی لیکن اس عالم میں بھی بار بار ہاتھ کان تک اٹھاتے اور اس کے بعد نیچے لا کر نماز کے انداز میں باندھ لیتے تھے۔ ایک روز اپنی منجھلی بیٹی کو بلا کر کہنے لگے کہ ''وہ جو آتا ہے ف۔۔۔'' بیٹی نے جملہ مکمل کیا کہ ''فرشتہ؟'' بولے ۔''ہاں'' اور داہنی جانب اشارہ کیا اور کہا'' آگیا ہے۔'' اس واقعے کے چار دن بعد ہی 6 جنوری 1977 صبح ساڑھے چار بجے خاتون منزل (لکھنؤ) میں خالق حقیقی سے جا ملے۔ نماز جنازہ وصیت کے مطابق نماز ظہر کے بعد ندوۃ العلماء کے میدان میں مولانا ابوالحسن ندوی رحمہ اللہ نے پڑھائی۔ دریاباد میں آپ کی تدفین ہوئی۔

مستفاد:

1- جناب ڈاکٹر تحسین فراقی کی تصنیف ''عبدالماجد دریابادی، احوال و آثار

2- عبدالماجد دریابادی کی سوانح ''آپ بیتی

3- حکیم الامت از مولانا دریابادی

کیاواقعی جدید سائنس منکرخداہوسکتی ہے؟

الحاد،سائنس اور خالقScience, Atheism & Creator :

دہریت درحقیقت کسی مضطرب ذہن کی ہٹ دھرمی اور ضد ہے۔جدید دور کے بڑے سائنسدان بھی الحاد کی قطار میں فکری شش وپنج کی وجہ سے ہیں۔خدا سے انکار کسی بھی شخص کا ذاتی نظریہ ہی ہوتا ہے مگر جب کوئی عالم یاماہر طبعیات اپنی علمی حیثیت میں اس کا اظہار کرتا ہے تو ایک تاثّر یہ بنتا ہے کہ اس کا علم بھی اس کی تائید کرتا ہوگا۔یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ سائنس کا دائرہ کار میٹافزکس نہیں ہے لیکن پھر بھی جدید اسکالر خدا کو بھی طبعی پیرایوں میں تلاش کرتے ہیں۔جدید دور میں اکثر سائنسدان خدا کے وجود کے حوالے سے تذبذب کا شکار ہیں جس کی وجہ سے یہ خیال جڑ پکڑ رہا ہے کہ سائنس خدا کی منکر ہے،اس کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے لادین طبقہ سائنسی نظریات کا سہارا لے کر لادینیت اور دہریت کی ترویج کرتا ہے اور یہ غلط تاثر پھیلاتا ہے کہ سائنس خدا یااللہ کی منکر ہے۔

ہمیں دیکھنا ہوگا کہ کیاواقعی جدید سائنس منکرِ خدا ہوسکتی ہے؟

جدید سائنسدانوں اور اسکالرز کا نقطہ نظر یہ ہے کہ آپ جو چاہے نظریہ رکھیں مگر اس کے سچّا ہونے کا دعویٰ نہ کریں کیونکہ جو دعویٰ تجربے سے ثابت نہ ہو وہ سائنسی طور پر غلط False ہے۔یعنی آپ خدا پر یقین رکھتے ہیں تو رکھیں،یہ آپ کا ذاتی مسئلہ ہے لیکن اس کے سچ ہونے پر اصرار نہ کریں کیونکہ سائنس کے نظریات اور تجربات اس کی تائید نہیں کرتے۔اکثر لادین دوست اپنی تحاریر میں ایسا ہی تاثر دیتے ہیں۔اس طرح کی دلیل کے حوالے سے پہلے تو یہ تعیّن کرنا ہوگا کہ آیاسائنسی علوم اور ان کے حدود کار کی بنیاد پر یہ دلیل دی بھی جاسکتی ہے یا نہیں۔سائنس بذات خود کوئی علم نہیں بلکہ طبعی دنیا کے ہر شعبے کے علوم کی عقلی اور تجرباتی بنیاد پر تصدیق ہی سائنس کہلاتی ہے۔آیئے خدا کے حوالے سے مندرجہ بالا نقطۂ نظر کو عام فہمی یا کامن سینس سے دیکھتے ہیں کہ آیا یہ خود کتنا سائنسی، منطقی اور عقلی ہے۔

سوال یہ ہے کہ:ہم کسی مخصوص شخص کو کیسے پہچانتے ہیں؟

انسان کے دو رخ ہیں؛ایک طبعی اور دوسرا تصوّراتی،جسمانی رخ کو طبعی طور پر ہم اپنے حواس سے محسوس کر لیتے ہیں جبکہ شخصیت personبمع نام یعنی مسٹر ایکس ایک غیر مرئی abstract ہے جس کو ہمارا شعور جو خود غیر مرئی ہے،ایک تصوّر کی شکل میں قبول کرتا ہے۔اس طرح ہمارے حواس اور شعور مل کر ایک مخصوص شخص کو پہچانتے ہیں۔کیا سائنسدان کوئی ایسا طریقہ دریافت کر پائے ہیں جو کسی انسان کی شخصیت کا تعیّن کر سکے یا اس کا نام بتا سکے؟

یہ بات یقیناً دلچسپ ہے کہ جدید ترین سائنسی تجربات بھی کسی انسان کی شخصیت کی تصدیق نہیں کر سکتے۔ شخصیت کی کھوج میں کسی بھی سائنسی ٹیسٹ یا سائنسی تلاش میں ایک انسان کو محض خلیاتی انبار یا جنّیاتی مجموعہ یا a-bunch-of-molecules یا-group of-DNA ہی بتایا جائے گا۔ انسان کے حوالے سے کوئی بھی میڈیکل ٹیسٹ ایک مطلوبہ معلومات تو دیتا ہے لیکن یہ بتانے سے قاصر ہوتا ہے کہ یہ کس شخص سے متعلّق ہے۔ یہاں پر یہ انسان ہی ہوتا ہے جو رپورٹ پر نام لکھ کر متعلّقہ شخص سے منسوب کرتا ہے۔ یعنی مسٹر اسٹیون ہاکنگ Stephen-Hawking جو بانگ دہل ایک بڑے دہریہ سائنسدان ہیں، ان کے اس دعویٰ کی تصدیق کوئی بھی سائنسی تجربہ نہیں کر سکتا کہ وہ اسٹیون ہاکنگ ہیں! ایک اور بڑے خدا کے منکر جناب رچرڈ ڈاکنز Richard-Dawkins چاہے کتنی کوشش کر ڈالیں، ان کی ممدوح سائنس ان کو بحیثیت مسٹر ڈاکنز پہچاننے سے ہمیشہ عاری رہے گی!

سوال یہ ہے کہ:

اگر ان کے بحیثیت ایک خاص انسان (Specific-Person) موجودگی کے دعویٰ کی تصدیق کرنے سے سائنس قاصر ہے تو کیا ان کا وجود نہیں ہے؟

ہر طرح کے سائنسی ٹیسٹ میں یہ دونوں ایک شخصیت کی حیثیت سے معدوم ہیں لیکن حقیقتاً موجود ہیں جس کی تصدیق انسان کے حواس اور شعور کرتے ہیں۔

یہیں پر آکر جدید سائنس کی حدود کا حقیقی تعیّن ہوتا ہے جو محض طبعی ہیں۔

تخلیق کے مدارج Phases of The Creation :

بنانے یا تخلیق کے تین مدارج ہوتے ہیں، ارادہ، عمل یا تخلیق اور ظہور۔ کسی بھی انسانی ایجاد یا تخلیق کا مطالعہ کریں یہ تین مرحلے لازماً موجود ہوں گے۔

تخیّل یا ارادہ طبعی تخلیقی مراحل یعنی عمل سے گزر کر ہی ایک مکمل شے کی صورت میں عیاں ہوتا ہے۔

سائنس: کسی کار کو دیکھ کر ہم اس کے تخلیقی مراحل کو نہیں جان سکتے بلکہ اس کے لیے باقاعدہ تحقیق کی ضرورت ہو گی۔ اس کے پرزے پرزے کو جدا کر کے اور ان کی اندرونی ماہیت کو جان کر ہی ہم اس کی مینوفیکچرنگ تکنیک کو سمجھ سکیں گے۔ یہی کاوش سائنس کہلاتی ہے۔

لیکن یہاں یہ واضح رہے کہ اس تمام پیداواری مراحل کے بارے میں سب کچھ جان کر بھی ہم اس کار کے تخلیق کار manufacturer کی شخصیت کو نہیں جان پائیں گے۔اس کے لیے ایک دوسرا طریق کار اختیار کرنا ہوگا۔اس طرح واضح ہوا کہ دو باتیں ہوتی ہیں ایک انسانی عمل اور دوسرا اس کا حاصل۔ عمل غیر مرئی اور ناقابل پیائش ہے اس کی کوئی شکل نہیں ہوتی لیکن اس کا حاصل قابل گرفتِ حواس ہے یعنی انسان کسی عمل کی نہیں بلکہ اس کے نتیجے کی پیائش کر سکتا ہے۔

عمل اور نتیجہ:

انسان ایک دعویٰ کرتا ہے کہ میرا نام الف ہے تو اس کے اطراف موجود انسان اس کا دعویٰ اس لیے قبول کرتے ہیں کہ انسانی شعور طبعی حواس کی مدد سے اس کی تصدیق کرتے ہیں۔انسانوں کا یہ دعویٰ قبول کرنا ہی اس شخص کے بحیثیت الف موجود ہونے کی دلیل بنتا ہے۔ حواس صرف اطّلاعات دیتے ہیں اور انسانی شعور عقل کے تناظر میں فیصلہ کرتا ہے۔اس طرح یہ واضح ہوا ہے کہ کسی بھی تخلیق کار، جیسے کسی کار کے مینو فیکچرر، یا کسی فن پارے کی تخلیق کرنے والے مصوّر یا کسی ڈرامہ نویس کی کسی بھی جدید سائنسی ٹیسٹ سے تصدیق نہیں ہو سکتی بلکہ صرف اور صرف انسانی شعور ہی اس تصدیق کی قدرت رکھتا ہے یعنی سائنس انسان کی صرف ایک طبعی و حیاتی نظام physical/biological-system کی حیثیت سے ہی تصدیق کر سکتی ہے۔اب بتایئے کہ جو علوم سامنے موجود انسان کی شخصیت کو نہ پہچان سکیں نہ تصدیق endorse کر سکیں یا ایک تخلیق کے محرّک Initiator کی نشان دہی تک نہ کر سکیں تو ان کا محدود ہونا تو ثابت ہو گیا۔مزید یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ انسانی شعور ہی ہے جو حاصل کردہ علوم کی بنیاد پر دوسرے انسان کی شخصیت اور اس سے وابستہ کسی عمل کی تصدیق کرتا ہے نہ کہ سائنسی.

علوم!

اب جدید سائنس کے تجربات کو خدا کی پہچان کے لیے استعمال کرنا کتنا عقلی ہے، خود فیصلہ کر لیجے۔ گویا واضح ہوا کہ سائنس کا دائرہ کار کسی بھی چیز یا تخلیق کو پا کر اس کی تخلیقی ماہیّت، اس کے پیداواری یا ارتقائی مراحل اور منبع origin کو جاننا ہے یعنی تخلیق کے مذکورہ بالا تین میں سے آخر کے دو مراحل، جو عمل اور اس کا نتیجہ یا طبعی اظہار ہیں جبکہ اس سے قبل کا مرحلہ یعنی تخلیق کار Inventor/creator یا ارادے کے مآخذ کی نشاندہی میں صرف انسانی عقل اور موجود معلومات available-information کام آتی ہیں کہ کون ایسی صلاحیّت، علم، قوّت اور وسائل رکھتا ہے کہ یہ کار بنا سکے یا کوئی مخصوص کام کر سکے۔

خدا کی تصدیق:

بالکل اسی طرح انسان حاصل علوم سے اپنی خرد اور دانش سے ہی خالق کائنات یعنی خدا یا اللہ تعالیٰ کے وجود کی تصدیق کر سکتا ہے۔ یہی ایمان کہلاتا ہے اور یہ عقل و شعور سے حقائق کی پرکھ کے بعد بالکل خالص ذاتی فیصلہ ہوتا ہے سائنسی نہیں۔ اسی طرح اللہ کا انکار کسی انسان کا ذاتی فیصلہ ہوتا ہے جو اس کا شعور متعیّن کرتا ہے۔

ایک بات واضح رہے کہ انسان خدا کو خود ہی تلاش نہیں کرتا بلکہ یہ خدا ہے جو کہ انسانوں کا خالق ہونے کا اعلان کرتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ میں تمہارا خالق ہوں، پھر انسان اپنی عقل و خرد اور علوم کی گواہی سے ہی اس کی تصدیق کرتا ہے۔ خدا کا دعویٰ اس کی طرف سے انسانی واسطے سے پیغام اور حیرت انگیز تحریر text کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، ایسی تحریر جس کا مصنّف ہونے کا کوئی بھی انسان دعٰوی نہیں کرتا۔

کیا سائنس کسی بھی کتاب کے مصنّف کا نام بتا سکتی ہے؟

سائنسی علوم صرف ایک محدود دائرے میں ہی انسان کی رہنمائی کر سکتے ہیں اور سائنس کے حوالے سے خدا کی تلاش یا اس بارے میں لب کشائی نہ سائنس اور نہ ہی سائنسدانوں کا کام ہے۔ سائنس محض علمی اوزار کا صندوق toolkit ہے! یعنی سائنسی علوم محض وسائل اور ذریعہ ہیں جو معلومات مہیّا کرتے ہیں اور بس!

تو کسی سائنس دان کا دعویٰ کہ وہ خدا پر یقین نہیں رکھتا اس کا ذاتی خیال ہوتا ہے، اس کا بہ حیثیت مجموعی سائنس کی دریافتوں اور سائنسی ٹیسٹ کے نتائج سے کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ اگر کوئی ایسا تاثّر دیتا ہے تو وہ حقائق کے برعکس ہے بلکہ دروغ گوئی ہے، معذرت کے ساتھ۔ سائنسی علوم تمام انسانیت کی میراث ہیں اور کسی بھی انسان کو ان سے فائدہ اٹھانے یا دلیل حاصل کرنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا کسی بھی ماہر علم یا ماہر طبعیات کو۔ یہ بھی واضح ہوا کہ جدید سائنسدان کائنات کی ابتدا، تخلیق اور اس کے مراحل کے حوالے سے جتنی بھی تحقیق کریں اور اس کی سائنسی توجیہات پیش کریں، وہ بجا طور پر سائنس کے دائرہ کار میں آتی ہیں لیکن جس لمحے یہ سائنسدان ایک قدم آگے بڑھ کر یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ کس نے کائنات نہیں بنائی ـــــ وہیں سے ان کی عقلیں بے راہ رو ہو کر سائنس کے حدود کار سے باہر چلی جاتی ہیں۔ مختصراً یہ واضح ہوا کہ جدید ترین سائنسی علوم، دریافتیں اور سائنسدان جو کسی میڈیکل ٹیسٹ، طبعی تخلیق، آرٹ

کے فن پارے اور کسی کتاب سے متعلق انسان کا تعیّن اور تصدیق نہ کر سکیں بھلا وہ کائنات کے خالق یعنی اللہ کی تصدیق کرنے کے اہل کیسے ہو سکتے ہیں؟

ذرا سوچیں!

خدائی سرگوشیاں اور جدید نظریاتی اشکال سے اقتباس

کیا قوانین فطرت خدا کا متبادل ٹھہرائے جا سکتے ہیں؟

حال ہی میں اسٹیفن ہاکنگ کا ایک انٹرویو شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے دس سوالات کے جواب دیے ہیں۔ان کے پہلے جواب پر تبصرہ پیش خدمت ہے۔ہاکنگ اس میں کہتے ہیں: ''میں نے یہ دعویٰ کبھی نہیں کیا کہ خدا وجود نہیں رکھتا۔ہم اس جہان میں کیوں ہیں؟ یہ سوال جب بھی ایک انسانی ذہن میں اٹھتا ہے تو اس کی توجیہہ کا نام وہ خدا ہی رکھتا ہے۔فرق اتنا ہے کہ میرے خیال میں یہ توجیہہ طبعیاتی قوانین پر مشتمل ہے نہ کہ ایک ایسا وجود جس سے کوئی ذاتی تعلق استوار کرنا ممکن ہو۔میرا خدا ایک غیر شخصی خدا ہے۔[اسٹیفن ہاکنگ]۔

ہاکنگ ان قوانین کو خدا کا نام دے رہے ہیں جن کی بنا پر یہ کائنات بنی، ارتقا پذیر ہوئی اور پھیلتی جا رہی ہے۔اسی طرح ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ خدا کی کوئی ذات نہیں ہے بلکہ ایک قوتِ محرکہ Motive Force اور علت و معلول کا سلسلہ یا علت العلل Cause of Causes ہے، یا یہ کہ قوانین فطرت کا دوسرا نام خدا ہے۔

تبصرہ:

اس کے جواب کے لیے ہمیں اس بات کی تحقیق کرنی چاہیے کہ کیا قوانینِ فطرت اپنے طور پر کوئی سسٹم بنا سکتے ہیں؟ کیا فزیکل لاز بے جان اشیاء سے جاندار تخلیق کر سکتے ہیں؟

ایک امریکی مصنفہ Nancy Pearcy اس کا بہت اچھا جواب دیا کہ کیوں صرف قوانینِ فطرت سے، ڈی این اے میں موجود وسیع تر معلومات کا تخلیق پانا ممکن نہیں۔وہ اپنی کتاب Total Truth میں لکھتی ہیں:

''اصولی طور پر، قوانینِ فطرت معلومات تخلیق نہیں کرتے۔کیوں نہیں؟ کیونکہ قوانین ان واقعات کا پتہ دیتے ہیں جو باقاعدہ ہوں، دہرائے جا سکتے ہوں اور اسی بناء پر ان کا انجام معلوم ہو۔اگر آپ پنسل کو چھوڑیں، تو وہ گر جائے گی۔اگر آپ کاغذ شعلے کی نظر کریں تو وہ جل جائے گا۔اگر آپ پانی میں نمک ملائیں تو وہ حل ہو جائے گا۔یہی وجہ ہے کہ سائنسی طریقہ کار اس بات پر زور دیتا ہے کہ تجربات لازماً اس طرح کیے جائیں کہ وہ دہرائے جا سکتے ہوں۔جب بھی ایک مخصوص حالات دوبارہ پیدا کیے جائیں انجام معین و مخصوص ہو۔ورنہ آپ کے تجربے میں کچھ غلطی ہے۔سائنس کا مقصد ان تسلسلات کو ریاضی کے فارمولاجات میں سمونا ہے۔اسکے برعکس، کسی پیغام میں

الفاظ کی ترتیب کسی مخصوص اصول کے تابع نہیں ہوتی (بلکہ متکلم کی منشاء پر مبنی ہوتی ہے) جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی قانونی عمل کا نتیجہ نہیں ہو سکتا''۔

پھر قوانینِ فطرت صرف باقاعدہ اور دہرائے جانے والے الفاظ ہی پیدا کر سکتے ہیں جن میں معلومات بہت کم ہوتی ہے، مثال کے طور پر ایسے الفاظ ABC ABC ABC ABC ABC:۔ مگر زیادہ وسیع انفارمیشن کو محفوظ رکھنے کے لیے جو کہ حیاتیاتی احکامات (Biological instructions) جاری کرنے کے لیے چاہیے ہوتی ہے، جینیاتی کوڈ کو لازماً بے قاعدہ اور بدلتی ترتیب پر چلنا ہوگا۔ ذیل میں ''بے قاعدہ اور غیر دہرائے جانے والی ترتیب'' کی ایک علامتی مثال جس میں، پچھلی قانونی ترتیبِ الفاظ کی مثال کے مقابلے میں، معلومات بہت زیادہ ہے "In 1492, Christopher Columbus sailed the ocean blue."''''1492 میں، کولمبس نے بحیرہ کا سفر شروع کیا''۔ چنانچہ بے قاعدہ اور غیر دہرائے جانے والی ترتیب پر مبنی DNA کی پیچیدہ ترتیب کا مطلب یہی ہے کہ یہ (دو جمع دو چار کرنے والے) کسی قانون کا نتیجہ نہیں۔

انفارمیشن سائنٹسٹ Henry Quastler اس کو اس طرح بیان کرتے ہیں: ''نئی معلومات کی عادتاً تخلیق کا تعلق شعوری کوشش (conscious activity) سے ہے۔'' جب بھی ہم معلومات کو اس کے ماخذ تک لے جاتے ہیں، لامحالہ، ہم اس شعور/دماغ (conscious mind) تک پہنچ جاتے ہیں۔

Algorithmic Information theory کو زندگی کے آغاز پر منطبق کرنے والی اولین کتاب، Information Theory, Evolution, and the Origin of Life میں، ماہر طبعیات Hubert Yockey اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ریاضی کے قوانین کی رو سے یہ ناممکن ہے کہ قوانینِ فطرت DNA جیسی کوئی چیز تخلیق کر سکیں کیونکہ ان کا انفارمیشن کنٹینٹ بہت کم ہوتا ہے۔ مزید لکھتے ہیں:

''طبعیات اور کیمیا کے اصول فٹ بال کے کھیل کے اصولوں کی طرح ہیں۔ ریفری یہ تو دیکھ سکتا ہے کہ ان قوانین کی پابندی ہو رہی ہے کہ نہیں لیکن وہ یہ نہیں بتا سکتا کہ کھیل کون جیتے گا۔ کھیل کے اصولوں میں اتنی معلومات ہی نہیں ہے کہ ان کی بناء پر پیش گوئی کی جا سکے, اسی لیے ہم کھیل کھیلتے ہیں''۔ ریاضی دان Gregory Chaitin نے طبعیاتی قوانین کا مشاہدہ ان قوانین کو پروگرام کرتے وقت کیا۔ انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ (ان قوانین میں) (Information Content) معلوماتی جز بہت کم ہے۔''

اس اصول کہ حیاتیاتی قوانین طبعیات و کیمیا کے قوانین سے اخذ نہیں ہو سکتے کی وجہ محض یہ سادہ سی بات ہے ان قوانین میں معلومات کا اتنا جز ہی نہیں ہے کہ جس سے کسی سادہ ترین جاندار کی جینیاتی ترکیب ہی تشکیل پا سکے۔ ایک سادہ ترین جینیاتی ترکیب کے لیے بھی درکار معلومات ان قوانین کے انفارمیشن کنٹینٹ سے کہیں بڑھ کر ہے۔ (Information Theory, Evolution, and the Origin of Life)"

2002ء میں، گارڈین اخبار کے مضمون بعنوان) How We Could Create Life ہم زندگی کس طرح تخلیق کر سکتے ہیں؟) میں ماہرِ طبعیات Paul Davies نے اسی طرح کا نکتہ پیش کیا تھا.:

"Trying to make life by mixing chemicals in a test tube is like soldering switches and wires in an attempt to produce [Microsoft] Windows 98. It won't work because it addresses the problem at the wrong conceptual level."

"مختلف کیمیکل کو ایک ٹیسٹ ٹیوب میں مکس کر کے کسی جاندار کی تخلیق کی کوشش ایسا ہی عمل ہے جیسے سوئچ اور تاریں جوڑ کر کمپیوٹر ونڈو (Windows 98) کے بننے کی توقع کی جائے۔ یہ عمل بے سود ہے کیونکہ یہ نفس مسئلہ کو غلط ذہنی اپروچ سے لے رہا ہے۔"

خلاصہ یہ کہ محض فزیکل لاز اپنے طور پر نا کوئی سسٹم/نظام ترتیب دے سکتے ہیں نا کوئی جسم تخلیق کر سکتے ہیں اس کام کے ایک شعور/ذہن، ایک کانشیٹ مائنڈ چاہیے۔ کائنات کا اتنا کمپلیکس نظام اور انواع اقسام کی مخلوقات کی موجودگی ایک ذہین ڈیزائنر کی موجودگی ہی کی گواہی دیتی ہے۔!

☆ ہاکنگ کی بات کا ایک اور پہلو:

جب ایک سائنس دان دنیا کو دیکھتا ہے تو اسے کائنات مخصوص قوانین میں چلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ چنانچہ وہ اس شخصی اور رینڈم خدا کا انکار کر دیتا ہے۔ دیکھا جائے تو ہاکنگ اور کچھ ماہر طبیعات کو خدا کے اسی تصور سے مسئلہ ہے جس میں خدا ایک ایسے جادوگر کی طرح کام کرتا ہے جو جب چاہے، جو چاہے کر دے۔ جو کسی قاعدے اور قانون کے ذریعے کام کرنے کا عادی نہ ہو وغیرہ۔ یہ تصور خدا اسلامی نہیں بلکہ کچھ اہل مذہب کا یہ ذاتی فہم ہے۔ ہم قرآن اور دیگر آسمانی کتب اور مذہبی لٹریچر کا مطالعہ کریں تو علم ہوتا ہے کہ خدا رینڈم ایکٹ نہیں کرتا۔ خدا کے تخلیق کرنے اور کام کرنے انداز بالکل اسی پیٹرن پر نظر آتا ہے جس پر ہم کائنات کو دیکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آسمان و زمین چھ دن یا

ادوار میں وجود میں آئے۔ جیسا کہ قرآن میں سورہ فصلت میں بیان ہوتا ہے: کہو کیا تم اس سے انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو دن میں پیدا کیا۔ اور اس کا مد مقابل بناتے ہو۔ وہی تو سارے جہان کا مالک ہے ﴿۹﴾ اور اسی نے زمین میں اس کے اوپر پہاڑ بنائے اور زمین میں برکت رکھی اور اس میں سب سامان معیشت مقرر کیا چار دن میں۔ (اور تمام) طلبگاروں کے لیے یکساں ﴿۱۰﴾ پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دھواں تھا تو اس نے اس سے اور زمین سے فرمایا کہ دونوں آؤ خوشی سے خواہ ناخوشی سے۔ انہوں نے کہا کہ ہم خوشی سے آتے ہیں ﴿۱۱﴾ پھر دو دن میں سات آسمان بنائے اور ہر آسمان میں اس کا حکم بھیجا اور ہم نے آسمان دنیا کو چراغوں سے مزین کیا اور محفوظ رکھا۔ یہ زبردست (اور) خبردار کے (مقرر کیے ہوئے) اندازے ہیں ﴿۱۲﴾ ان آیات پر دوبارہ غور کریں تو ایک پراسیس سامنے آتا ہے۔

دیکھا جائے تو ایک کے بعد ایک کام تدریج کے ساتھ ہو رہا ہے۔ یہ ایک مثال ہے جو مادّی دنیا سے متعلق ہے۔ دوسری جانب روحانی اور غیر مرئی دنیا کو دیکھیں تو وہاں بھی خدا رینڈم ایکٹ نہیں کرتا۔ اس نے فرشتوں کی ایک بیوروکریسی بنائی ہوئی ہے، اعمال کے لکھنے کے لیے کراماکاتبین ہیں اسی طرح دنیا میں کمیونی کیشن کا کام جبریل، کائنات میں مادّی طاقتوں کو کنٹرول کرنے کا کام میکائل کے ذمے ہے، موت کے لیے عزرائیل ہیں۔ ان دونوں مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالی نے باقاعدہ تدریج کے ساتھ اس کائنات کو تخلیق کیا۔ ایسا نہیں ہوا کہ اللہ نے کن کہا اور یہ چیزیں فوراً وجود میں آگئیں۔ اللہ چاہتا تو ایسا کر سکتا تھا لیکن اللہ نے اس تخلیق کو تدریج اور قوانین کے ساتھ اسی لیے تخلیق کیا۔

ایک چیز کو خدا نے تخلیق کیا ہے۔ اس کے لیے طریقۂ کار کیا ہے؟ یہ طریقۂ تخلیق دراصل تکوین ہے۔ شروعات سے لے ارتقا کے جو جو منازل طے کر کے دنیا وجود میں آئی ہے یہ تخلیقِ عالم کے مراحل ہیں۔ ''کن'' کوئی جادو نہیں ہے جسے ادا کیا گیا اور کائنات معرض وجود میں آئی۔ بلکہ یہ ایک ایسا امر ہے جس سے تخلیق کی شروعات ہوتی ہے اور عالم درجہ بدرجہ ترقی کر کے حصولِ غایت کی منازل طے کرتا ہوا وجود پذیر ہوتا رہتا ہے۔ یہی تکوین ہے۔ فیکون سے مراد یہی مراحل ہیں۔ یہ صرف ''ہو جانے'' کا نہیں بلکہ ''ہوتے رہنے'' کا نام ہے۔ چنانچہ اِس سے یہ سارے سوالات اپنے آپ ہی حل ہو جاتے ہیں کہ کس چیز کی تخلیق میں کتنا وقت لگا اور کیوں لگا۔ اسے زمانی اور مکانی تشریح میں قید کیا ہی نہیں جا سکتا۔ کیونکہ زمانہ خود اضافی حالت میں تجربے کا حصہ بنتا ہے۔ چھ ایام چھ کروڑ سال بھی ہو سکتے ہیں۔ اور ایک سیکنڈ کا کوئی کروڑواں حصہ بھی۔ لیکن یہ سارے حالات اس نظامِ تخلیق کی تحت وجود میں آتے ہیں جو اس غایتِ کاملہ کے حصول کے لیے بنایا گیا ہے۔

استفادہ تحریر: سکاٹ ینگرین، ڈاکٹر محمد عقیل، ڈاکٹر مزمل شیخ بسمل

تخلیقِ کائنات اور رچرڈ ڈاکنز

ولیم پیلے (William Paley (1743–1805 ایک عیسائی متکلم ہیں کہ جنہوں نے خدا کے وجود کے اثبات میں Natural Theology or Evidences of the Existence and Attributes of the Deity کے عنوان سے ایک معرکۃ الآراء کتاب لکھی۔اس کتاب نے اپنے دور کے سب سے بڑے دہریے ڈیوڈ ہیوم کے افکار کو لگام ڈال دی تھی۔ یہ کتاب 1920 تک کیمبرج یونیورسٹی کے نصاب میں رہی ہے۔ پوپ نے غالبا 1972 میں اسے عیسائیت کی دلیل کی کتاب قرار دیا۔ ''پیلے'' کی کتاب کا خلاصہ گھڑی ساز سے مشابہت کی دلیل ''Watchmaker Analogy'' کہلاتا ہے۔یعنی اگر ایک گھڑی، کسی گھڑی ساز کے بغیر نہیں ہو سکتی اور ٹیلی سکوپ کسی موجد کے بغیر نہیں ہو سکتی تو کائناتی گھڑی اور آنکھ کسی خالق کے بغیر کیسے ہو سکتے ہیں؟ کیونکہ دونوں اپنے نظام میں پیچیدہ ہیں۔

چارلس ڈارون سے لے کر رچرڈ ڈاکنز تک ہر بڑے دہریے نے ''پیلے'' کی اس دلیل کا جواب دینا چاہا ہے۔ڈارون کو کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپ ڈیٹڈ نہیں تھا،اور بھائی، رچرڈ ڈاکنز کا'' پیلے'' کی دلیل پر ردپڑھیں اور سر دھنیں؛

Paley’s argument is made with passionate sincerity and is informed by the best biological scholarship of his day, but it is wrong, gloriously and utterly wrong. The analogy between telescope and eye, between watch and living organism, is false. All appearances to the contrary, the only watchmaker in

nature is the blind forces of physics, albeit deployed in a very special way. A true watchmaker has foresight: he designs his cogs and springs, and plans their interconnections, with a future purpose in his mind's eye. Natural selection, the blind, unconscious, automatic process which Darwin discovered, and which we now know is the explanation for the existence and apparently purposeful form of all life, has no purpose in mind. It has no mind and no mind's eye. It does not plan for the future. It has no vision, no foresight, no sight at all. If it can be said to play the role of watchmaker in nature, it is the blind watchmaker

[Richard Dawkinz, The Blind Watchmaker, p. 55]

بھئی ڈاکنز تم میں اور'' پیلے ''میں فرق کیا ہے۔''گھڑی ساز ''تو تم نے بھی مان ہی لیا ہے۔'' پیلے ''کہتا ہے کہ وہ''سمیع بصیر'' ہے اور تم کہتے ہو کہ وہ''اندھا بہرا'' ہے۔'' پیلے ''کہتے ہیں کہ وہ گھڑی ساز''حکیم'' ہے۔ تم کہتے ہو کہ ''اس کے پاس عقل ہی نہیں ہے۔''

*توجیہہ کائنات کی' سائنسی دیومالا'

آج سے کھربوں سال قبل مادہ خود بخود برقوں اور پروٹونز کی شکل میں فضائے بسیط میں ہر طرف پھیلا ہوا تھا (یہ اور بات ہے کہ کسی نے اس کیفیت کا تجربہ نہیں کیا)، مادے کے اس خفیف بادل میں خود بخود ایک خفیف سا خلل واقع ہوا (جس کا بھی تجربہ نہیں ہوا) اور نتیجتا قوانین علل کے تحت مادہ سمٹ سمٹ کر مختلف جگہوں پر خود بخود جمع ہونا شروع ہو گیا، مادے کے ان ٹھوس اجماع کو ہم سیارے وغیرہ کہتے ہیں (معلوم نہیں اس غیر متحرک مادے میں حرکت کیوں کر آئی جس کے اسباب نہ تو اس مادے کے اندر تھے اور نہ ہی اسکے باہر، اور ایک بے ربط ابتدائی حالت سے مربوط قوانین علل کیوں کر وجود میں آگئے اور وہ کیونکر اسی طرز پر چلے)۔ یہ اسی اتفاقی حادثے کا نتیجہ ہے کہ سورج چاند اور یہ بے شمار سیارے خود بخود وقت مقرر پر سفر طے کرتے رہتے ہیں۔ اس وسیع و عریض کائنات میں قریب قریب یکساں موسمی حالات جیسے بے شمار سیاروں کے باوجود زندگی صرف ایک حقیر سے سیارے یعنی زمین پر اور وہ بھی خود بخود وجود میں آگئی،

اوران بے شمار سیاروں میں سے صرف زمین پر ہی زندگی ممکن بنانے والے تمام حالات خود بخود جمع ھو گئے۔

پھر کائنات کے صرف اس ہی حقیر سے کرے پر سوچنے سمجھنے والی ایک مخلوق (انسان) مادی ارتقاء کے نتیجے میں خود بخود وجود میں آ گئ (معلوم نہیں اب یہ ارتقائ عمل کیوں ختم ھو گیا کہ اب ملین کی تعداد میں بندر انسان نہیں بن پاتے)اور یہ عمل کھربوں برس سے خود بخود چلتا ہی چلا جارہا ھے (سوائے اس 'خود بخود خود بخود ھونے' کے اس سلسلے کے جو نہ جانے کیوں اب بند ہو گیا) نیز اسکا کوئ مقصد نہیں (تو پھر یہاں بے معنی زندگی کو معنی دینے کی کوشش فاترالعقلی کے سواءاور کیا ہے؟)۔

کیا یہ پوری دیومالا کسی تجربے یا مشاہدے پر تعمیر کی گئ؟ کیا اسکے مختلف اجزاء باہم مربوط و متصور ہیں؟ یقیناً اس دیومالا کو رد کرنے کیلیے کسی پیچیدہ علمی دلیل نہیں بلکہ صرف دماغی توازن ٹھیک ہونا ضروری ہے۔.

سوال یہ ہے کہ جب کائنات میں صرف غیر متحرک مادہ تھا،اس کے سوا کوئی چیز موجود نہ تھی تو یہ عجیب و غریب اتفاق کہاں سے وجود میں آ گیا جس نے ساری کائنات کو حرکت دے دی جس واقعہ کے اسباب نہ مادہ کے اندر موجود تھے اور نہ مادہ کے باہر وہ واقعہ وجود میں آیا تو کیسے آیا۔اس توجیہہ کا یہ نہایت دلچسپ تضاد ہے کہ ہر واقعہ سے پہلے ایک واقعہ کا موجود ہونا ضروری قرار دیتی ہے جو بعد کو ظاہر ہونے والے واقعہ کا سبب بن سکے مگر اس توجیہہ کی ابتدا ایک ایسے واقعہ سے ہوتی ہے جس سے پہلے اس کا سبب موجود نہیں۔یہی وہ بے بنیاد مفروضہ ہے جس میں کائنات کی اتفاقی پیدائش کے نظریہ کی پوری عمارت کھڑی کر دی ہے۔

یہ کائنات اگر محض اتفاق سے وجود میں آئی ہے تو کیا واقعات لازمی طور پر وہی رخ اختیار کرنے پر مجبور تھے جو انہوں نے اختیار کیا۔کیا اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا تھا۔؟

کیا ایسا ممکن نہیں تھا کہ ستارے آپس میں ٹکرا کر تباہ ہو جائیں۔مادہ میں حرکت پیدا ہو جانے کے بعد کیا یہ ضروی تھا کہ محض حرکت نہ رہے بلکہ ایک ارتقائی حرکت بن جائے۔؟اور حیرت انگیز تسلیل کے ساتھ موجودہ کائنات کو وجود میں لانے کی طرف دوڑنا شروع کر دے۔؟آخر وہ کون سی منطق تھی جس نے ستاروں کے وجود میں آتے ہی ان کو لا متناہی خلا میں نہایت باقاعدگی کے ساتھ پھیرانا شروع کر دیا۔؟پھر وہ کون سی منطق تھی جس نے کائنات کے ایک بعید ترین گوشہ میں نظام شمسی کو وجود دیا؟؟وہ کون سی منطق تھی جس سے ہمارے کرہ زمین پر وہ عجیب و غریب تبدیلیاں ہوئیں جن کی وجہ سے یہاں زندگی کا قیام ممکن ہو سکا اور جن تبدیلیوں کا سراغ آج تک

کائنات کی بے شمار دنیاؤں میں سے کسی ایک دنیا میں معلوم نہ کیا جاسکا ہے۔۔؟وہ کون سی منطق تھی جو ایک خاص مرحلہ پر بے جان مادہ سے جاندار مخلوق پیدا کرنے کا سبب بن گئی۔۔؟

کیا اس بات کی کوئی معقول توجیہہ کی جاسکتی ہے کہ زمین پر زندگی کس طرح اور کیوں وجود میں آئی اور کس قانون کے تحت مسلسل پیدا ہوتی چلی جارہی ہے۔۔؟

وہ کون سی منطق تھی جس نے کائنات کے ایک چھوٹے سے رقبہ میں حیرت انگیز طور پر وہ تمام چیزیں پیدا کر دیں جو ہماری زندگی اور ہمارے تمدن کے لئے درکار تھیں؟؟ پھر وہ کون سی منطق ہے جو ان حالات کو ہمارے لئے باقی رکھے ہوئے ہے۔؟؟

کیا محض ایک اتفاق کا پیش آجانا اس بات کی کافی وجہ تھی کہ یہ سارے واقعات اس قدر حسن و ترتیب کے ساتھ مسلسل پیش آتے چلے جائیں اور اربوں و کھربوں سال تک ان کا سلسلہ جاری رہے اور پھر بھی ان میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔؟؟

کیا اس بات کی کوئی واقعی توجیہہ کی جاسکتی ہے کہ محض اتفاق سے پیش آجانے والے واقعہ میں لزوم کی صفت کہاں سے آگئی اور اتنے عجیب و غریب طریقہ پر مسلسل ارتقاء کرنے کا رجحان اس میں کہاں سے پیدا ہو گیا۔؟؟

استفادہ تحریر زاہد مغل و حافظ زبیر، وحید الدین خان

تخلیق کائنات اور سٹیفن ہاکنگ

کسی فرد یا گروہ کے بنیادی عقائد کا تعلق اس کے کائنات اور زندگی کی تخلیق کے نظریے سے بہت گہرا ہوتا ہے لہٰذا کسی بھی معاشرتی ڈاکٹرائن یا نظریہ حیات کی بنیاد ٹھوس عقلی اور علمی دلائل پر ہونی چاہیے، کیونکہ جدید معاشرتی نظریات سیکولرازم، لبرل ازم اور ان کے محرّک سائنسی نظریات کائنات کے خالق کا انکار کرتے ہیں لہٰذا ان کا طائرانہ جائزہ لینا ضروری ہے تاکہ ان کے فلسفے کی عقلی بنیاد کی مضبوطی کا تعیّن ہو سکے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ سائنسی اور جدید ہونے کا دعویٰ کرنے والے لبرل ازم اور سیکولرازم کی اخلاقی اور نظریاتی بنیادیں اگر ہیں تو کتنی مضبوط ہیں؟

کائنات کیسے بنی؟

کائنات اور زندگی کی تخلیق کے حوالے سے ان نظریات حیات کی بنیادیں سائنس اور سائنسی دریافتوں پر استوار تو ہیں مگر یہ اساس کتنی کھوکھلی یا مضبوط ہیں اس کا اندازہ جدید ایم تھیوری M-Theory سے لگایا جا سکتا ہے۔ گو کہ سائنس ٹھوس حقائق پر ہی انحصار کرتی ہے لیکن یہ تھیوری سائنسی مفکّرین کے خوابی تخیّلات کی مثال ہے۔ سپر اسٹرنگ تھیوریز Super-String-Theories کو یکجا کر کے سائنسدان ایک نئی تھیوری پر کام کر رہے ہیں جسے ایم۔ تھیوری کا نام دیا جا رہا ہے۔ اس مشترکہ تھیوری کی بنیاد خلا کے چند حقیقی مظاہر یعنی کانٹم غیر یقینی Quantum-uncertainity-، کرَوڈا سپیس(Curved-Space)، سپر سمٹری Super-Symmetry، کوارک Quark ، اسٹرنگ String اور ملٹی ڈائمنشن Multidimension پر مبنی ہے۔ ایم تھیوری

فریم ورک میں ان سب کو مدغم کیا جارہا ہے۔ایم تھیوری کائنات کے خود بخود وجود میں آنے کے تخیّل کو ایک منطقی جواز دینے کی کاوش ہے۔ یہ انتہائی پیچیدہ ہے اور اس کو عام انسان نہیں سمجھ سکتا. اس کے لیے فزکس کا ماہر ہونا ضروری ہے۔اس کو مختصراً یوں سمجھیں کہ انتہائی پیچیدہ سائنسی مساوات کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر ہم 500 کو 500 سے 10 دفعہ ضرب در ضرب دیتے چلے جائیں تو اس کے حاصل کے برابر کائناتیں خود بخود بنیں اور فنا ہوئیں ! یعنی لاتعداد۔ آکسفرڈ یونیورسٹی میں سٹیون ہاکنگ کے کولیگ ماہر طبیعات سر راجر پینروز کے مطابق ہاکنگ کی گرینڈ ڈیزائن میں پیش کی گئی ایم تھیوری تھیوری بھی نہیں بلکہ یہ آئیڈیاز، امیدوں اور خواہشوں کا مجموعہ ہے۔انکی یہ ویڈیو دیکھیے۔

اب تخلیق کے مرحلے کی سائنسی روداد کا بھی مختصر سا جائزہ لیتے ہیں۔اپنی کتاب دی گرینڈ ڈیزائن کے صفحہ 226 پر اسٹیون ہاکنگ لکھتے ہیں،

''اگر کائنات کی کل توانائی کو ہمیشہ صفر ہی رہنا ہے اور کسی جسم کی تخلیق کے لیے توانائی ہی ضروری ہے تو کائنات کی تخلیق نیست nothing سے کیسے ہو سکتی ہے؟اس کے لیے ضروری ہے کہ وہاں پر کشش ثقل gravity کا قانون ہو کیونکہ ثقل میں کشش اور ثقل کی توانائی منفی ہے۔ یہ منفی توانائی اس مثبت توانائی کو متوازن کر سکتی ہے جو مادّے کی تخلیق کے لیے ضروری ہے، لیکن یہ اتنا آسان نہیں ہے''۔یہی سائنسدان اسی کتاب کے صفحہ 227 پر رقمطراز ہیں: ''کیونکہ ایک قانونِ کشش ثقل موجود ہے تو کائنات نیست nothing سے اپنے آپ کو خود تخلیق کر سکتی ہے اور کرے گی'' !

۔ذرا غور کریں کہ بقول ان کے تخلیق سے قبل جب کچھ نہیں تھا تو نیست nothing میں کشش ثقل کا قانون کیسے موجود ہوا؟یعنی عدم میں اگر کوئی قانون موجود تھا تو وہ ماحول عدم یا نیست nothing نہیں ہو سکتا۔مزید یہ کہ کشش کا تو تعلق ہی مادے کے موجود ہونے سے ہے، مادہ ہے تو کشش ہے ورنہ کشش نہیں۔اور اگر وہاں کشش ہے تو وہ نیست nothing نہیں۔

یہی سائنسدان اسی صفحے پر آگے لکھتے ہیں،

''یہ اچانک تخلیق Spontaneous-creation ہی ہے کہ جس کی وجہ ہے یہاں نیست nothing کے بجائے کچھ something ہے۔کائنات کیوں موجود ہے اور ہم کیوں موجود ہیں، اس کے لیے خدا کو بیچ میں لانے کی ضرورت نہیں کہ جس نے کوئی نیلا کاغذ سلگا کر کائنات کو چلا دیا۔''

ارے جناب آپ خود ہی تو فرما رہے ہیں کہ کائنات خود بنی مگر باہر سے کشش کی قوّت کی موجودگی سے تو یہ بھی تو بتائیں کہ یہ قوّت (اس) تخلیق سے پہلے کیسے موجود ہوئی؟ یہ تضاد کیسا؟

یہاں پر مذہب اور خدا سے کوئی دیرینہ بغض صاف عیاں ہے کیونکہ سائنس دانوں کے پاس اچانک تخلیق کا کوئی ٹھوس مواد نہیں ہے تو یہ زبردستی فرض کر لیا گیا ہے کہ کائنات کی ابتدا سے پہلے ایک قانون کشش ثقل موجود تھا۔ یہ کسی نظریے کو زبردستی ٹھونسنے یا کھینچ تان کر سائنسی بنانے کی منفرد مثال ہے جو بذات خود غیر سائنسی، غیر منطقی اور غیر عقلی ہے۔ اسے جدید سائنس کا تخلیق کائنات کا انتہائی غیر منطقی مفروضہ hypothesis ہی کہا جا سکتا ہے۔

اگر اس کا دوسرا استدلال یہ لایا جائے کہ بگ بینگ کے اندر قانون کشش ثقل موجود تھا لہٰذا تخلیق ہوئی، تو پھر آپ نیست کو زیر بحث ہی کیوں لا رہے ہیں؟ اس جملے میں نیست یا nothing کا تذکرہ ہی ظاہر کرتا ہے کہ تخلیق کائنات میں کسی بیرونی قوّت کے اثرانداز ہونے کو سائنس قبول کرنے پر مجبور ہے۔ تو وہ قوّت تو ابھی تلاش کرنی ہے نا!

تخلیقِ کائنات کی سائنسی تشریح:

"کیونکہ قانونِ کشش ثقل کی وجہ سے کائنات خود بخود بن سکتی ہے لہٰذا اس عمل سے لاتعداد کائناتیں بنتی، ٹوٹتی اور فنا ہوتی رہیں لیکن ہماری کائنات اُن لاتعداد میں ایک ہے جو فنا نہیں ہوئی۔ بے شمار کائناتوں کی تخلیق اور فنا کے دوران کسی ایک کا قائم رہ جانا امکانات میں ہے! یہ ایک اتفاق ہے اور قانون امکان Law-of-probability کے تحت ممکن ہے، طبعی قوانین، فطری قوّتیں اور زندگی بھی ماحولیاتی اتّفاق سے وجود میں آئے۔ سارا نظام کائنات انہی طبعی قوانین پر چل رہا ہے۔"

یہ کتنا عقلی اور منطقی ہے خود فیصلہ کر لیں۔

تخلیق کائنات کی مذہبی تشریح:

مندرجہ بالا تشریح کا ماحصل یہ بھی تو ہوا کہ اگر کوئی قوّت یعنی کشش کائنات کے وجود سے پہلے بھی موجود تھی جس کے اثرانداز ہونے سے کائنات بنی ہے تو سائنس اس کو کوئی بھی نام دے ہم اسے لامحدود قوّت والی ہستی کا اذن کہتے ہیں۔ یہ تو اللہ کی لامحدود ہستی کا ارادہ تھا جس نے کائنات تخلیق کی اور اس کے نظام کو چلانے کے قوانین بنائے جن کو ہم آفاقی قوانین کہتے ہیں۔ کشش یا کوئی مخفی بیرونی کردار اس

لیے موجود ہو گا کہ اس کی تخلیق پہلے کی گئی ہو گی یعنی یہ ایک تخلیقی پراسس کا حصہ رہا ہو گا۔۔یہی منطقی اور عقلی استدلال ہے جو سائنسی توجیہ میں مفقود ہے۔سائنس ایک طرف خدا سے لاتعلّقی کا اظہار کرتی تو دوسری طرف مجبوری میں اشارتاً قبول بھی کرتی ہے۔

اب اس اہم مسئلہ کے کچھ اور پہلوؤں کو بھی دیکھتے ہیں کہ کائنات کا نظام بظاہر عام فہم ہے اور فطرت کے تمام مظاہر وغیرہ ہر انسان کے لیے سمجھنا آسان ہیں اور فطری طور پر عام انسان خدا ہی کو خالق مانتا ہے لیکن دوسری طرف سائنسی طور پر ہم اس کائنات کی ابتدا کی ایسی تشریح نہیں دیکھتے ہیں کہ عام انسان آسانی سے سمجھ لے۔،ہمیں علمیت کی گہرائی میں آخر جانا ہی کیوں پڑ رہا ہے؟مادّہ پرستوں سے سوال ہے کہ اگر کائنات اور زندگی ایک حادثہ یا اتفاق ہے تو: کیا کائنات اپنا کوئی ذہن بھی لے کر پیدا ہوئی کہ انسان کے ساتھ آنکھ مچولی کر رہی ہے؟کیا نیچر انسان سے زیادہ ذہین ہے؟نیچر میں علم کے ذخائر کہاں سے وارد ہو رہے ہیں؟جن اہم سوالوں میں سائنس تشریح سے بے بس ہے وہ بھی ملاحظہ کریں۔

۱۔خیالات کے اجراء کا منبع کیا ہے۔

۲۔ایٹم میں قوّت کہاں سے آتی ہے۔

۳۔کائنات میں موجود قوّتیں کہاں سے آئی ہیں۔

۴۔انسان اور حیوان بوڑھے کیوں ہوتے ہیں۔

۵۔انسان کی خواہش اور اس کے عمل میں کیا طبعی تعلق ہے۔

۶۔روشنی کے پارٹیکلز یعنی فوٹون اتنی رفتار سے کیوں اور کیسے سفر کرتے ہیں۔

انسانیت کے رہنما:

سوال یہی ہے کہ کیا انسانیت کی نظریاتی رہنُمائی ان چند لوگوں پر چھوڑی جاسکتی ہے جن کے اخلاص پر تو ہم شبہ نہیں کرتے کیونکہ وہ علمِ طبعیّات کے اصولوں کے حساب سے ہی تحقیق کر رہے ہیں لیکن غور طلب یہ بات ہے کہ ایک غیر یقینی اور غیر مصدّقہ نظریہ کس طرح انسانوں کے لیے مفید اور دائمی نظریہ حیات کی بنیاد بن سکتا ہے؟

جدید لامذہب فلسفے جن کی بنیاد مادیّت ہے مثلاًلبرل ازم، سیکولرازم اور جمہوریت انسانیت کی رہنمائی کے ارفع مرتبہ پر فائز ہونے کے اس لیئے اہل نہیں کیونکہ یہ انتہائی کمزور علمی بنیاد پر ایستادہ ہیں، انکے پاس انسان اور کائنات کے موجود ہونے سے متعلّق کوئی معقول عقلی نظریہ ہے ہی نہیں۔اسی لیئے جدید معاشرتی نظریات انسان کو نہ تو ٹھوس حیاتی فلسفہ دیتے ہیں اور نہ ہی اخلاقیات کی کوئی مستند بنیاد بتاتے ہیں بلکہ خود انسان ہی کو برتر قرار دے کر اسے جمہوریت کے ذریعے ہر قانون اور اخلاق کی تشریح کا خو گر بناتے ہیں جو بے شمار خرابیوں کی بنیاد ہے۔

در حقیقت یہ جدید نظریات انسان کو محض علمی اور نظریاتی بحث میں الجھا کر اسکی منزل کو دھندلا دیتے ہیں کیونکہ اگر انسان اپنے آپ کو صرف فطرتی اور طبعی ماحول سے جوڑتا ہے تو اخلاقیات کی وہ تمام بنیادیں اپنا جواز کھو دیتی ہیں جو الہٰامی احکامات کی روشنی میں متعیّن ہوئی ہیں۔اس کی بہترین مثال ان لامذہب نظریات اور اصولوں یعنی سیکولرازم اور لبرل ازم پر معاشرہ تعمیر کرنے والے وہ مغربی ممالک ہیں جہاں پر مادّی ترقّی تو بے مثال ہے لیکن دوسری طرف اب ایسے قوانین بن چکے ہیں جس میں مرد کی مرد سے شادی قانونی قرار دے دی گئیں ہیں اور جہاں مرد اور عورت بغیر نکاح کے قانونی طور پر رہ سکتے ہیں!

اب آگے مزید کیا ہو سکتا ہے عیاں ہے!

استفادہ تحریر مجیب الحق حقی

خدااور سٹیفن ہاکنگ-آخر یہ کس کی تخلیق ہے ؟ڈاکٹر جان لینکس آکسفرڈ یونیورسٹی

کافی عرصہ پہلے ایک بلاگر دوست عدنان مسعود صاحب نے آکسفرڈ یونیورسٹی کے ماہر ریاضیات پروفیسر ڈاکٹر جان لینکس کی شہرہ آفاق کتاب ''خدااور اسٹیفن ہاکنگ, آخر یہ کس کی تخلیق ہے ؟ کے ترجمے کا کام شروع کیا تھا۔ معلوم نہیں وہ کہاں تک پہنچے،اس کتاب کا پیش لفظ، ابتدائی تعارف اور باب اول کا کچھ حصہ ترجمہ کرکے انہوں نے اپنے بلاگ پر بھی شائع کیا تھا۔اللہ انکو جزائے خیر دے۔ ہم انکے شکریے کیساتھ اس ترجمے کو اپنے اس سلسلے میں شامل کررہے ہیں۔ یہ ایک عظیم سائنسدان کی طرف سے مذہب اور سائنس کی مصنوعی کشمکش جو ملحدین نے پیدا کردی ہے 'پر ایک جاندار تبصرہ ہے۔اس کتاب کا مکمل مطالعہ نفع بخش ہوگا۔

☆پیش لفظ

میں نے یہ مختصر کتاب اس اُمید کے ساتھ تحریر کی ہے کہ یہ قارئین کو خدااور سائنس سے متعلق بحث کو سمجھنے میں مدد فراہم کرے گی۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے پوری کوشش کی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو تکنیکی اُمور سے صرفِ نظر کرتے ہوئے دلیل تک محدود رہوں۔ میں سمجھتاہوں ہم میں سے جنہوں نے ریاضی اور فطری سائنسز میں تعلیم حاصل کررکھی ہے اُن کی ذمہ داری ہے کہ سائنس کی عمومی تفہیم بیان کریں۔ خاص طور پر اس بات کی نشاندہی کرنا ہمارا فرض ہے کہ سائنسدانوں کا ہر بیان سائنسی حقیقت نہیں ہوتی ہے اس لیے وہ معتبر سائنس پر سند نہیں بن جاتے اگرچہ وہ سند اکثر غلط طور اُن سے منسوب کی جاتی ہے۔ بے شک اس کا اطلاق اتنا ہی مجھ پر بھی ہوتا ہے جتنا کسی اور پر ہوتا ہے' اس لیے میری قارئین سے گزارش ہے کہ میری ہر دلیل کی بغور جانچ پڑتال کریں۔ میں ایک ریاضی دان ہوں اور یہ کتاب ریاضی کے بارے میں نہیں ہے پس کسی بھی ریاضیاتی نتیجے کا درست ہونا جس کو میں نے ثابت کیا ہو اس بات کی ضمانت نہیں دیتا کہ

میں نے کہیں اور جو کچھ کہا ہے وہ بھی درست ہو گا۔ تاہم مجھے اپنے قارئین کی صلاحیت پر بھروسہ ہے کہ وہ کسی بھی دلیل کا اس کے خلاصے تک تعاقب کریں گے۔ لہٰذا میں یہ کہتا ہوں کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا فیصلہ میرے قارئین کریں گے۔

☆تعارف

خدا ان دِنوں موضوعِ بحث ہے، ہمیں یہ یقین دلانے کے لیے سائنسدانوں نے ان عنوانات کے تحت ایک کے بعد دوسری کتاب لکھی کی ہے، جیسے فرانسز کولنز کی ''خدا کی زبان''، رچرڈ ڈاؤکنز کی ''خدا کا فریب''، وکٹر اسٹینجر کی ''خدا: ناکام مفروضہ''، رابرٹ ونسٹن کی ''خدا کی کہانی'' وغیرہ وغیرہ۔ ان میں سے بعض کتابوں نے ''بیسٹ سیلرز'' کا درجہ پایا ہے کیوں کہ لوگ یقیناً یہ جاننا چاہتے ہیں کہ سائنسدان کیا کہہ رہے ہیں۔ اور یہ حیران کن نہیں ہے کہ کیونکہ ہمارے بناوٹی جدید دنیا میں سائنس زبردست ثقافتی اور دانشورانہ اختیار کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی ایک وجہ ٹیکنالوجی کی تخلیقات کی غیر معمولی کامیابی ہے جن سے ہم سب فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اس کی اور بڑی وجہ اس کی متاثر کن صلاحیت ہے جس نے ہمیں عجائباتِ عالم کی عمیق بصیرت عطا کی ہے جس کا ابلاغ ٹیلی وژن کی خوبصورت ڈاکیومنٹریوں کے ذریعے کیا جاتا ہے۔

بہت سارے لوگ جو بخوبی آگاہ ہیں کہ سائنس کی فراہم کردہ مادی ترقی ان کی گہری انسانی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتی، اب سائنسدانوں کی طرف متوجہ ہو کر یہ جاننا چاہتے ہیں کہ وہ اُن کے وجود سے جُڑے بڑے سوالات کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ ہم یہاں کیوں ہیں؟ ہمارا مقصدِ زندگی کیا ہے؟ ہم کہاں جا رہے ہیں؟ کیا صرف یہی کائنات ہے جس کا وجود ہے یا پھر اس سے آگے بھی کچھ ہے؟

اور یہ سوالات لامحالہ ہمیں خدا کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ پس ہم کروڑوں لوگ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ سائنس خدا کے بارے میں کیا کہتی ہے؟ مذکورہ بالا 'بیسٹ سیلرز' کتابوں میں سے بعض دہریوں کی تصنیف کردہ ہیں۔ لیکن یہ اہم بات ہے کہ یہ تمام دہریوں کی تصنیف نہیں ہیں۔ پس درحقیقت یہ ایک بہت ہی بچگانہ حرکت ہو گی ہے کہ اس بحث کو سائنس اور مذہب کے درمیان تصادم قرار دے کر قلم زد کر دیا جائے۔

اس تصورِ ''مخالفت'' کو بہت پہلے ہی غیر معتبر قرار دیا جا چکا ہے۔ مثال کے طور پر ہماری فہرست میں موجود پہلے مصنف، فرانسز کولنز کو ہی لے لیجیے جو امریکا میں نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ہیلتھ کے ڈائریکٹر اور ہومین جینوم (لونیت) پروجیکٹ کے سابق سربراہ ہیں۔ اس پروجیکٹ کے سربراہ کے طور پر ان کا پیشرو جم واٹسن کو (فرانسز کریک کے ساتھ مشترکہ طور پر) ڈی این اے کے دو مخنی ساخت کی دریافت پر

نوبل انعام سے نواز جاچکا ہے۔ کولنز ایک عیسائی جبکہ واٹس ایک دہریہ ہیں۔ یہ دونوں اعلیٰ پایے کے سائنسدان ہیں، جو اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ دراصل یہ ان کی سائنس نہیں تھی بلکہ دنیا کے بارے میں اُن کا تصور تھا جس نے ان کو تقسیم کیا۔ اگرچہ یہ ایک حقیقی تنازعہ ہے لیکن یہ سائنس بمقابلہ مذہب نہیں ہے۔ یہ خدا پرستی اور الحاد کے درمیان ہے اور سائنس دان دونوں طرف ہیں۔ اور یہی چیز اس بحث کو مزید دلچسپ بناتی ہے کیوں کہ ہم ایک حقیقی سوال پر توجہ مرکوز کر سکتے ہیں۔ کیا سائنس خدا کی طرف اشارہ کرتی ہے' اس سے دور لے کر جاتی ہے یا یہ خدا کے مسئلہ میں غیر جانبدار ہے؟

یہ چیز بالکل واضح ہے۔ خدا کی ذات میں دلچسپی میں یہ غیر معمولی اضافہ دراصل سیکولرائزیشن کے نام نہاد مفروضہ کو چیلنج کرتا ہے جس نے 'روشن خیالی' کے بعد بہت جلد بازی میں یہ قیاس کر لیا کہ مذہب بالآخر تنزلی کا شکار ہو کر ختم ہو جائے گا، یا پھر کم از کم یورپ سے اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ درحقیقت، یہ بعینہ سیکولرائزیشن کی متصور ناکامی ہے جو خدا کے سوال کو ایجنڈے سے زیادہ اہمیت دے رہا ہے۔ 'خدا کی واپسی (God is Back)' کے مصنفین اکانومسٹ کے ممتاز صحافیوں جان میکلتھ ویٹ اور اڈریان ولڈرریگ کے مطابق مذہب صرف ناخواندہ لوگوں کے لیے نہیں ہے بلکہ دنیا کے اکثر حصوں میں بعینہ وہ بڑھتا ہوا متحرک تعلیم یافتہ متوسط طبقہ اب عقیدہ کی اس گاڑی کو چلا رہا ہے جس کے متعلق مارکس اور ویبر نے یہ قیاس کر لیا تھا کہ وہ اس طرح کے توہمات کو ختم کر دے گا۔ یہ خاص پیش رفت قابل فہم طور پر سیکولر طبقہ، خاص طور پر ان میں موجود دہریوں کو غضب ناک کرنے کا سبب بنا ہے۔

یہ احتجاج یورپ میں زیادہ شدید ہے شاید اس لیے کہ دہریوں کے خیال میں یورپ وہ جگہ ہے جہاں انہوں نے زیادہ کچھ کھویا ہے۔ وہ غالباً درست سمجھتے ہیں' اور ایسی علامات ہیں جن کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ یورپ میں پسپائی اختیار کر رہے ہیں۔ رچرڈ ڈاؤکنز، جو اب تک ایک جتھے کے رہنما ہیں کا احتجاج بڑھتا ہوا تیز سے کرخت کے درجے میں داخل ہو چکا ہے کیوں کہ اس کی دلیل کی منطق شکستگی سے دوچار ہو چکی ہے' کم از کم یہ دکھائی دیتا ہے، حتیٰ کہ اس کے بہت سارے ساتھی دہریوں نے بھی اس کو محسوس کیا ہے۔ وہ اپنے اس عقیدے کی تبلیغ کے لیے مریدوں کی بھرتی کے ذریعے ''عوامی شعوری سطح بڑھانے'' کے لیے پر عزم ہیں کہ صرف دہریت ہی دنیا میں قابل احترام دانشورانہ نقطہ نظر ہے۔

اس کی مہم بسوں پر پوسٹرز چپکانے اور بچوں کے لیے موسم گرما کے دہریت کیمپوں کے انعقاد تک جا پہنچی ہے۔ اور یقیناً گریبانی کوٹ پر سرخ رنگ کے بڑے بیجز جن پر دہریوں کے لیے اے رقم تھا وہ بھی بھولنے والی چیز نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اعلیٰ مہارت و ذہانت سے

ڈیزائن کی گئیں ٹی شرٹس بھی اس کی تیار کردہ تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس کی اِس مہم سے اُس کا کوئی تعلق تھا یا نہیں لیکن اسی مہم کے دوران دہریوں کے کورس میں اسٹفین ہاکنگ کی طاقت ور سائنسی آواز کا اضافہ ہوا۔ اور دنیا ان ہیڈلائنز سے بھر گئی کہ ''اسٹیفن ہاکنگ کہتا ہے کہ کائنات خدا کی تخلیق نہیں ہے''، ''اسٹیفن ہاکنگ کہتا ہے کہ فزکس نے خدا کے لیے کوئی جگہ نہیں چھوڑی ہے'' اور یہی باتیں مختلف تغیرات کے ساتھ پیش ہو رہی تھیں۔

ان ہیڈلائنز میں ہاکنگ کی نئی تصنیف ''گرینڈ ڈیزائن'' کا حوالہ دیا جا رہا تھا جو اس کی لیونارڈ لوڈینو کے ساتھ مشترکہ تحریر تھی۔ یہ کتاب بہت جلد 'بیسٹ سیلز' کی فہرست میں سب سے اوپر چلی گئی۔ ہاکنگ کے قد کاٹھ کی دانشورانہ شخصیت کی طرف سے دہریت کے عوامی اعتراف نے اس بحث پر فوری اثر ڈالا۔ یہ بحث بہت ساری کتابوں کی فروخت کا سبب بھی بنی۔

ہمیں کیا سوچنا ہے؟ اگر ایسا ہے، تو پھر؟ کیا بحث کے لیے مزید کچھ باقی نہیں بچا؟ کیا تمام علمائے مذہب کو فوراً مستعفی ہو جانا چاہیے؟ کیا چرچ کے تمام کارکنوں کو اپنی ٹوپیاں لٹکا کر گھروں کو روانہ ہونا چاہیے؟ کیا فزکس کے عظیم ماسٹر نے کائنات کے عظیم مصور کو شہ مات دے دی؟

خدا کو چلتا کرنے کا دعویٰ یقیناً مبالغہ آرائی تھی۔ آخر کار ماضی کے عظیم سائنسدانوں کی اکثریت خدا پر یقین رکھتی تھی۔ اور بہت سارے اب بھی رکھتے ہیں۔ کیا گلیلیو، پلر، نیوٹن اور میکس وِل خدا کے معاملے میں غلطی پر تھے؟

جب اتنا کچھ خطرے میں ہو تو ہمیں یقیناً ہاکنگ سے کہنا چاہیے کہ وہ اپنے دعویٰ کے حق میں ثبوت پیش کریں۔ کیا اس کے دلائل کی جانچ پڑتال نہیں ہونی چاہیے؟ میرے خیال میں ہمیں جاننے کا حق ہے۔

لیکن ہم اُس وقت تک جان نہیں سکتے جب تک ہم اس کو دیکھ نہ لیں۔

پس آیئے ہم یہی کرتے ہیں۔

باب اول: بڑے سوالات

اسٹیفن ہاکنگ بلاشبہ اس وقت دنیا کے سب سے مشہور سائنسدان ہیں۔ وہ حال ہی میں کیمبرج کے لیوسیشین پروفیسر شپ کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ یہ وہ منصب ہے جس پر کبھی سر اسحٰق نیوٹن براجماں رہے۔ ہاکنگ نے یہ مقام بہت امتیاز کے ساتھ حاصل کیا ہے۔

ان کو ملکہ عالیہ نے 'اعزازی ساتھی' بنادیا اور ان کا تعلیمی کریئر پوری دنیا سے حاصل ہونے والے اعزازت سے مزین ہے۔ وہ صبر و برداشت کے بھی ایک علامت رہے ہیں کیوں کہ وہ چالیس سال سے زیادہ عرصے تک اعصابی بیماری کی تباہ کاری کو سہنے کے باوجود فارغ نہیں بیٹھے۔ بیماری کا زیادہ تر عرصہ انہوں نے ویل چیئر پر گزارا جبکہ ان کو ابلاغ کے لیے خاص طور پر ڈیزائن کردہ صوتی تالیف کار آلہ (سینتھائزر) پر انحصار کرنا پڑتا تھا جس کو بہت جلد دنیا بھر میں ایک قابل شناخت ''آواز'' کے طور پر پہچانا جانے گا۔ اپنے بہت سے ممتاز ساتھیوں اور شاگردوں کے ساتھ مل کر ہاکنگ نے ریاضیاتی طبعیات کی سرحدوں کو دریافت کیا خاص طور پر سیاح سوراخوں کی رازوں کا ان کا مخالف وجدان قابل ذکر ہے۔ یہ کام ''ہاکنگ تابکاری'' کی پیش گوئی پر منتج ہوا تھا، جس کی اگر تجربے کے ذریعے تصدیق کی جاتی تو وہ نوبل انعام کے حقدار قرار پاتے۔

ان کی ہاتھوں ہاتھ بکنے والی سب سے زیادہ فروخت والی کتاب ''وقت کی مختصر تاریخ'' میں ہاکنگ بنیادی طبعیات کی پیچیدہ دنیا کو کافی کی میز پر لے آئے (اگرچہ بہت سارے لوگ اس سے زیادہ مواد کی تلاش کا اعتراف کر چکے ہیں)۔ اس کتاب کے بعد اسی سطح کی کئی اور کتابیں سامنے آئیں جن میں عظیم سائنس کے رموز نے قارئین کے وسیع حلقے کو بہت زیادہ متاثر کیا۔

چونکہ ان کتابوں کا تعلق کائنات کی ابتدا/ تخلیق سے ہے 'اس لیے ان کو لازمی طور پر خالق کے وجود کے موضوع کو زیر غور لانا چاہیے تھا۔ تاہم انہوں نے اس موضوع پر تشنگی کو باقی رکھنے کے لیے ''وقت کی مختصر تاریخ'' کو بہ تکرار پیش کیے جانے والے بیان ''کہ اگر طبعیات کو ہر چیز کے تصور (وہ تصور جس نے فطرت کی چار بنیادی قوتوں 'مضبوط اور کمزور جوہری طاقتوں' برقناطیسیت اور کششِ ثقل) کو تلاش کرنا ہوتا تو ہم خدا کے ذہن کو پہچانتے'' کے ساتھ ختم کیا۔

اپنی تازہ ترین تصنیف ''عظیم ڈیزائن'' جو انہوں نے لیونارڈ ولیڈونو کے ساتھ مشترکہ طور پر تحریر کی ہے میں ان کی محتاط طبعی/کم گوئی غائب ہوگئی ہے اور انہوں نے کائنات کی الٰہی تخلیق کے عقیدے کو چیلنج کیا ہے۔ ان کے مطابق یہ خدا کی خواہش نہیں بلکہ طبعیات کے قوانین ہیں جو کائنات کی تخلیق کے بارے میں وضاحت فراہم کرتے ہیں۔ وہ دلیل دیتے ہیں کہ بگ بینگ (بِگ بینگ موجودہ آفاقی ماڈل کے بارے میں اوائل کی وضاحت کرنے والا ایک نظریہ ہے 'مترجم) ان قوانین کا منطقی نتیجہ تھا ''کیوں کہ یہ کشش ثقل کے قانون کی طرح کا قانون ہے کہ کائنات خود کسی چیز کے بغیر خود کو تخلیق کر سکتی اور کرتی ہے۔''

''عظیم ڈیزائن'' کا عنوان بیشتر لوگ کے نزدیک ''عظیم ڈیزائنر کی بات کرتا ہوگا'' لیکن دراصل یہی وہ بات ہے جس سے انکار کے لیے اس کتاب کو ترتیب دیا گیا ہے۔ ہاکنگ کا عظیم خلاصہ ہے کہ ''خودرو تخلیق اس بات کی دلیل ہے کہ نہ ہونے سے پہلے کوئی چیز ہے' کائنات قائم ہے' ہم کیوں زندہ ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ نیلے ٹچ کاغذ کو روشن کرنے کے لیے خدا کو بلایا جائے تو کائنات کام کرنا شروع کر دے گی''۔

میں چاہتا ہوں کہ اس کتاب میں ہاکنگ کی سائنس نہیں اس پر بات کروں جو اس نے خدا کے وجود یا عدم وجود کے بارے میں اس کتاب سے اخذ کیا ہے۔ اگرچہ ہاکنگ کی اس دلیل کو کہ سائنس غیر ضروری طور پر خدا کو دکھاتا ہے' کو انقلابی قرار دے کر سراہا گیا لیکن یہ دلیل نئی ہر گز نہیں ہے۔ برسوں تک دیگر سائنسدان اسی طرح کے دعوے کرتے رہے ہیں، جنہوں نے کہا کہ ہمارے ارد گرد دنیا کی رعب دار، جدید پیچیدگی کی صرف کائنات (کمیت/توانائی) کے بنیادی شے کے حوالے سے تشریح کی جاسکتی ہے یا پھر طبیعاتی قوانین، جیسے کشش ثقل کا قانون جو کائنات کے رویے کی وضاحت کرتا ہے۔

اس کتاب پر صرف ایک نظر ڈالنے سے یہ پتہ چلانا مشکل ہے کہ ہاکنگ کی یہ نئی کتاب اس کی تصنیف 'وقت کی مختصر تاریخ'' میں کیسا اضافہ کرتی ہے۔ عظیم ڈیزائن ان بڑے سوالوں کی ایک فہرست سے شروع ہوتی ہے جو لوگ اکثر پوچھتے تھے: ''ہم اپنے آپ کو جس دنیا میں پاتے ہیں اس کو کیسے سمجھ سکتے ہیں؟ کائنات کیسا برتاؤ کرتی ہے؟ حقیقت کی فطرت کیا ہے؟ یہ سب کچھ کہاں سے آیا ہے؟ کیا کائنات کو کسی خالق کی ضرورت تھی؟'' ایسے معروف شخص کے طرف سے آئے یہ سوالات اس خیال کو مضبوط تر بناتے ہیں کہ بین الاقوامی سائنسدان مابعد الطبعیات سے متعلق اِن عمیق سوالات کے بارے میں کس طرح کی فہم و فراست رکھتا ہے۔ بہر حال ان سوالوں کی جو ہم سب وقتاً فوقتاً پوچھتے ہیں ایک عظیم دماغ کی طرف سے وضاحت اور جواب بہر حال بڑی مسحور کن بات معلوم ہوتی ہے۔

فلسفے کا ایک ناکافی تصور:

اگر یہ ایسا ہی ہے جس کی ہمیں توقع ہے تو ہم صدمے سے دوچار ہیں کیوں کہ آگے کے الفاظ میں ہاکنگ فلسفے کو مسترد کرتے ہیں۔ اپنے سوالات کی فہرست کا حوالہ دیتے ہوئے موصوف رقم طراز ہیں ''روایتی طور پر یہ سوالات فلسفے کے لیے ہیں لیکن فلسفے کی موت ہو چکی ہے۔ اس کو سائنس' خاص کر طبعیات میں جدید ترقی کے ساتھ جاری نہیں رکھا گیا ہے۔ نتیجتاً سائنسدان علم کی دریافت میں ہمارے مشعل بردار بن چکے ہیں۔'' فلسفہ کو (وہ مضمون جس کو ان کی اپنی کیمبرج یونیورسٹی میں نمائندگی اور وقعت دی گئی) مسترد کرنے کے اس

بے جا زعم سے قطع نظر یہ پریشان کن ثبوت فراہم کرتا ہے کہ کم از کم ہاکنگ جیسے ایک سائنسدان نے بذات خود فلسفے کو اتنی اہمیت نہیں دی جس سے ان کو احساس ہوتا کہ پوری کتاب میں وہ خود اس کے ساتھ مصروف رہے ہیں''۔

پہلی بات میں نے یہ محسوس کی کہ ہاکنگ کا فلسفے کے بارے میں بیان دراصل خود ایک فلسفیانہ بیان ہے۔ یہ بدیہی طور پر سائنسی بیان نہیں ہے' یہ سائنس کے بارے میں خالص فلسفیانہ بیان ہے۔ اس لیے اس کا بیان کہ فلسفہ کی موت ہو چکی ہے اپنی ہی تردید کرتا ہے۔ یہ منطقی بے ربطی کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔

فلسفے کی طرف ہاکنگ کا رویہ نمایاں طور ہر البرٹ آئن سٹائن کے اس خط کے برعکس ہے جس میں انہوں تاریخ اور سائنس کے فلسفے سے طبعیات تک تعلیم کی حمایت کی تھی۔ ''میں آپ کے ساتھ طریقیات کے علاوہ تاریخ اور سائنسی فلسفے کی تعلیمی قدر و اہمیت پر متفق ہوں۔ آج بہت سارے لوگ اور حتیٰ کے پیشہ ور سائنسدان مجھے اس فرد کی طرح دکھائی دیتے ہیں جس نے ہزاروں درختوں کو دیکھا ہوتا ہے لیکن کبھی جنگل نہیں گیا۔''

تاریخ کا علم اور فلسفیانہ پس منظر ان تعصبات سے پاک رکھتی ہیں جن میں اس کے نسل کے اکثر سائنسدان مبتلا تھے۔ میرے خیال میں فلسفیانہ بصیرت کی بدولت حاصل ہونے والی اہلیت تعصبات سے آزادی ایک محض ماہر اور سچ کے حقیقی متلاشی کے درمیان لکھیر کھنچتی ہے''

مزید برآں، ہاکنگ کا بیان کہ ''سائنسدان دریافت کے مشعل بردار بن چکے ہیں'' سائنسیت سے ٹکراؤ ہے جو کہتی ہے کہ سائنس صرف سچ کی طرف ایک راستہ ہے۔ یہ سیکولر فکر کی اس تحریک کی نظریاتی خصوصیت ہے جس کو ''نئی دہریت'' کے نام سے جانا جاتا ہے اگرچہ یہ خیال صرف اس لحاظ سے نیا ہے کہ اب اس کو دانشورانہ مواد کی صورت کے بجائے جارحانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ سائنسی دنیا کے ایک سپر اسٹار کو تو چھوڑیے ایک عام سائنسدان کے لیے یہ بات عقلمندی والی معلوم نہیں ہوتی کہ وہ ایک طرف فلسفے کی تحقیر کرے اور پھر فوراً غیر معمولی فلسفیانہ موقف اختیار کرے خاص کر جب اس کو قارئین کو قائل کرنے کے لیے ترتیب دی گئی کتاب کی ابتدا میں پیش کیا جائے۔

نوبل لیوریت سر پیٹر میداوار نے اس خطرے کی نشاندہی پہلے ہی اپنی کتاب 'نوجوان سائنسدانوں کو مشورہ'' میں کر دی تھی جو تمام سائنسدانوں کو لازمی پڑھنا چاہیے۔ ''کسی سائنسدان کے لیے اپنے اور اپنے پیشے کی ساکھ کو خراب کرنے کا اس سے تیز طریقہ نہیں ہو سکتا

کہ وہ صاف صاف اعلان کر دے، خاص کر اس وقت جب اس طرح اعلان کی ضرورت نہ ہو کہ سائنس ہر سوال کا جواب جانتی ہے یا جلد جان جائے گی اور وہ سوال جن کو سائنسی جواب نہیں مل پاتے وہ کسی طرح غیر سوال یا جعلی سوال ہیں جو کوئی بے ہی وقوف پوچھتا ہے اور صرف ایک اجڈ ہی اس کا جواب دینے کا دعویٰ کرے گا۔'' میداوار آگے رقم طراز ہیں۔ ''تاہم سائنس کی حد کا وجود ان بچگانہ اور عنصری سوالات جن کا تعلق پہلی اور آخری چیزوں سے ہوتا ہے سے واضح ہو جاتا ہے جیسے ''ہر چیز کی شروعات کیسے ہوئی؟'' ''ہم یہاں کس لیے ہیں؟ آخری زندگی رہنے کا مقصد کیا ہے؟'' وہ آگے لکھتا ہے کہ ان سوالات کے جوابوں کے لیے ہمیں تصوریاتی ادب اور مذہب کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔

فرانسز کولنز پر بھی یکساں طور پر سائنس کی حدود واضح ہیں۔ وہ لکھتے ہیں سائنس ان جیسے سوالوں کا جواب دینے میں بے بس ہے کہ 'دنیا کیوں وجود میں آئی؟ انسانی وجود کے معانی کیا ہیں؟ مرنے کے بعد کیا ہوگا؟''

میداوار اور کولنز صریحاً سائنس کے بارے میں پر جوش ہیں۔ پس ہمیں اعلیٰ سطح پر مخلص سائنسدانوں میں کوئی بے ربطی نہیں دکھائی دیتی جبکہ وہ بیک وقت یہ ادراک کر لیتے ہیں کہ سائنس ہر سوال کا بشمول کچھ گہرے سوالات کے جو ایک انسان پوچھ سکتا ہے جواب فراہم نہیں کر سکتی ہے۔ مثال کے طور یہ بات بڑے پیمانے پر تسلیم شدہ ہے کہ سائنس میں اخلاقی اساس کا پایا جانا بہت ہی مشکل ہے۔ البرٹ آئن سٹائن نے اس کو واضح طور پر دیکھا تھا۔ ۱۹۳۰ میں برلن میں سائنس اور مذہب کے بارے میں ایک بحث کے دوران انہوں نے کہا کہ خوبصورتی کا انسانی احساس اور ہماری مذہبی جبلتیں استدلالی صلاحیتوں کو عظیم کامیابیوں کے طرف لے جانے میں معاون ہوتی ہیں۔ آپ بجا طور پر سائنس کی اخلاقی بنیادوں کی بات کرتے ہیں لیکن آپ یک دم پلٹ کر اخلاقیات کی سائنسی بنیادوں کی بات نہیں کر سکتے ہیں۔''

آئن سٹائن اس نکتے پر پہنچ گئے کہ سائنس اخلاقیات کی بنیاد فراہم نہیں کرتی۔ ''اخلاقیات کی سائنسی فارمولے کی سطح پر کمی کی ہر کوشش ناکام ہوگی''

رچرڈ فین مین نے جو خود بھی نوبل انعام جیتنے والے ماہر طبیعات ہیں آئن سٹائن کے ان خیالات سے اتفاق کیا ہے ''حتیٰ کے عظیم قوتیں اور اہلیت بھی ان کو استعمال کرنے کی ہدایات فراہم کرتی دکھائی نہیں دیتی۔ مثال کے طور پر علم کا عظیم مجموعہ کہ طبعیاتی دنیا جس طرح کا برتاو کرتی ہے صرف اس پر قائل کرتی ہے کہ یہ رویہ بے معنی قسم کا ہے۔ سائنس براہ راست اچھائی یا برائی نہیں سکھاتی۔'' ایک اور جگہ وہ لکھتے ہیں ''اخلاقی قدریں سائنس کے دائرہ کار سے باہر ہوتی ہیں''

تاہم ہاکنگ اس کا انکار کرتے دکھائی دیتے ہیں جب وہ سائنس کو وہ کردار تفویض کرتے ہیں جو اس کی استعداد سے بڑھ کر ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ فلسفے کی بے توقیری کرنے کے بعد اسی کے ساتھ مصروف ہو جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ سائنس کی تعریف اور اطلاق ان حتمی سولات پر بھی کرتے ہیں جیسے خدا کا وجود، اس طرح ہاکنگ مابعد الطعبیات پر گفتگو کرتے ہیں۔ اب ہمیں یہ وضاحت کرنے دیں کہ میں اس کے لیے ہاکنگ کو قصوروار نہیں ٹھیراتا، میں خود اس پوری کتاب میں مابعد الطعبیات کے پر گفتگو کرتا رہوں گا۔ میرا اعتراض تو یہ ہے کہ وہ اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے۔

۔۔ جان لینکس نے مشہور ملحد رچرڈ ڈاکن کی کتاب دی گاڈ دیلوین کے جائزے پر بھی یہ کتاب لکھی

"God's Undertaker: Has Science Buried God?" by John Lennox

Antidote to Richard Dawkin's rejuvenated attack against God, "The God Delusion"

ترجمہ عدنان مسعود

زمین پر زندگی کیسے شروع ہوئی؟رچرڈ ڈاکنز

رچرڈ ڈاکنز کی ایک ویڈیو پچھلے دنوں مشہور ہوئی جس میں ان سے پوچھا گیا کہ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ زمین پر زندگی کیسے شروع ہوئی ہو گی؟ تو انہوں نے جواب دیا، ''ایک سیل سے''۔اُن سے مکرر پوچھا گیا کہ وہ سیل کہاں سے آیا ہو گا؟ تو انہوں نے جواب دیا، ''ممکن ہے کسی اور نظامِ شمسی کے کسی اور سیارے پر زندگی کی ترقی ہماری ترقی سے لاکھوں سال پہلے ہوئی ہو اور وہ ارتقائیں ہم سے لاکھوں سال آگے ہوں۔ ممکن ہے انہوں نے زندگی کی ایک ایسی شکل ڈیزائن کی ہو جیسی ہمارے سیارے پر ہے اور انہوں نے ہی ہمارے سیارے پر سیڈنگ یعنی زندگی کا بیج بویا ہو''

رچرڈ ڈاکنز کو جدید ''ماڈرن ویسٹرن کیپٹالسٹ ایتھزم'' کا باباآدم مانا جاتا ہے۔ خدا کا انکار اُن کی زندگی کا سب سے بڑا مشن رہا ہے۔ لیکن مذکور بالا انٹرویو میں انہوں نے علی الاعلان تسلیم کیا ہے کہ ممکن ہے ہمارے سیارہ زمین پر موجود زندگی کسی ذہین مخلوق کے ذہن کی تخلیق ہو۔اتنا تسلیم کر لیا تو گویا کمتر درجے کا سہی لیکن ہمارے لیے ایک ذہین خالق تسلیم کر لیا۔ایسے ہی موقع پر کہا جاتا ہے، ''کم از کم''۔ سو کم از کم رچرڈ ڈاکنز یہ تسلیم کرتے ہیں کہ زمین پر موجود زندگی کا سارا پروگرام کسی ذہین خالق کا بنایا ہوا ہو سکتا ہے۔

اب پیچھے رہ جاتا ہے، وہ خدا جسے کسی نے نہیں بنایا۔ جو خود سے ہے۔ جو ازل سے ہے اور ہمیشہ رہیگا۔ جو حی و قیوم ہے۔ جو سب سے بڑی عقل کا مالک ہے۔ سو اُس خدا کے وجود سے ہنوز رچرڈ ڈاکنز کو انکار ہے۔ مجھے یونہی خیال آرہا تھا کہ ٹیکنکلی رچرڈ ڈاکنز کے خیال اور مذہب کے خیال میں چنداں فرق نہیں۔

رچرڈ ڈاکنز اِس کائنات کے بارے میں یہ مانتے ہیں کہ اِسے کسی نے نہیں بنایا۔ یہ خود سے ہے۔اور اسی کائنات نے سیارے پیدا کیے اور ان میں زندگی اور ذہانت پیدا کی۔ سٹرنگ تھیوری کے بعد رچرڈ ڈاکنز اس امکان کو بھی رد نہیں کر سکتے کائنات (عالمین) ایک نہیں کئی ہیں۔ نظریہ اضافیت کے بعد رچرڈ ڈاکنز اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ کسی شخص کا ایک منٹ کسی اور شخص کے کئی سالوں کے برابر بھی ہو سکتا ہے۔ ڈاکنز خود مائیکرو بیالوجسٹ ہیں۔ وہ ڈی این اے کے انٹیلیجنٹ لینگوئج ہونے، اس میں تبدیلیوں کے امکان، میوٹیشن کے مافوق العقل وجود اور نئی نئی مخلوقات کی پیدائش سے کب انکار کر سکتے ہیں؟انسان کبھی مکمل طور پر نان وائلنٹ مخلوق بن کر کسی خوشنما باغ

میں ایسے رہ رہا ہو کہ اُسے ہزاروں سال موت نہ آئے، اس امکان سے بھی ایک مائیکرو بیالوجسٹ عہدِ حاضر میں انکار نہیں کر سکتا۔اس سب پر مستزاد یہ ایک خاصی مشہور تھیوری بھی ہے کہ یہ کائنات سانس لیتا ہوا ایک ذہین فطین جاندار ہے جو فورتھ ڈائمینشنل ہے۔ علاوہ بریں ''پین سپر میا'' بھی ایک تھیوری ہے کہ کائنات حیات سے چھلک رہی ہے اور خلا میں اڑتے ہوئے پتھروں میں بھی ڈی این اے یا ابتدائی حیات کے امکانات مضمر ہیں۔

پھر سوچتا ہوں ڈاکنز کا اصل مسئلہ خدا نہیں ہے۔ نہ ہی مذہب ہے اور نہ ہی مذہبی ہونا ہے۔ ڈاکنز اور اس کے ماننے والوں کا اصل مسئلہ وہ ''سیٹ آف رُولز'' ہے جسے نظامِ حیات کہتے ہیں۔ مذہب بھی ایک سیٹ آف رُولز پیش کرتا ہے۔ جسے کمانڈ منٹس کہا جاتا ہے۔ ڈاکنز اور اس کے ماننے والوں کو اُس سیٹ آف رُولز کے ساتھ اختلاف ہے۔ مزید باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو یہ اختلاف بنیادی طور پر نظریۂ علم کا اختلاف ہے یعنی ایپسٹمالوجی کا۔ مذہب کے نزدیک ''وحی'' ایک برتر سورس آف نالج یعنی ایک ایسا ذریعۂ علم ہے جو ہمارے کمتر شعور کے لیے ہمیشہ رہنما کا کام دے سکتا ہے۔ دہریت کو یہ خیال مکمل طور پر نان اکیڈمک لگتا ہے۔ یہ بات بھی غلط نہیں کہ یہ سارا خیال حسی علوم کی ترقی کے بعد اکیڈمک محسوس ہونے لگا یہی کوئی سترھویں صدی عیسویں سے لے کر اب تک۔ اس سے قبل چونکہ حسی علوم کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا تو دنیا کا ٹوٹل وِژن ہی مختلف تھا۔

غرض یہ مذہب نہیں جس کے پاس بھاگ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں بچا۔ بلکہ یہ دہریت ہے جس کے پاس بھاگ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں بچا۔ کیونکہ اب اس تھیوریز کے رَش کے دور میں کہ جب ''لاز آف سائنس'' کی پیدائش کا زمانہ گزر چکا ہے اور ''تھیوریز آف سائنس'' کی شدت کا زمانہ چل رہا ہے کون انکار کر سکتا ہے کہ حسی سائنس چند دہائیاں بھی مزید اپنے پیروں پر کھڑی رہ سکتی ہے۔ سائنس پر عقلیت (ریشنلزم) پوری طرح غلبہ پانے کے قریب ہے اور وہ دن دُور نہیں جب حسیّت (امپرسزم) کے مقابلے میں دوبارہ عقلیت دنیا پر راج کرنے لگے۔ تب پھر سے ایک بار دنیا بدل جائے گی۔ دہریت کا نام و نشان تک نظر نہ آئے گا۔ اور وحی کی مابعد الطبیعات کو ایک بار پھر ریاضیاتی عقیدت کا درجہ حاصل ہو جائیگا۔ یہ الگ بات ہے کہ تب وحی کس شئے کو سمجھا جائے گا، کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ ممکن ہے بولتی ہوئی فطرت کو ہی کل وحی سمجھ کر ایک دہریت زدہ نیا مذہب سامنے آجائے۔

اگر سوچیں تو برکلے، ہیگل، کانٹ جیسے لوگ آئن سٹائن سے کم دماغ نہ تھے۔ خود آئن سٹائن کے ہی دور میں نیلز بوھر جیسے سائنسدانوں کا اعتقاد حسیت سے اُٹھ چکا تھا۔ اقبال نے تشکیل کے دیباچے میں لکھا ہے کہ ''وہ دن دُور نہیں جب مذہب اور جدید سائنس میں ایسی ایسی

مفاہمتیں دریافت ہونے لگیں گی کہ جو ہماری سوچ سے بھی ماروائیں، کیونکہ جدید فزکس نے اپنی ہی بنیادوں کی تدوین شروع کر دی ہے"(مفہوم)۔

ادریس آزاد

مذہبِ سائنس (الحادی) کی شدت پسندانہ روش کا جائزہ

فی زمانہ سائنس کی حیثیت کسی مضبوط مذہب کے جیسی ہے۔ کوئی مضبوط مذہب اپنے عہد میں یوں پہچانا جاسکتا ہے کہ اُس کے ماننے والے کھلم کھلا اپنے عقائد کا اظہار کر سکیں اور باقی لوگ اُن سے فی الواقعہ مرعوب ہوں۔ دورِ حاضر میں مذہبِ سائنس کے ماننے والے عام طور پر کہہ دیتے ہیں، "آئی ڈونٹ بیلیو اِن گاڈ، آئی بیلیو اِن سائنس"۔ اور یوں سائنس ایک مذہب ہے۔ یہ مقدمہ خاصا طویل ہے اور تمام قضیات یہی نتیجہ اخذ کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ سائنس فی الواقعہ ایک مذہب ہے۔ یہ ایک بِیلیف سسٹم ہے جو اب پوری دنیا میں پھیل چکا ہے۔ چنانچہ ہم کیسے یقین حاصل کرینگے کہ وہ سائنس جسے ہم "تحقیق کا فقط ایک طریقہ کار" مانتے تھے اور یہ سائنس جو عقائد کا ایک مکمل نظام ہے دونوں میں سے کون درست ہے اور دونوں میں سے فی زمانہ کس کا راج ہے؟

مسئلہ یہ ہے کہ جب کوئی سائنسی نظریہ مقبول ہو جاتا ہے تو وہ خود بخود پوری دنیا کے انسانوں کے ذہنوں میں گھر کر جاتا ہے اور یوں بعض سائنسی نتائج وقت کے ساتھ ساتھ عقائد کا درجہ اختیار کر لیتے ہیں۔ انیسویں صدی کے اواخر سے لے کر اب تک سائنس ایک طریقِ تحقیق سے بڑھ کر عقائد کے ایک نظام کی شکل اختیار کر چکی ہے اور اگر فلسفیانہ طور پر عقائد کے اس نظام کا جائزہ لیا جائے تو ہم اِسے عموماً نام دیتے ہیں، میٹیریل ازم

جدید سائنسی ذہن کی نظر میں سائنس مقدس ہے اور اس کے مقابلے میں وہ کتابیں جنہیں کبھی مقدس سمجھا جاتا تھا ناپاک ہو چکی ہیں۔ اگر ہم کبھی سائنسی عقائد پر غور کریں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ اُن میں بھی ویسے ہی نقائص پائے جاتے ہیں جیسے مذہبی عقائد میں ڈھونڈے جاتے ہیں۔ رُوپرٹ شیلڈریک (Rupert Sheldrake) نے رچرڈ ڈاکنز کی کتاب، "گاڈ ڈیلوژن" کے جواب میں ایک کتاب لکھی جس کا نام رکھا، "سائنس ڈیلوژن"۔ اِس کتاب میں رچرڈ ڈاکنز کے ہی طریقِ استدلال کو مدنظر رکھا گیا اور سائنسی عقائد کے ساتھ وہی سلوک کیا گیا جو ڈاکنز نے مذہبی عقائد کے ساتھ کیا۔ نتیجہ حیران کن تھا۔ سائنس کے سب بنیادی عقائد عین اُنہی اعتراضات کی زد میں آرہے تھے جو "گاڈ ڈیلوژن" میں ڈاکنز نے خدا اور مذہبی عقائد پر کیے تھے رپرٹ کا ویڈیو لیکچر سائنس ڈیلوین۔

رُپرٹ نے سائنس کے دس بنیادی عقائد کو باقی عمومی سائنس سے الگ کر کے اُن کا جائزہ لیا۔ سائنس کے اِن بنیادی عقائد پر رُپرٹ نے سائنٹفک طریقِ کار کے مطابق ہی نگاہ ڈالی تو اُن میں سے کوئی اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کا اہل نہیں تھا۔ رُپرٹ نے کہا کہ یہ دس عقائد وہ ہیں جنہیں بہت زیادہ پڑھے لکھے لوگوں کا ''ڈیفالٹ وِیو'' کہا جا سکتا ہے۔ وہ دس عقائد یہ ہیں،

۱۔ نیچر مکینکل یعنی کسی مشین کی طرح ہے۔ کائنات ایک مشین کی طرح ہے۔ جانور اور پودے مشینوں کی طرح ہیں۔ ہم مشینوں کی طرح ہیں۔ ہم دراصل روبوٹس ہیں جنہیں جینیٹکلی پروگرام کیا گیا ہے۔

۲۔ مادہ بے شعور ہے۔ یہ ساری کائنات ایسے مادے سے بنی ہے جس میں شعور نہیں ہے۔ ستاروں، سیّاروں، کہکشاؤں، جانوروں، پودوں حتیٰ کہ ہم میں خود شعور نہیں ہے۔ چونکہ مادہ بے شعور ہے اِس لیے فطرت کے قوانین طے شدہ اور متعین ہیں۔

۳۔ فطرت کے قوانین آج بھی وہی ہیں جو بگ بینگ کے وقت تھے اور یہ قوانین ہمیشہ ایسے ہی رہینگے۔ صرف قوانین ہی نہیں بلکہ وہ تمام کانسٹینٹس (constants) جیسے کہ بِگ جی (G) یا روشنی کی رفتار وغیرہ بھی متعین اور طے شدہ ہیں اور کبھی نہیں بدل سکتے۔

۴۔ مادے اور انرجی کی کل مقدار ہمیشہ ایک رہتی ہے۔ یہ مقدار کبھی نہیں بدلتی۔ بس صرف اس وقت یہ مادہ اور توانائی نہیں تھے جب بگ بینگ نہیں ہوا تھا لیکن جب ہو گیا تو اس کے بعد سے انرجی اور مادے کی کل مقدار ہمیشہ ایک رہتی ہے اور رہیگی۔

۵۔ فطرت کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ فطرت مقصد کے بغیر ہے۔ نیچر پر پَز لیس ہے۔ ارتقا کا بھی کوئی مقصد نہیں ہے۔ ارتقا کسی سے ہدایات لیے بغیر وقوع پذیر ہوا ہے سو یہ اَن گائڈڈ ایوولیوشن ہے۔

۶۔ ہر وہ شئے جو ہمیں وراثت میں ملتی ہے ایک میکانزم کی پابند ہے۔ ہم جینٹک کوڈ کے طور پر جو کچھ وصول کرتے ہیں وہ مادیت کے اُصولوں پر کاربند ہے۔ ایک مشین کی ترقی کا یہ پہلو کہ وہ جینٹک کوڈز کے ذریعے اپنے جیسی نئی مشینیں بنا سکتی ہے خالصتاً سائنسی بایں ہمہ غیر شعوری اور خودکار عمل ہے۔

۷۔ یاداشتیں ہمارے دماغ کے اندر محفوظ ہیں۔ جو کچھ بھی ہمیں یاد ہے یا بھول گیا وہ سب مادی سطح کی میموری ڈسک میں محفوظ رہتا ہے۔ یاداشتیں جمے ہوئے خیالات اور تصورات ہیں جو دماغ کے مختلف حصوں میں سے ایک کے اندر میکانکی انداز میں رکھے ہوئے ہیں۔

۸۔ ہمارا ذہن ہمارے سر کے اندر ہوتا ہے۔ تمام شعور ہمارے دماغ کی سرگرمی ہے اور کچھ بھی نہیں۔

۹۔ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کے ساتھ اُس وقت تک رابطہ نہیں کر سکتا جب تک درمیان میں کوئی خالص مادی واسطہ موجود نہ ہو۔

۱۰۔ کسی بھی بیماری کا علاج ہمیشہ میکانسٹک میڈیسن سے ہی ممکن ہے۔ باقی تمام طریقہ ہائے علاج توھماتِ محض ہیں۔

ان بنیادی عقائد پر رُپرٹ نے سائنسی نکتۂ نگاہ سے ہی اعتراضات اُٹھائے جو منطقی اعتبار سے تقریباً درست ہیں۔ رُپرٹ کا بنیادی مقصد صرف یہ ثابت کرنا ہے کہ سائنس عہدِ حاضر کا مضبوط ترین مذہب ہے۔ فقط مذہب نہ کہ سائنس۔ اور میری دانست میں رُپرٹ اپنے مقدمے میں کامیاب ہوا ہے۔

یہ جاننے کے لیے کہ رُپرٹ نے اِن عقائد پر کس طرح کے اعتراضات کر کے انہیں جانچنے کی کوشش کی آپ کو رُپرٹ کی کتاب ''سائنس ڈیلوژن'' پڑھنا ہوگی۔ البتہ رُپرٹ کے اعتراضات میں سے ایک جو مجھے دلچسپ لگا یہ تھا، ہم جانتے ہیں کہ ہماری زمین سورج کے گرد گھوم رہی ہے اور سورج ہماری کہکشاں ''ملکی وے'' کے بائیں بازو میں بہت دور ایک انجان سے علاقے میں موجود ہے۔ ہماری کہکشاں کے دو بازو ہیں، جو بہت لمبے ہیں اور یہ دونوں بازو رکہکشاں کے مرکز کے گرد گھوم رہے ہیں۔ ہمارا سورج، ہماری ہی کہکشاں کے مرکز کے گرد اپنا ایک چکر ۲۳۰ ملین سال میں پورا کرتا ہے۔ جب سے زمین پر ہم پیدا ہوئے ہیں تب سے اب تک ہماری زمین نے ہماری کہکشاں کے مرکز کا ایک چکر بھی پورا نہیں کیا۔ یہ سفر جاری ہے اور ہمیں بالکل بھی معلوم نہیں کہ راستے میں کیا کیا آئیگا۔ ہم انسانوں کے لیے یہ پہلا سفر ہے۔ اور یہ چونکہ یہ انجان راستوں پر ہے اس لیے آگے کسی سٹیشن پر ڈارک میٹر آجائے گا یا ڈارک انرجی کا کوئی خوفناک بادل ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اگر کل کو ایسا کچھ ہو جائے تو عین ممکن ہے سب کچھ ہی بدل جائے۔ یہ گریوٹی اور روشنی اور دیگر قوانین۔ سب کچھ۔!

کارل پوپر کو فلاسفی آف سائنس کا غالباً سب سے بڑا فلسفی مانا جاتا ہے۔ اس نے سائنس اور غیر سائنس کے لیے فالسفیکیشن کا اصول وضع کیا ہے جس کے مطابق سائنسی سچائی کا اصول یہ ہے کہ اسے جھٹلایا جا سکے۔ مذہب اس لیے سائنس کا مقابلہ کرنے کا اہل نہیں کہ مذہب کے پاس فالسفیکیشن جیسا طاقتور اُصول نہیں ہے۔ اگر مذہب کے عقائد کو بھی جھٹلایا جا سکتا تو ان کی سچائی کو بھی سامنے لا جا سکنا ممکن ہوتا۔ اگر فالسفیکیشن کے اصول کو درست مان لیا جائے تو یہ اصول گزشتہ صدی کی زیادہ تر سائنسی تھیوریز پر یکساں اپلائی ہوتا ہے۔ اِس اصول کے مطابق کوئی عقیدہ تب عقیدہ ہے جب اسے جھٹلانا ممکن نہ ہو وگرنہ وہ سائنسی حقیقت ہے۔ ایسے تمام عقائد جو انسانی دماغوں میں اس طرح سے داخل ہو چکے ہیں کہ انہیں جھٹلانا وقت کے ساتھ ممکن نہیں رہا اِسی اُصول کے تحت مذہبی عقائد کے درجہ پر آچکے ہیں۔ رُپرٹ کہتا ہے، 'ارتقاء کے دوران ''حملہ کرنے والے'' اور اُن کی ''خوراک بننے والے'' جانوروں کے درمیان ایک تعلق نے پرورش پائی۔ اس

تعلق کے دیگر بے شمار خوبصورت پہلوؤں میں ایک ''پشت پر گھُورنے'' کا تعلق ہے۔ایک درندہ جب کسی سبزی خور کو چھپ کر اس کی پشت پر گھورتا ہے تو سبزی خور کو اس کی خبر مل جاتی ہے''۔

کہا جاسکتا ہے کہ سبزی خور کو درندے کی بُو آجاتی ہے۔ لیکن رُپرٹ کے مفروضے سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اگرچہ اِسے تجربے میں لانا بھی بہت مشکل ہے۔ ذاتی طور پر ہم خود دیکھتے ہیں، سانپ کی موجودگی میں چڑیاں شور مچانے لگ جاتی ہیں۔ کتے خلا میں گھورتے ہوئے بھونکنے لگ جاتے ہیں۔ پودے آپس میں باتیں کرتے ہیں جنہیں ہر روز کی مارکنگ کے ذریعے باقاعدہ سمجھا جاسکتا ہے۔ ساری کائنات بول رہی ہے اور ریاضی ہے کہ کائنات کی گفتگو کو بیان کرنے میں پوری طاقت کے ساتھ دوڑتے ہوئے آنے کے باوجود ابھی بھی پھولے ہوئے سانس کے ساتھ ایک دُونے دو اور دو دُونے چار کر رہی ہے رپرٹ کی مشہور پلیٹ فارم ٹی ای ڈی پر تقریر جو بہت مشہور ہوئی دیکھیے۔

میں کہا کرتا ہوں کہ متکلمین پر دہریت کا یہ اعتراض کہ ہر نئی سائنسی ایجاد ان لوگوں کو اپنی آسمانی کتابوں میں پہلے سے لکھی ہوئی مل جاتی ہے۔ سائنس آج کچھ کہتی ہے تو کل کچھ اور کہتی ہے۔ اگر مذہبی لوگوں کو سائنس کے اصولوں سے تائید لینے کی عادت ڈالنی ہے تو اپنے عقائد کو بدلنے کی عادت بھی ڈالنی ہوگی۔ یہ اعتراض نہایت بُودا ہے۔ میری دلیل یہ ہے کہ ذہنِ انسانی کے بس میں جس قدر جاننا ہے وہ اتنا جانتا چلا جارہا ہے۔ وقت کے ساتھ اِس رفتار میں تیزی بھی آئی ہے۔ لیکن سائنس پر ''بدل جانے'' کا الزام قطعی طور پر غیر درست ہے۔ انسانی منطقی فہم میں جب زمین کو فلیٹ دیکھنے کی صلاحیت تھی تو فلیٹ زمین ہی سائنسی تھی اور پھر جب انہیں کسی نے بتایا کہ زمین گول ہے تو انہوں نے بہت وقت لیا اس نئے تصور کے مطابق اپنے ذہنوں کو ڈھالتے ہوئے۔ چنانچہ یہ انسانی ذہن ہے جس نے ترقی کرنی ہوتی ہے نہ کہ سائنس۔ اگر انسانی ذہن زیادہ ترقی کر گیا تو مذہبی عقائد بھی شاید اُس پر کھل جائیں لیکن سر دست چونکہ یہ راستے میں ہے تو بے شمار مذہبی عقائد کا فہم بھی اس کے لیے ابھی راستے میں ہے۔ نہ سائنس بدلتی ہے نہ مذہبی عقائد، بدلتا ہے تو صرف انسانی ذہن اور اس کا منطقی فہم۔

ان باتوں کو موجودہ مذہبِ سائنس کے نزدیک زنا بالجبر جتنا بُرا گناہ سمجھا جاتا ہے اور اِس کی سزا فقط سنگسار ہے۔ جدید مغربی کیپٹالسٹ سوسائٹیز کے تابع اذہان زومبیز کی طرح ہیں۔ خبردار جو کسی سائنسی حقیقت سے کوئی مذہبی عقیدہ برآمد کرنے کی کوشش کی تو۔ ورنہ ہم سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔

سائنس اور اہلِ سائنس ماضی میں موجود مذاہب جتنے زور آور ہو چکے ہیں جب کہ اُن کا دامن خالص سائنسی سچائیوں سے یکسر خالی ہو چکا ہے۔ان کے پاس کچھ بچا ہے تو وہ بالکل ویسا ہی ہے جیسے مذہبی عقائد۔

بہت سی کائناتیں ہیں۔ وقت میں سفر ممکن ہے۔ مادے کا سرے سے وجود ہی نہیں۔ بگ بینگ خود بخود ہو گیا۔ ارتقا اَن گائیڈڈ ہے۔ کائنات بے شعور ہے۔انسانی ذہن مادے کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ خدا کی پناہ!!!! کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں جس کی حیثیت غیب جیسی نہ ہو۔ تو پھر اور مذہب کیا ہوتا ہے۔اور مذہب بس یہی ہوتا ہے کہ ان باتوں کو مانو! اگر نہیں مانتے تو ہم تمہیں سزا دینے میں حق بجانب ہیں۔

ادریس آزاد

کیونکہ میں سوچتاہوں لہذامیں ہوں !

خداکورد کرکے جدید مغرب کے نظریہ حیات کی بنیاداس فلسفے پر ہے کہ :

کیونکہ میں سوچتاہوں لہٰذامیں ہوں۔

یہ ایک گہرااور ہمہ گیر فلسفہ ہے۔یہ فلسفہ بنیادی طور پر انسان کو فطرت اور اطراف سے بیگانہ کرکے اس کو وجود کے اندر اتار کر ایک آزاد اور سوچتاذی نفس قرار دیتاہے۔اس نظریے نے انسان کے شعوراور جسم کو مدغم کرکے اس کی ذات کی پہچان کا بہت قوی اور مستحکم شعور دیا۔اس آگہی کے حصول کے بعد عملیت کادرس دیتے ہوئے اطراف اور کائنات کو عقل اور شعور سے سمجھنے، برتنے اور مسخّر کرنے کا عزم دیاتوانسان اپنی فلاح کی خاطر خداسے لاتعلق ہوکر ریسرچ اور علوم کے حصول میں غرق ہوگیااور ہر قدم پر اسی فلسفے کی بنیاد پر پرانے عقائد، روایات اور رسومات کو عقل اور شعور کے تناظر میں روندتااور نئے رسوم ورواج کی ترویج کرتاآگے بڑھنا شروع ہوا۔اسی کے بموجب جدیدانسان نے اپنےآپ کو عاقل ترین اور ماحول کا محور قرار دیا۔

اس فلسفے کابنیادی نکتہ، میری ذات اور میری سوچ ہے !

اس طرزِ فکر میں انسان کابنیادی سوال کہ، میں کون ہوں؟اس طرح حل کردیاگیاکہ میں وہ ہوں جو سوچتاہے۔اب آگے کے مرحلے شعور اور تجربات سے کائنات کو سمجھناہیں اور بس، یعنی ریسرچ !اس طرح اس فلسفے نے جدیدانسان اور فلسفی کواپنے دائرے میں کھینچ کر مقیّد کرلیاہے۔اس کاموضوع صرف حال اور مستقبل ہے، ماضی نہیں۔گویایہ ماضی کی روایات اور اخلاقیات کااپنی عقل کے تئیں باغی اور منکر ہے۔صدیوں کے متعیّن اخلاق اور معاشرتی ضوابط کو من وعن صرف نظریہ ضرورت کے تحت ہی مجبوراً قبول کیاگیاہے جن کی مزید تشریح انسانوں کی اکثریت کی سوچ سے مشروط ہے۔

حقیقت یہی ہے کہ ہم کو بھی اسی عفریت کاسامناہے جوآج نہیں توکل یہاں کھل کر وارد ہوگا، کیونکہ یہ ہمارے درمیان آہستگی سے آکر نوجوان ذہنوں کو مسموم کررہاہے لہٰذااس فلسفے کی عقلی اور سائنسی بنیاد پر مضبوطی کاجائزہ ہمارے لیے بہت اہم ہے تاکہ اس کی کمزوریوں کو طشت ازبام کیاجاسکے۔یہ فلسفہ جدیدیت کابیج ہے جس میں اس کادرخت اور پھل چھپے ہیں۔اس بیج کی تفصیلی جانکاری ہی بتائے گی کہ یہ کتنا فطری ہے۔خیال کیاہے؟خیال کاتعلق دماغ سے ہے مگرابھی تک سائنس بھی دماغ کی کارکردگی کی ماہیت جاننے میں کامیاب نہیں ہوئی۔دماغ پر جدید تحقیقات یہ واضح کرتی ہیں کہ ہم ابھی دماغ اور اس کی کارکردگی کی اصلیت سمجھنے کے ابتدائی مراحل میں ہیں۔روبوٹ

اعلیٰ ساخت کی مشین ہے جس کو انسان سوچنے کی مصنوعی صلاحیت دینے کی کوشش کر رہا ہے لیکن دماغ کی سوچنے کی صلاحیت ایک ایسا اسرار ہے جس کو انسان فی الحال ہو بہو کسی مشین میں نہیں منتقل کر سکا۔ اس کے علاوہ سائنس اور فلاسفر ابھی تک یقینیت کے ساتھ یہی نہیں جان پائے ہیں کہ شعور آیا دماغ کی طبعی ساخت سے مکمل منسلک ہے یا کچھ اور بھی۔

یہاں ہم اس فلسفے کو پرکھنے کی کاوش سائنس اور سادہ استدلال سے کریں گے۔ اس جائزے میں ہم بھی خدا کو اپنی بحث سے الگ کر کے اسی فلسفے اور سائنس کی بنیاد پر آگے بڑھیں گے تاکہ دقیانوسیت یا غیر سائنسی اُسلوب کا کوئی الزام ہمارے سر نہ پڑے۔ لیکن سب یہ جان لیں کہ جدیدیت اور سائنس کی خیرہ کن کامیابیاں خواہ انسان کو علمیت کی کتنی ہی بلندی پر لے جائیں اور انسان اور خدا کے درمیان لاکھ رخنے کھڑے کریں لیکن بہت جگہوں پر آکر یہی جدیدیت خود بے دست و پا ہو جاتی ہے۔

وہ کیا ہے ؟آیئے سمجھتے ہیں۔

اس فلسفے میں انسان اور اس کی سوچ ایک اکائی کی حیثیت سے ہیں۔ گویا انسان میں سوچ ہے اور سوچ سے انسان۔ خیالات کی آمد ہر جاگتے انسان کی جبلّت ہے اس لیے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ خیالات کیونکر پیدا ہوتے ہیں۔ ہمیں سوچ اور خیال کی ماہیت جاننی ہے اور یہاں یہ دیکھنا ہے کہ سائنس اس بارے میں کیا کہتی ہے کہ میں کیسے سوچتا ہوں۔ یعنی میرے خیالات کیسے آتے ہیں۔ کیا یہ میرے وجود کا حصہ ہیں یا کوئی اجنبی چیز ہے جو مجھ میں در آتی ہے۔

اگر خیالات دماغ یا باالفاظ دیگر ذات سے اٹھتے ہیں تو سوال یہ ہے کہ : مستقبل یا آئندہ کے بے حساب خیالات اور سوچ کا کیا کوئی وئیر ہاؤس ہے جہاں سے یہ وارد ہوتے رہتے ہیں ؟اگر ہے تو کہاں ؟

سائنس کے مطابق تو دماغی خانے میں صرف ماضی کی فائلیں ہوتی ہیں جنہیں ہم یادداشت کہتے ہیں، کیونکہ سائنس انسانی دماغ میں ایسا کوئی خانہ دریافت نہیں کر سکی، جہاں پر مستقبل کے خیالات منجمد یا ذخیرہ ہوں تو اس کا منطقی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ کوئی خارجی عامل بھی ہے جو انسان کے دماغ میں سرایت کرتا ہے جس سے خیالات اور سوچ پیدا ہوتی ہے۔ سائنس دماغ میں کیمیائی عمل کا مشاہدہ کر کے بتاتی ہے کہ سوچ دماغ کے اندر ظاہر ہوتی ہے۔ سائنس کے مطابق ہمارے خیالات دماغ میں موجود نیورون میں کیمیکل ری ایکشن کی بدولت پیدا ہوتے ہیں۔ یعنی میری سوچ ایک سائنسی اور کیمیائی چیز product ہے۔ اس طرح خیال کو پروان چڑھانے والے ان کیمیکل عوامل یا فارمولوں کا کوئی منبع ہونا تو سو فیصد منطقی بات ہے۔ مزید یہ کہ انسان کے اندر آئندہ کے خیالات کا کوئی ذخیرہ نہیں ہوتا تو پھر سوچ کا کوئی

خارجی منبع یا بنیاد رکھنا لازمی ہے۔ لیکن ہمارے مذکورہ فلسفے سے یہ بات ہم آہنگ نہیں ہے کیونکہ اِس فلسفے میں فلسفی سوچ کو انسان کی ذات کا حصّہ کہتا ہے۔ ایک خارجی چیز ذات کا حصّہ کیسے ہو سکتی ہے؟ دیکھیے جناب انسان آکسیجن کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا جسے وہ ہر لمحہ باہر سے حاصل کرتا ہے، تو کیا آکسیجن جو ہمیں زندہ رکھتی ہے ہماری ذات کا حصّہ ہے؟ گویا جس طرح آکسیجن انسانی زندگی کو جاری رکھتے ہوئے بھی انسانی ذات کا حصّہ نہیں ہے، اسی طرح سوچ کو پیدا کرنے والے عوامل اگر خارجی ہیں تو وہ انسانی ذات کا حصّہ نہیں ہو سکتے۔ خیال جو باہر سے کسی عنصر کی وجہ سے پیدا ہوتا ہو وہ درحقیقت ایک اجنبی چیز ہوتا ہے جس کو انسان اپنے اختیار کے بموجب اپناتا یا رد کرتا ہے۔

اب اگر ہم یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں کہ سوچ داخلی نہیں بلکہ خارجی عامل ہے تو اس فلسفے کی بنیاد کا غیر سائنسی اور غیر منطقی ہونا ثابت ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے دیکھنا ہے کہ خیال کے پیدا ہونے کے خارجی ذرائع کیا ہو سکتے ہیں؟ باہر ایسا کیا ہے جو سوچ پیدا کرتا ہو۔

انسانی حواس:

اب آیئے انسانی حواس پر، بظاہر یہ وہ بیرونی معلومات وصول کرنے والے واسطے Receptors ہیں کہ جن کی بنا پر معلومات دماغ تک پہنچتی ہیں۔ اگر حواس معطّل ہو جائیں تو دماغ کی سوچنے کی صلاحیّت ساکت ہو جانی چاہیے لیکن ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ حواس معلومات دینی بند کر دیں، پھر بھی انسان سوچتا ہے۔ یہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ فعّال حواس خمسہ کے واسطے سے حاصل معلومات انسان کو فوری سوچ اور رد عمل دیتی ہیں لیکن مفلوج حواس کی صورت میں، یعنی آنکھ، کان، ناک، زبان اور لمس کو ارادتاً معطّل کر دیا جائے، پھر بھی دماغ اور اعصاب کا کام کرنا اور خیال کا آنا یا ہمارا تفکّر یہ ثابت کرتا ہے کہ کوئی اور بیرونی عنصر بھی ہو سکتا ہے جو دماغ یا قلب پر اثر انداز ہوتا ہے۔ لہٰذا اب کسی بیرونی اور ناقابل پہچان untraceable عامل کی تلاش بھی ہماری ضرورت ہو گی۔

یہاں سائنسی علوم کو بہ حیثیت مجموعی ایک اکائی سمجھ کر ہی کوئی فیصلہ سائنسی ہو گا۔ سائنس کے مطابق انسان ایٹم سے بنا اور ارتقاء کی منازل طے کر کے یہاں پہنچا۔ ہم سائنسی نظریے نیچرل سلیکشن کی جادوئی کرامات یعنی ''ہر جاندار خود کو خود ہی ماحول کے مطابق بہتر کر رہا ہے۔'' کو بھی سائنسی ہی مان لیتے ہیں، لیکن اگر کھرب ہا کھرب انسانوں کے دماغ میں اچھائی اور برائی کا ایک تصوّر صدیوں سے منتقل ہو رہا ہے تو یہاں ''میں'' نہیں بلکہ ''ہم'' ہوئے یعنی آفاقیت۔ تمام اخلاقی معیار کیونکہ آفاقی ہوتے ہیں لہٰذا ہر ذہن میں ان کی آمد یا قیام انسان کی اپنی ذات کا فیصلہ نہیں ہوتا بلکہ ذہن میں پیوست ہوتا ہے جو کسی آفاقی نظم کا حصہ ہے۔ یہاں ''میں'' سے پہلے تو ''ہم'' ہے کیونکہ سب کسی نظم کے تحت اخلاقیات کی یکساں سوچ رکھتے ہیں۔ اگر ایک انسان کہیں پر اپنے خیال کے بموجب جھوٹ یا قتل کو برا کہتا ہے تو ساری

دنیا کے انسان بھی عمومی طور پر یہی سمجھتے ہیں۔ اگر ایسا ہی ہمیشہ سے ہو رہا ہے تو پھر صرف ''میں'' ہی اپنی ذات میں نہیں سوچتا بلکہ انسان کسی نامعلوم کلیّت totality میں بھی سوچتا ہے۔ گویا انسانیت انسانوں کی مربوط سوچ کا نام ہے جس میں انسان ایک دیوار کی اینٹوں کی طرح جُڑے ہیں۔ اپنی اصل میں اخلاقیات نسل در نسل منتقل ہوتی اقدار نہیں ہیں بلکہ اپنی ابتدا میں کہ جب انسان نے شعور کے تئیں کسی انجانی تحریک پر صحیح اور غلط کے بارے میں مجموعی طور پر یکساں فیصلے کیے تو اس ہمہ گیر قبولیت کا محرّک اگر کوئی بیرونی عنصر نہ ہوتا تو بنیادی اخلاقیات کی ماہیت پر اختلاف و جنگ و جدل ہونا فطری تھا۔ ہر انسان میں غلط کام پر ملامت کرتا ذہن ہمیں ایک پوشیدہ اور فی الوقت نہ سمجھ میں آنے والے اثر انگیز بیرونی نظم کا پتہ دیتا ہے۔

میں سوچتا ہی کیوں ہوں؟

کیا سائنس کے پاس اس کا جواب ہے؟

اگر سائنس کے پاس ''میں کیوں سوچتا ہوں'' کا جواب نہیں تو سوال یہ بھی ہے کہ لفظ کیوں آخر انسان کے ذہن میں کس کیمیکل ری ایکشن سے آیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ کیونکہ سوچ یا خیال باہر سے وارد ہوتے ہیں تو کیوں کے جواب بھی کہیں خارج میں ہی ہوں؟ دیکھیے جناب میری سوچ تو میری نہیں کیونکہ یہ تو کسی نامعلوم کیمیائی عمل کا نتیجہ ہے جس کے منبع origin کا مجھے علم ہی نہیں تو میں کیسے یقین کروں کہ یہ میں جو سوچ رہا ہوں وہ میری ملکیت property ہے؟ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ میرا خیال یا میری سوچ ہے لیکن یہ مدّ نظر رہے کہ حقیقتاً یہ کسی اجنبی اشتراک سے ممکن ہوا۔ گویا جب انسان سوچ رہا ہوتا ہے یا کوئی خیال اس کے ذہن میں وارد ہوتا ہے تو دراصل وہ کسی نامعلوم بیرونی پہل پر ردّ عمل دے رہا ہوتا ہے۔ سوچنا بھی ایک کیمیائی ردّ عمل ہے۔ گویا ہمارے ذہن میں اُٹھنے والا خیال اپنی ساخت میں ایک حسابی ترتیب سے آتا ہے تب ہی تو کیمیائی فارمولے میں ڈھلا ہوتا ہے لیکن دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان کو اپنے خیالات کی ترویج والے ان فارمولوں کا علم تو آج بھی نہیں۔

یہ سوال سائنسدانوں سے جواب مانگتا ہے کہ خیالات آفاقی نوعیّت کے کیوں ہوتے ہیں؟

ہر جدا انسان اپنی جین میں صدیوں کے یکساں اخلاقی تجربات کا بوجھ لے کر کیوں رواں دواں ہے؟

انسان رشتوں کا احترام کیوں کرتا چلا آرہا ہے؟

اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوا کہ انسان کے خیالات اس کے اندر، خارج یا باہر موجود کسی نظم کے تحت ابھرتے ہیں تبھی آفاقی ہوتے ہیں۔ یعنی ہر انسان سوچ رہا ہوتا ہے۔ اس طرح ہمارے مذکورہ جدیدیت کے فلسفے، ''کیونکہ میں سوچتا ہوں لہذا میں ہوں''، کی بنیاد تو انسان کے اندر کے بجائے خارج یعنی انسان کے جسم سے باہر ہونی ثابت ہوتی ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر یہ فلسفہ تو ہوا میں معلّق ہوا کیونکہ یہ فلسفہ انسان کو ایک خود مختار اکائی قرار دیتا ہے۔ اس فلسفے کی بنیاد ایک مفروضہ ہے کہ خیال یا سوچ انسان کی ذات کا حصّہ ہے کیونکہ انسان کے خیالات اندر سے ابھرتے ہیں جو غلط ہے جس کی طبعی حقائق تصدیق نہیں کر رہے۔ یعنی مفکّر بہت سے حقائق کو بغیر ان کی ماہیت جانے من و عن قبول کر کے اپنا فلسفہ پیش کرتا ہے جبکہ اس کے قبول کیے ہوئے اخلاقی حقائق اور عقائد خود بھی اس کے فلسفے سے مطابقت نہیں رکھتے۔ یہ نظریہ اہم سائنسی حقائق کو نظر انداز کر کے اپنے حروف تہجّی اب پ کے بجائے ج چ ح سے شروع کرتا ہے جو کہ نامکمل ہے۔ اگر ابتدائے آفرینش سے ہر فرد اپنی اپنی ذات میں ہی سوچتا ہوتا تو سب انسان خوبصورتی کو خوبصورتی نہیں کہتے بلکہ اس میں اختلاف ہوتا اور کچھ اسے بدصورتی کہتے یا انسانوں میں سچ اور جھوٹ، صحیح اور غلط کے عمومی معیار اُلٹ بھی ہوتے۔ یعنی یہ آفاقی سچّائیاں عنقا ہوتیں۔

سوال پھر یہ ہے کہ یہ خارجی عامل کیا ہے یا کیا ہو سکتا ہے؟

ایک مفروضہ One Hypothesis:

خارج سے سوچ کی آمد پر اگر غور کریں تو ہمیں ایک دوسرے نظریے سے کچھ مدد مل سکتی ہے۔ دیکھیے سائنسدانوں نے ایٹم کے بارے میں بہت کچھ جان لیا تھا، یہاں تک کہ ایٹمی ہتھیار بھی بنا لیے لیکن ایک معمّہ ہمیشہ رہا کہ ایٹم جو ٹھوس مادّہ نہیں بلکہ توانائی ہے اور نظر نہیں آتا، اس میں کمیّت mass کہاں سے آتی ہے۔ اس پر سائنسدان غور کرتے اور مفروضات پیش کرتے رہے۔ ان میں ایک مفروضہ بڑا منطقی تھا کہ کائنات کسی پارٹیکل یا فیلڈ سے بھری ہو سکتی ہے کہ جس سے مَس ہو کر ایٹم کمیّت حاصل کرتا ہو۔ اب حال ہی میں اس کی سائنسی تصدیق ہوئی ہے اور اس فیلڈ کو ہگز فیلڈ یا ہگز بوزون higgs-boson کا نام دیا گیا ہے۔ اس طرح ایٹم میں کمیّت کا خارج سے آنا اب ثابت ہوا۔

ہمارا مسئلہ بھی ایسا ہی ہے کہ خیالات کا پیدا ہونا تو دماغ میں ثابت ہے لیکن یہ کسی خارجی عامل سے کیسے ہوگا؟ یہ ایک پہیلی ہے۔ میرے خیال میں ہمارے اطراف فضا میں کوئی غیر مرئی عنصر موجود ہے جس میں ایسی خصوصیت ہے کہ وہ ہر دماغ سے مَس ہوا رہتا ہے اور اس کی وجہ سے انسان اور حیوان ہمہ وقت ایک غیر مرئی خام لہر سے استفادہ حاصل کرتے ہیں جو مختلف عوامل کے تئیں دماغ میں کیمیکل

ایکشن کو مہمیز دیتی ہے جس سے حالات کے مطابق کسی پوشیدہ نظام کی وجہ سے خیالات کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ گویا دماغ میں خیالات کسی خام شکل میں وارد ہوتے ہیں جو کیمیائی عمل کے بعد ایک سوچ کا روپ دھار کر ذہن کے پردے پر ظاہر ہوتے ہیں۔ اچھے اور برے خیال کی بابت بھی سائنس داں خاموش ہیں، اس کا جواب بھی اسی مفروضے میں ہو سکتا ہے کہ یہ غیر مرئی عناصر مثبت اور منفی جوڑے کی شکل میں ہوں.

اب پھر اس فلسفے کی طرف آتے ہیں جس کی بنیاد میں ایک سائنسی سقم سامنے آیا ہے کہ یہ انسان کے خارج سے تعلق کو ابتدائی مرحلے میں مسترد کرتا ہے جبکہ ایسا نہیں ہے تو جبلّی طور پر اس فلسفے کی بنیاد پر تعمیر ہونے والے تمام معاشرے انسان کو کسی اصل خارجی حقیقت روشناس کرانے کی صلاحیت سے عاری ہوں گے۔ اس فلسفے کی جبلّت انسان کی ذات اور کائنات ہے لہٰذا یہ انہی کے اطراف گردش کرتا ستارہ ہے اور رہے گا۔ جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا تھا کہ یہ ایک بیج ہے اور بیج کے پھل صرف اور صرف اس کی ہی سرشت لیے ہوتے ہیں۔

اب ہم خود ہی اس پر بات کرتے ہیں کہ جدید فلاسفر کیوں حقیقت آشنائی کے اچھے موصل Good-Conductor نہیں ہیں۔

تخلیق کے مدارج میں انسان ایک ترقّی یافتہ خلیاتی حیوان ہے۔ اس کے شعور اور خیالات سب ہی خلوی cellular بنیاد پر نمو پذیر ہوتے ہیں۔ ان کی ایک خلیاتی جبلّت یا سرشت ہے جو اٹل ہے اور اپنی خصوصیات اور حدود کار میں بھی خلیاتی شعور کے تئیں ہی ''لامحدود'' ہے جبکہ حقیقتاً محدود ہے کیونکہ اسی شعور کے مطابق کائنات میں صرف مادّہ ہی نہیں توانائیاں بھی ہیں اور اس خلوی ساختہ شعور کی حد سے باہر اگر کچھ ہے تو ہمیں اس کے متعلق نہیں معلوم مثلاً توانیاتی شعور Energy-based-concsciousnes اور Light-based-consciousness نورانی یا تنویری شعور وغیرہ!۔ مختصراً انسان کا کل علم وہی ہے جو اس کے خلوی ساختہ دماغ سے ہم آہنگ ہو کر اس کے اندر سما جائے، باقی اس سے ماوراء ہر معلومات اس کے لیے معدوم ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ مغربی فلاسفر، سائنسدان اور تحقیق کرنے والے خواہ دنیا کے کسی بھی کونے میں ہوں، اپنی خلوی جبلّت کے بموجب، صرف اور صرف خلیاتی ساختہ شعور میں سوچتے ہوئے اپنے علم کے خمار اور احساس برتری میں غلطاں ہو کر کائنات میں شعور کی دیگر اقسام کو نہ صرف نظر انداز بلکہ مسترد کر دیتے ہیں جبکہ حقیقتاً یہ کائناتی حقائق اپنی جگہ بہت سے لاینحل سوالات کے ساتھ موجود رہتے ہیں۔ وہ سوالات جدیدیت کے علمبرداروں کے لیے سوہانِ روح نہیں بلکہ سوہانِ شعور بنے ہیں کیونکہ روح کو سائنس جان نہیں پائی ہے۔ ان ہی سوالات میں بڑی تعداد ''کیوں'' کے سابقہ اور لاحقہ والے سوالات ہیں جن کے جواب ان کے پاس نہیں ہوتے لیکن اپنی بقاء اور انا کی

تسکین کے لیے عقل، فلسفے اور مفروضات کی مدد سے اپنے آپ کو یقین کی مصنوعی کیفیت میں رکھنے میں مجبور ہوتے ہیں۔ یہ فلسفہ بنیادی طور پر یہی تلقین کرتا ہے کہ انسان اپنی عقل کو لامحدود گردانے ہر وقوعہ کو صرف عقل اور تجربات سے سمجھے اور جو عقل میں نہ آئے، اس کو مفروضات کی ڈور سے باندھ کر مستقبل کی ٹوکری میں ڈال کر آگے بڑھ جائے۔ اس فلسفے کی بنیاد غیر سائنسی اور غیر فطری ہے اسی لیے مغرب میں بے شمار اخلاقی مسائل کھڑے ہو رہے ہیں اور اخلاقی اقدار و خاندانی نظام میں ٹوٹ پھوٹ جاری ہے۔

اب ایک اہم نکتہ توجّہ چاہتا ہے۔

اسلام جو دین فطرت ہے اور اپنا ایک فلسفۂ حیات رکھتا ہے جس کی بنیاد دماغی سوچ یا کوئی انسانی فلسفہ نہیں بلکہ مادّے سے ماورا ہے۔ اگر سائنس اور جدید فلسفے کی رو سے سمجھیں تو یہ انسان کو ایک بہت برتر بلکہ لامحدود اجنبی نورانی شعور کے تابع کرتا ہے۔ یہ انسان کو ایک مقام اولیٰ عطا کرتا ہے کہ انسان اپنے خالق کی برتر ترین تخلیق اور زمین پر اپنے خالق کا نائب ہے۔ خالق کی شعوری صفات ایک معیّن درجے میں انسان میں ودیعت کی گئی ہیں تاکہ یہ ایک بااختیار مگر محدودیت میں قید ''خالق'' بنے بالکل اسی طرح جیسے انسان برقی یا الیکٹریکل شعور روبوٹ میں منتقل کر کے ایک ہیومنائڈ روبوٹ humanoid تخلیق کرتا ہے۔

اب یہ دیکھیے کہ اللہ کائنات کو بلاشرکتِ غیرے چلا رہا ہے تو فطری طور پر انسان کے اندر بھی یہ صفت کسی نہ کسی طور پر موجود ہے کہ وہ بھی اپنی سلطنت میں کسی کی عمل داری نہیں چاہتا اور کوشش کرتا ہے کہ خدا کے بغیر اپنی سلطنت کا جواز ڈھونڈ لے۔ اسی ذہنی اُپج کے تئیں کیونکہ انسان مادّے کی سرشت لیے ہوئے ہے، پہلے کائنات کو صرف مادّے کی نظر سے پہچاننے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی سوچ میں نئے فلسفے گھڑتا ہے تاکہ کائنات اور زندگی کا جواز خالص عقلی بنیاد پر استوار کرے۔ مغرب کیونکہ ان فلسفوں کے بموجب معاشرہ استوار کر کے مادی ترقی کر رہا ہے اور باقی دنیا سے مادّی ترقّی میں بہت آگے ہے، اسی لیے جدید انسان حاصل علوم کے بموجب نئے فلسفوں سے مادی حدود میں ہی انسان اور کائنات کی تشریح کیے جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان فلسفوں سے بے بہا مادّی ترقی تو حاصل ہو رہی ہے لیکن انسان اپنے اور کائنات کے وجود کے مخمصے حل نہیں کر پایا کیونکہ ان سوالات کا جواب مادّیت پر مبنی فلسفوں اور علوم میں ہے ہی نہیں۔ وما علینا الّا البلاغ۔

(خدائی سرگوشیاں اور جدید نظریاتی اشکال از مجیب الحق حقی سے اقتباس)

تشکیک سے مذہب کی تائید ہوتی ہے یاالحاد کی؟مولانادریابادی

منجملہ ان چند الفاظ کے، جنکوار باب مذہب نے ہمیشہ نفرت، عداوت، وخوف کی نگاہ سے دیکھاہے، ایک لفظ تشکیک یالاادریت بھی ہے۔ تشکیک انکے نزدیک مذہب کی سب سے قوی حریف ہے! مشککین کوانہوں نے تحریکات دینی کاسب سے بڑا قاطع وبرباد کن سمجھاہے، اور لاادریت ان کے لغت میں، ہمیشہ الحاد ودہریت کے مترادف رہی ہے(چنانچہ گزشتہ صدی کے آخر میں جبکہ ہکسلے، لادریت کی منادی کر رہا تھا، انگلستان کے ایک نہایت نامور آرچ بشپ نے اپنے ایک مضمون میں صراحتا یہ تحریر کیا، کہ ملاحدہ کو خود الحادہ دہریت کے انتساب سے عار آتاہے، پس اس شرم وذلت سے بچنے کے لے انہوں نے اپنے واسطے لادریت کالقب اختراع کیا)مذہبی حلقوں میں یہ ایک قطعی ومسلم رائے ہے، لیکن واقعات بھی اس کی تائید کرتے ہیں؟صفحات ذیل میں اسی سوال کاجواب ملے گا۔

یہ مسئلہ درحقیقت، تین مختلف مسائل سے مرکب ہے، یعنی مذہب کیاہے؟الحاد کیاہے؟اور پھر تشکیک کاان دونوں سے کیا تعلق ہے؟ جب یہ مسائل بجاے خود منقح ہو جائیں گے، تو پھر سوال مندرجہ ذیل عنوان کا حل ازخود ہو جائیگا، اور کسی مزید بحث کی گنجائش نہ رہے گی۔

☆پہلا مسئلہ-مذہب کی ماہیت:

مذہب کی صحیح ماہیت کی دریافت کرنے میں جو شے سب سے بڑھ کر مانع ہوتی ہے، وہ مختلف مذاہب کا باہمی اختلاف، بلکہ تضاد ہے، اس دقت پر غالب آنے کا طریقہ یہ ہے کہ صرف ان خصوصیات کو پیش نظر رکھا جائے، جو تمام مذاہب میں مشترک ہیں. اور انہیں مہمات

عقائد سے سروکار رکھا جاے، جنہیں ہر مذہب نے بہ این تخالف و تباین بطور بنیاد کار کے تسلیم کیا ہے، اس حیثیت سے مذہب پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکے عناصر ترکیبی حسب ذیل ہیں:

(1)۔ کسی مافوق ادراک قوت یاذات کا وجود، جو تمام عالم پر حاکم و متصرف ہے۔

(2)۔ اس فوق الادراک ہستی کی طرف سے انسانی زندگی کے ہدایا واحکام کا نزول، جسے وحی والہام کہتے ہیں۔

(3)۔ ان احکام کی پابندی کی تاکید اور انکی خلاف ورزی پر تعزیرات شدید کی وعید، یہ مذہب کی تصریحات ہیں، ان سے دو نہایت اہم تفریعات نکلتی ہیں، جنکا مذہب نے خواہ کبھی صراحتہً دعوِیٰ نہ کیا ہو لیکن انکا مفہوم، کلیات بالا کے پردہ میں لازمی طور پر شامل ہے، وہ تفریعات یہ ہیں:

اوّلا: یہ کہ انسان فاعل باارادہ ہے۔ افعال کی ذمہ داری کے معنی ہی یہ ہیں کہ انسان ایک صاحب شعور و عقل مخلوق ہے۔

ثانیا: یہ کہ انسانی عقل کا ایک محدود مخصوص دائرہ عمل ہے جس سے اُسے کسی حالت میں قدم نہ نکالنا چاہیے، یعنی تکوین عالم کی علت، وامور معاد وغیرہ عقل کی دسترس سے باہر ہیں، ان معاملات میں انسان کی عملی زندگی کی رہنما، عقل نہیں بلکہ اعتقاد ہے۔

ترتیب اہمیت کے لحاظ سے مذہب نے ہمیشہ ثانی الذکر تفریع کو اوّل الذکر پر مقدم رکھا ہے۔ ادنےٰ درجہ کے مذاہب کا ذکر نہیں، بڑے سے بڑے متمدن مذہب نے بھی جب کبھی کہا ہے تو یہی کہا ہے کہ عقل اگرچہ انسان کے حق میں ایک بڑی نعمت ہے، بااین ہمہ اس کا دائرہ عمل، عالم ظاہری کی چند اُوپری باتوں تک محدود ہے اور یہ کہ کائنات کے دقیق اسرار اور حقائق اصلی کا انکشاف اس کے بس کی بات نہیں۔ اسی طرح کفار کی اس خصوصیت کو نمایاں طور پر بتایا گیا ہے کہ وہ لوگ ہر اس بات کی تکذیب پر تیار ہو جاتے ہیں، جو انکی عقل میں نہیں آتی، حالانکہ یہ نہیں جانتے کہ انکی عقلیں تو بہت ہی نارسا ہیں۔ غرض مذہب کے اصل الاصول کو اگر دو لفظوں میں بیان کرنا چاہیں، تو کہہ سکتے ہیں، کہ وہ، وہ نظام زندگی ہے، جس میں اعمال انسانی پر اصلی حاکم و متصرف، عقل کو نہیں، بلکہ اعتقاد کو قرار دیا گیا ہے۔

☆ دوسرا مسئلہ: الحاد:

مذہب کے بالکل برعکس الحاد نام ہے عقل پرستی کا۔ ملاحدہ کی طرف سے ہر ملک و ہر زمانہ میں مذہب پر جس قدر اعتراضات ہوتے رہے ہیں، ان سب کا ماحصل یہ ہے کہ مذہب کی تعلیمات چونکہ عقل کے مخالف ہیں اسلیے غلط نا قابل قبول ہیں۔ اٹھارویں صدی میں مذہب

طبیعی، انیسویں صدی میں مادیت اور آج عقلیت کے نام سے الحاد کے جو مختلف مظاہر دنیا میں پیدا ہوتے رہے ہیں، انکی خصوصیت مشترک یہ ہے کہ انکے علمبر دار صرف عقل کو اپنی زندگانی کا رہنما قرار دیتے ہیں اور بہ غایت بلند آہنگی دعویٰ کرتے ہیں، کہ چونکہ مذہب عقل کی مخالفت کرتا ہے، اسلیے قطعی ہے کہ یہ فنا ہو جائے گا، چنانچہ اٹھارویں صدی میں جن لوگوں نے الحاد کا اسکول قائم کیا تھا انہوں نے اس کا نام ''Religion of Reason'' یعنی ''مذہب عقلی'' رکھا تھا، اور اس وقت کے مشہور ترین منکر مذہب ٹامس پین نے مذہب کے رد میں جو کتاب لکھی، اس کا نام بھی ''Age of Reason'' یعنی عہد عقلی یا دورِ عقلی رکھا، پھر آجکل بھی جس قدر مشاہیر ملاحدہ منکرین مذہب ہیں، وہ سب اپنے تیئں ''Rationalists'' یعنی عقلئین کہتے ہیں۔

☆ تیسرا مسئلہ: تشکیک:

اب دیکھنا یہ ہے، کہ تشکیک ولاادریت جس کے مشاہیر ارکان، قدماے یونان میں پر ہو، کارینڈس، آسیسلادس، وسیکشس، اور یوروپ میں ہیوم، کینٹ، اسنپسر، ہکسلے، و، ڈارون ہوئے ہیں، اس سے مذہب کی تائید ہوتی ہے، یا الحاد کی؟ اس کا حل ایک دوسرے سوال پر موقوف ہے، یعنی تشکیک کی ماہیت کیا ہے؟

قدماء مشککین یونان کی تصانیف آج موجود نہیں لیکن متاخرین نے جو کچھ انکے بارہ میں لکھا ہے اس سے انکے متعلق حسب ذیل معلومات حاصل ہوتے ہیں:

''حقایق اشیاء مجہول ہیں، انسان کو اتنا تو بلاشبہ معلوم ہوتا ہے کہ مظاہر طبعی کیا ہیں، لیکن کسی شے کی اصل حقیقت یا ماہیت کا اسے مطلق علم حاصل نہیں ہو سکتا، انسانی معلومات جس قدر بھی ہوں یا تو محسوسات ہونگے یا محسوسات سے ماخوذ ہونگے، شق اوّل میں، چونکہ ہر انسان کے حواس دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں، اس لیے محسوسات کے علم کا اضافی ہونا اور ہر شخص کے لے انکا مختلف ہونا ظاہر ہے اور شق دوم میں بھی وہ اس لیے اضافی ہونگے کہ انسان متفادت العقول ہوتے ہیں اور ہر شخص کی عقل اس تربیت اور ماحول کا نتیجہ ہوتی ہے جس میں وہ نشو نما پاتا ہے پس اسکے پاس اصل حقیقت کی دریافت کا کوئی ذریعہ نہیں۔ خواص و کیفیات اشیاء کے متعلق ہم نے جو رائیں قائم کی ہیں ان میں سے ہر ایک کی مساوی قوت کے ساتھ تردید و تائید کیجاسکتی ہے۔ جن چیزوں کو محاسن اخلاق سمجھا جاتا ہے انکی حمایت و موافقت پر جس قدر دلائل قایم ہو سکتے ہیں اس قدر انکی مخالفت پر بھی قایم کے جا سکتے ہیں۔ ایسی حالت میں فطری حیثیت سے انسان کے پاس

امتیاز حق و باطل کا کوئی ذریعہ نہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ عملی ضروریات کے لحاظ سے اسے بادی النظر میں اشیاء کے خواص و کیفیات کا ایک پہلوانکے دوسرے پہلو کے مقابلہ میں راجح ہوتا ہے، اور عمل کے لے اسی قدر راجحیت و مرجوحیت کافی ہے''۔

)قدماء متشککین کے ان خیالات کا خاص ماخذ ہے، دیوجانس رومی کی کتاب ''حکماء قدیم کے خیالات اور سوانح''۔ :Diogenes'' Lives & Opinion of ancient Philosophers''اسکے علاوہ یہ حالات تاریخ وفلسفہ کی عام کتابوں، خصوصا، ویبر، لوٹیس، جائنٹ وغیرہ کی تصانیف میں تفصیل سے ملتے ہیں، ڈاکٹر فیلینٹ، مشہور مسیحی عالم جنکی تصانیف یونیورسٹیوں کے بی۔اے و، ایم۔اے کے نصاب میں داخل ہیں، اس نے ''لاادریت'' کے عنوان سے، جو 600 صفحہ کی مبسوط کتاب تیار کی ہے اس کے ابتدائی اجزامیں بھی تشکیک قدیم کی تاریخ کے متعلق مفصل معلومات مندرج ہیں(

ڈیوڈہیوم(david hume) نے جو تشکیک جدید کا ابوالآباء ہوا ہے، اپنی متعدد تصانیف میں جن خیالات کی اشاعت کی ہے انکا ماحاصل یہ ہے:

''فلاسفہ والٰہئین اپنا سارا زور اس پر صرف کرتے ہیں کہ مختلف اشیاء عالم کے درمیان رشتہ علت و معلول دریافت کریں لیکن مزید غور سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسبتِ تعلیل جس پر سارے نظام فلسفہ کی بنیاد ہے ایک وہمی و بے حقیقت شے ہے۔ ہم کسی شے کے معلول ہونے کے یہ معنی لیتے ہیں کہ جب ایک خاص واقعہ (نام ہم نے علت رکھا ہے) ظاہر ہوگا تو یہ دوسرا واقعہ بھی لازمی طور پر ظاہر ہوگا لیکن سوال یہ ہے کہ اس لزوم کی کیا دلیل ہے؟ یہ ہم کس بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ جب ایک شے واقع ہوگی تو دوسری بھی لازمی طور پر واقع ہوگی؟ ظاہر ہے کہ اس کے جواب میں کوئی دلیل پیش نہیں کی جاسکتی بلکہ اسکی بنیاد صرف ہماری ایک ذہنی عادت پر ہے۔، جب ہم دس بیس بار یہ مشاہدہ کرچکے ہیں کہ آگ کے روشن ہونے کے ساتھ ہی ہمیں گرمی محسوس ہوئی تو ہمارا ذہن اس توقع کا ایک طرح پر عادی وخوگر ہو جاتا ہے کہ آئندہ جب کبھی آگ روشن ہوگی تو ہمیشہ گرمی پیدا ہوگی۔ بس اس عادت کے سوا اور کوئی بنیاد تعلیل کی ہمارے پاس نہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہم عقل و دلیل کی بنا پر کسی شے پر پورا اعتماد نہیں کرسکتے اس کے علاوہ ہمارے تمام دلائل تحلیل ہو کر اوّلیات پر ٹھہرتے ہیں جنھیں ہم نے شروع ہی سے مسلم فرض کرلیا ہے لیکن خود انکی صحت کی کیا ذمہ داری ہے؟ اس بنا پر ہمیں نظری حیثیت سے یہ اعتراف کرلینا چاہیئے کہ ہمیں کسی حقیقت کا علم نہیں ہو سکتا بلکہ ہمارے معلومات تمام تر اضافیات پر مشتمل ہیں لیکن اسی کے ساتھ انسان فطرتا عمل پسند واقع ہوا ہے کچھ نہ کچھ کرتے رہنا ایک شے کو ترک اور دوسرے کو اختیار کرنا اسکی فطرت میں داخل ہے جس سے وہ

بچ ہی نہیں سکتا۔ ان حالات کے ساتھ، انسان کی سی متناقض الفطرت ہستی کے لئے بہترین صورت یہ ہے کہ وہ باوجود اس یقین کے کہ حقائق اشیاء اس کے لئے ناقابل ادراک ہیں اپنے تیئں سوسائٹی کے احکام داد امر پر چھوڑ دے، اور جو رسم و رواج اپنے گرد و پیش دیکھے عمل کے لئے انھیں کو اختیار کرتا ہے۔"

کینٹ (Kant) کہ جسکا وہی مرتبہ فلاسفہ یورپ میں ہے، جو یونانیوں میں فلاطون کا تھا، دو تصانیف خصوصیت کے ساتھ مشہور ہیں۔ ایک "عقل مجرّد "Pure Reason" " پر ہے، اس میں وہ نفس بشری کی محققانہ تحلیل اور انسانی معلومات پر شرح و بسط و بحث کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ انسان کے لے ماہیت اشیاء کا علم ناممکن ہے، اور اسرار کائنات کی عقدہ کشائی کے جب وہ درپے ہوا تو ہمیشہ ناکامی و گمراہی اسکے نصیب میں رہی، چنانچہ وجود باری، وجود روح، حیات بعد الموت، جو آلھیات کے مہمات مسائل ہیں، ان پر اگر خالص عقلی و استدلالی حیثیت سے نظر کیجائے تو انکی نفی و اثبات دونوں پر مساوی درجہ کے شواہد ملتے ہیں، اس طرح جتنے مباحث ماہیت اشیاء سے متعلق ہیں اس سب کی یہ کیفیت ہے، کہ انسان ان پر جس قدر زیادہ غور فکر کرتا ہے اسی قدر وہ اور زیادہ غامض، سربستہ ولاینحل ہوتے جاتے ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان کو عقلی حیثیت سے کسی مسئلہ کی کُنہ پر لقیاً یا اثباتاً کوئی حکم لگانے کا حق نہیں۔ لیکن حیات نظری کے علاوہ انسان حیات عملی بھی رکھتا ہے، جس سے متعلق کینٹ اپنی دوسری کتاب "عقل عملی "Practical Reason" میں بالتفصیل بحث کر کے یہ نتیجہ نکالتا ہے، کہ جن مسائل غامضہ کے حل کرنے میں ہمارے قواے مفکّرہ ناکام رہتے ہیں وہ بالآخر ہمارے قواے عملیہ کی مدد سے صاف ہو جاتے ہیں اور خدا، روح، و حیات بعد الموت کے وجود کو، جسکی طرف سے ہم عقلا و استدلالا مایوس ہو چکے تھے انھیں ہمیں اپنی عملی ضروریات کے لحاظ سے اعتقادالا محالہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ہیئت اجتماعیہ کی بہبود، نظام اخلاق کی بقاء، افراد کا سکونِ خاطر، شیرازہ عمرانی کی جمعیت، سب ان تین ہستیوں کے صحیح کرنے کے ساتھ وابستہ ہے (کینٹ کی تحقیقات کے صرف نتائج یہاں درج کیے گئے ہیں، ورنہ اسکے دلائل و شواہد کا اگرچہ اختصار کے ساتھ بھی خلاصہ کیا جاتا تو دو ایک جزو سے کم میں ان کی گنجایش نہ تھی۔ (عبدالماجد(

اسکے بعد انیسویں صدی کے رہبران لاادریت میں سب سے زیادہ ممتاز اسپنسر وہکسلے گزرے ہیں، جنکے عقب میں ڈارون، ٹنڈل، یل، مارلی وغیرہ متعدد مشاہیر عصر کے نام بھی نظر آتے ہیں، ان لوگوں کے عقاید اگرچہ تفصیلات میں باہم خود مختلف و متناقض ہیں، لیکن اصولا و اجمالا کینٹ و ہیوم کی صداے بارگشت ہیں، یعنی اسقدر اس سب کو مسلم ہے کہ حقایق اشیاء کا علم حواس و عقل کے ذریعہ نہیں ہوتا البتہ یومیہ زندگی کی عملی ضروریات کے لحاظ سے ہمیں مظاہر طبعی پر پورا اعتماد رکھنا چاہیے اور جہاں عقل کی دسترس نہیں وہاں اعتقاد کا سہارا

ڈھونڈھنا چاہیے، بیانات بالا سے تشکیک کے متعلق جو معلومات حاصل ہوئے، انکا ماحصل ہم دفعہ وار درج ذیل کرتے ہیں اور انکے مقابلہ میں مذہب کی تائید یا تردید بھی دکھاتے ہیں:

تشکیک: حقایق اشیاء انسان کی نظر سے مجہول ہیں۔ انسان کی معلومات کائنات کے اوپری و سطحی حصّہ تک محدود ہیں۔

مذہب: مذہب اسکو بہ لسان تمثیلی یوں کہتا ہے کہ آدم کو صرف ''اسماء'' بتائے گئے، ماہیت اشیاء کے علم کا مذہب نے کبھی دعویٰ نہیں کیا۔

تشکیک: اصل حقیقت کے لحاظ سے یہ کوِ ِ ئی شخص نہیں فیصلہ کر سکتا کہ راہ حق پر کون ہے۔ مختلف اشخاص اپنے گرد و پیش کے رسم و رواج میں گرفتار ہیں کہ یہی طریقہ انکے لے آسان و قابل عمل ہے۔

مذہب: مذہب کہتا ہے: کل یعمل علٰی شاکلتہ وربّک اعلم بمن ھواھدی سبیلا۔ کہہ دو کہ ہر شخص اپنے طریقہ پر کام کرتا ہے پھر تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ سب سے زیادہ ٹھیک راہ پر کون ہے۔ (سورۃ الاسراء، آیت 84)

تشکیک: بیشمار چیزیں عقل کی دسترس سے باہر ہیں، اسلیے عقل کو ہر شے کی واقفیت و غیر واقفیت یا صدق و کذب کا معیار قرار دینا خود ہماری نادانی ہے۔

مذہب: بالکل یہی ہدایت مذہب نے بارہا کی ہے۔

تشکیک: ہیئیت اجتماعیہ بلکہ خود انسانی زندگی کو قائم رکھنے کے لے اصل لازمی شے عقلی دلائل و براہیں نہیں، بلکہ مستحکم معتقدات ہیں۔

مذہب: مذہب کا دار و مدار اسی اصول پر ہے۔

تشکیک: عقاید آرا میں بے حد اختلاف کا باعث یہ ہے کہ مختلف افراد خود اپنی فطرت کے لحاظ سے باہم متباین ہیں۔

مذہب: مذہب نے اس اختلاف خلقت پر بار بار زور دیا ہے، کہیں کہا ہے 'اُنظر کیف فضلنا بعضھم علی بعض' اور کہیں کہا ہے کہ اگر مشیت ایزدی ہوتی تو سب انسان یکساں پیدا کے جاتے مگر ایسا نہیں کیا گیا، اور اسلیے ان میں اختلاف باہمی کا سلسلہ غیر منقطع قایم رہے گا۔ تشکیک کا قدم یہیں آکر رُک جاتا ہے کہ عقل انسانی حقائق کے علم سے قاصر ہے لیکن مذہب اس سے ایک قدم اور آگے بڑھاتا ہے کہ ہم حقائق کے علم سے عاجز ہیں لیکن ایک اور مافوق ذات ہے جو ان حقائق کی خالق اور عالم ہے اور ہماری عقل و قوت کا قصور ہی اس کامل العقل

والقویٰ ذات کے وجود کی دلیل ہے، متشککین کو اگر اس حقیقت میں بھی تزلزل ہے اور انکو انکے اصول کے مطابق ہونا چاہیے، تو ہم کہیں گے،

وہی پر گر پڑا کبوتر کا

جس میں نامہ بندھا تھا دلبر کا

لفظ ''دلیل'' کو سن کر ان کو مضطرب نہ ہونا چاہیے ورنہ اپنی تشکیک میں بھی انکو تشکیک چاہیے اس طائفہ عالیہ میں سنا ہے اس رتبہ کے لوگ بھی موجود ہیں۔

جس نے تجکو پایا۔ وہ آپ سے کھویا گیا

ماہنامہ معارف۔ دارالمصنفین، 1924

اسلام اور الحاد—ایک موازنہ

کسی بھی چیز کی مارکیٹنگ کے لئے اس کا خوشنما یا دلکش ہونا ضروری ہے۔ جتنی زیادہ وہ پراڈکٹ خوشنما اور دلکش ہو گی اتنی زیادہ تیزی سے پھیلے گی۔ ''حضرت انس بن مالک رض سے روایت ہے کہ رسول للہ صلی للہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جنت ناپسندیدہ چیزوں سے ڈھکی ہوئی ہے اور جہنم نفسانی خواہشات سے ڈھکی ہوئی ہے۔'' صحیح مسلم۔ کتاب الجنتہ وصفتہ نعیمھا۔

اس حدیث میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ جنت میں جانے کے لئے ہر وہ کام کرنا ضروری ہے جو انسانی نفس پہ بھاری ہوتا ہے۔ جیسے نماز پڑھنا۔ روزہ رکھنا۔ ایک دوسرے سے اچھا سلوک کرنا اور جہنم میں جانے کے لئے نفس کی پیروی کافی ہے۔ جو دل چاہے کرتے پھرو۔

اس اعتبار سے دین اسلام کو ایک فلاپ شو ثابت ہونا چاہیئے تھا۔ مگر کچھ ہی عرصے میں یہ دنیا میں سب سے زیادہ تیزی سے پھیلنے والا مذہب بن گیا۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ الحاد بہت تیزی سے پھیل رہا ہے۔ مگر بد قسمتی سے پاکستان میں نہ تو الحاد کا کوئی حال ہے نہ مستقبل۔ الحاد کے پھیلنے کا حلقۂ احباب آج بھی وہی طبقہ ہے جو دین میں رہتے ہوئے دین سے متنفر تھا۔ اپنی مرضی سے جینے کا خواہشمند تھا۔ جن ممالک میں لوگ دینی معمولات میں دلچسپی نہیں لیتے ان ممالک میں الحاد کے پھیلاؤ کی رفتار نسبتاً تیز ہے۔

الحاد اصل میں ہے کیا؟ محض نفس کی پیروی۔ یعنی جو دل چاہے وہ کرو۔ چاہے اس کے معاشرے پر کچھ بھی اثرات مرتب ہوتے ہوں۔ اس کو اپناتے وہی ہیں جو دین میں رہتے ہوئے بھی نفس کی پیروی کے خواہش مند تھے۔ الحاد نے انہیں معاشرے کی ملامت سے بچانے

کے لئے ایک پلیٹ فارم مہیا کر دیا۔ اسلام انسان کو پابند بناتا ہے جب کہ الحاد انسان کو آزاد بناتا ہے۔ مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ جس قسم کی الحادی تعلیمات ہیں اسے تو دنیا میں ہاتھوں ہاتھ لیا جانا چاہئے تھا؟

اسلام میں شراب پینے پر پابندی ہے کیوں کہ یہ نہ صرف انسان کی اپنی صحت کے لئے مضر ہے بلکہ آس پاس کے لوگوں کو بھی مصیبت میں ڈال دیتی ہے۔

مگر الحاد اس پابندی سے آزاد ہے۔ شراب پیئیں۔ جوا کھیلیں۔ زنا کریں۔ جو دل چاہے وہ کریں۔ یہ زندگی نہ ملے گی دوبارہ۔ اس بیچ کسی اور کو نقصان پہنچتا ہے تو پہنچتا رہے۔ الحاد کے پاس اس مسئلے کا کوئی حل نہیں۔

اسلام آپ کو پابند بناتا ہے کہ صبح سورج نکلنے سے کچھ پہلے اٹھ کر نماز پڑھو۔ اپنے رب کو یاد کرو۔ دوپہر ہو تو دوبارہ وضو کر کے دوبارہ نماز پڑھو۔ پھر سہ پہر کو نماز۔ پھر غروب آفتاب اور پھر رات کو سوتے وقت۔

مگر الحاد میں ایسی کوئی پابندی نہیں۔ جب تک دل چاہے رات جاگتے رہو۔ جب دل چاہے سو جاؤ اور پھر جب دل چاہے سو کر اٹھو۔ نہ وضو کی پابندی نہ غسل کی۔

اسلام میں ایسی پابندی اور الحاد میں ایسی سہولت کے باوجود سب سے زیادہ تیزی سے پھیلنے والا مذہب آج بھی اسلام ہے۔

اسلام میں خواتین کو پردے کا حکم ہے اور مرد کو نگاہیں نیچی رکھنے کا۔ اسلام آپ کو کچھ عورتوں تک محدود کرتا ہے۔

جبکہ الحاد میں مادر پدر آزادی۔ جس کو مرضی دیکھو جیسے مرضی دیکھو۔ پردے تو کیا کپڑوں کی بھی کوئی شرط نہیں۔ ننگے گھومنے سے وٹامن ڈی حاصل ہوتا ہے۔ شادی کا کوئی جھنجٹ نہیں۔ جتنی مرضی عورتوں سے تعلقات قائم کرو۔

مگر ان تمام پابندیوں کے باوجود آج بھی دنیا میں سب سے زیادہ تیزی سے پھیلنے والا مذہب اسلام ہی ہے۔

الحاد میں موت کے بعد زندگی کا کوئی تصور نہیں۔ جو مرضی کرو۔ اگر دنیا میں سزا سے بچ گئے تو کامیاب۔ ڈاکے ڈالو۔ چوری کرو۔ قتل و غارت۔ غرض دوسرے کی دنیا تباہ کر کے اپنی زندگی اچھی کر لینا اس وقت تک کوئی جرم نہیں جب تک آپ پکڑے نہیں جاتے۔ اور اگر پکڑے گئے تو اس بات کے قوی امکانات موجود ہیں کہ آپ دولت کے ذریعے نظام خرید لو اور باعزت بری ہو جاؤ۔

مگر اسلام میں انسان کے پاس ایک نظریۂ حیات ہے۔ قران پاک کی سورہ الزلزال۔ آیت نمبر 7 اور 8 میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

تو جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہو گی وہ اس کو دیکھ لے گا ﴿۷﴾ اور جس نے ذرہ بھر برائی کی ہو گی وہ اسے دیکھ لے گا ﴿۸﴾

دنیا میں قوانین کا ڈر اپنی جگہ مگر آخرت میں بھی سزا کا ڈر ہے۔ آپ جتنے مرضی طاقتور ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ سے زیادہ طاقتور نہیں ہو سکتے۔ جب حساب ہو گا تو بادشاہ کا بھی ہو گا اور فقیر کا بھی۔

اسلام میں ایک نظام ہے زکات کا نظام۔ جس شخص کا مال ایک مخصوص حد سے تجاوز کر جائے گا وہ اس کا کچھ حصہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا پابند ہو گا۔

اس ٹیکس کا اطلاق غریب آدمی پر کسی صورت نہیں ہوتا۔ بلکہ غریب آدمی یہاں ٹیکس لینے والوں میں سے ہو گا اور میرے نزدیک یہ دنیا کے تمام نظاموں میں واحد ٹیکس ہے جس کو وصول کرنے والا غریب ہے۔

کسی چیز کی مارکیٹنگ کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اسے امراء میں مقبول بنایا جائے۔ مگر اسلام میں مروجہ یہ زکات کا نظام امراء کے لئے ہر گز کوئی کشش نہیں رکھتا۔ یہ خالصتاً غریبوں کی مدد کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود اسلام کا تیزی سے پھیلنا بذات خود اس کے حق ہونے کی دلیل ہے۔

زکات کے نظام کا مقصد ایک تو غربت کو ختم کرنا ہے دوسرا دولت کو امیر آدمی کی بند تجوری سے باہر لا کر معیشت کو بہتر بنانا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

سورہ التوبہ آیت نمبر 34

مومنو! (اہل کتاب کے) بہت سے عالم اور مشائخ لوگوں کا مال ناحق کھاتے اور (ان کو) راہ خدا سے روکتے ہیں۔ اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو خدا کے رستے میں خرچ نہیں کرتے۔ ان کو اس دن عذاب الیم کی خبر سنا دو ﴿۳۴﴾

زکات کے نظام میں جس شخص کے پاس ساڑھے سات تولے سونا یا ساڑھے باون تولے چاندی یا اس کے مساوی رقم ہو اور اس پر ایک سال گزر جائے وہ اس کا چالیسواں حصہ زکات میں دینے کا پابند ہو گا۔ اور یہاں حکم نفل یا سنت کا نہیں بلکہ براہ راست فرض کا ہے۔ یعنی جو ایسا نہ کرے وہ سخت گناہ گار ہو گا۔ میں دنیا میں رائج انسانی ہاتھوں کے تیار کردہ ٹیکس کے نظام دیکھتا ہوں اور ان کا موازنہ زکات کے نظام سے کرتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے۔ ہر ٹیکس کے نظام میں سقم پائے جاتے ہیں جن کی روشن مثال آج ہمارے حکمرانوں کے عدالتوں میں

چلتے ہوئے مقدمے ہیں۔ مگر زکات کے نظام میں میں ایسا کوئی سقم نہیں پاتا۔اس سے بچنا ممکن نہیں سوائے اس کے کہ آپ اس کا ڈھٹائی سے انکار کر دیں۔ کوئی ارب پتی شخص عدالت میں کھڑا ہو کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ میری تو کمائی ہی پانچ ہزار روپے ماہانہ ہے اور باقی جو کچھ بھی ہے وہ میرے بچوں کا ہے میرے نام پر کچھ بھی نہیں۔ زکات کا اطلاق آمدنی پر نہیں بلکہ جمع شدہ مال پر ہوتا ہے۔اب وہ جمع شدہ مال آپ کا ہے یا آپ کے بچوں کا۔ بے شک آپ کسی کالے چور کے نام لگا دیں زکات دینی پڑے گی۔ جس کے پاس سے نکلے گا وہی زکات دے گا۔زکات خصوصی طور پر آپ کے اس مال کو ٹارگٹ کرتی ہے جسے آپ نے بلاک کر لیا ہے۔مارکیٹ سے دور کر دیا ہے۔

مثال کے طور پر اگر آپ کے پاس ساڑھے سات تولے سونا موجود ہے تو آپ دو میں سے ایک کام کر سکتے ہیں۔یا تو اس کو تجوری میں چھپا لیں اور ہر سال اس پر زکات دیتے رہیں۔یا اس کو کسی کاروبار میں شامل کر دیں۔جو کچھ مجھے سمجھ آیا وہ یہ ہے کہ زکات کے پورے نظام کا مقصد زکات کی وصولی سے زیادہ مال کو تجوریوں سے باہر نکلوا کر مارکیٹوں میں لانا ہے۔ کیوں کہ دوسری صورت زیادہ فائدہ مند نظر آتی ہے۔ذرا کیلکولیٹ کریں تو آج کے حساب سے ساڑھے سات تولے سونے کی قیمت ساڑھے تین لاکھ کے آس پاس بنتی ہے اور اس پر سال بھر بعد جو زکات لاگو ہو رہی ہے وہ نو ہزار کے آس پاس ہے۔

یہ نو ہزار روپے زکات کے نام پر کسی شخص کو دینے میں لینے والے کا شائد اتنا فائدہ نہ ہو جتنا دینے والے کا نقصان ہے۔اس کا مال ہر گزرتے سال نو نو ہزار کر کے کم ہوتا چلا جائے گا۔(واضح رہے یہ میں ایک کاروباری شخص کی سوچ بتا رہا ہوں ورنہ زکات دینا باعث برکت ہے اور اس سے مال کم نہیں ہوتا)۔ جو شخص کاروباری ہو گا وہ یقیناً نو ہزار روپے ہر سال کم کروانے سے بہتر یہ خیال کرے گا کہ اس ساڑھے تین لاکھ کو مارکیٹ میں ڈال دیا جائے تاکہ یہ بجائے کم ہونے کے بڑھنا شروع ہو جائیں اور اس کا یہ عمل معاشرے کی ترقی کے لئے اس نو ہزار سے کہیں زیادہ فائدہ مند ثابت ہو گا۔

جس شخص کے پاس ایک سے زائد مکان ہیں اس کے اضافی مکان پر زکات لاگو ہوتی ہے۔ مگر اس میں کچھ مستثنات ہیں جن کو سمجھنا ضروری ہے۔

اگر وہ شخص ایک مکان میں خود رہتا ہے اور دوسرے کو خالی چھوڑ دیتا ہے تو اس پر مکان کی قیمت کے حساب سے زکات لاگو ہو گی۔ لیکن اگر وہ اسی مکان کو کسی کو معاوضے کے عوض رہنے کے لئے دے دیتا ہے تو اس پر وصول کردہ معاوضے کے حساب سے زکات لاگو ہوتی ہے ۔ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ پہلی صورت میں اگر مکان کی قیمت ایک کروڑ ہے تو زکات کی رقم ہر سال ڈھائی لاکھ دینا پڑے

گی۔ دوسری صورت میں معاوضہ اگر ایک لاکھ روپے سالانہ طے ہوا ہے تو زکات ڈھائی لاکھ سے گھٹ کر ڈھائی ہزار پر آجائے گی۔ یقیناً جو شخص صاحبِ مکان ہے وہ مکان کو خالی چھوڑنے کے بجائے کسی کو معاوضے پر رکھنے کو ترجیح دے گا۔ جس سے مارکیٹ میں کرائے کے مکانوں میں زیادتی ہو جائے گی اور نتیجتاً کرائے میں کمی واقع ہو گی۔

زراعت کے شعبے میں فصل کٹائی پر زکات (عشر) لاگو ہوتی ہے۔ اس پر سال پورا ہونے کی شرط نہیں۔ جیسے ہی فصل تیار ہو گی اور اس کی کٹائی ہو گی اسی وقت زکات نکال لی جائے گی۔

اس میں بھی کئی باتیں انتہائی غور طلب ہیں۔ مثلاً وہ زمین جو زراعت کے لئے ہے مگر خالی پڑی ہے اور اس پر کاشت نہیں کی جارہی اس زمین پر زمین کی قیمت کے حساب سے زکات لاگو ہو گی۔ مگر اسی زمین پر آپ گندم کاشت کر لیجیئے تو اسی گندم کا کچھ حصہ آپ کو زکات میں دینا پڑے گا جو آپ نے اس زمین پر اگائی ہے اور آپ اصل زمین پر زکات دینے سے بچ جائیں گے۔ یعنی اگر آپ کاشت نہیں کرتے تو ہر سال آپ کی زمین پر جو زکات کٹ رہی ہے وہ آپ کی جمع شدہ رقم میں سے منہا ہوتی چلی جارہی ہے۔ مگر اگر آپ اس زمین پر گندم کاشت کر لیں تو زکات میں اسی گندم کا کچھ حصہ دیا جائے گا اور اصل زمین وہیں کی وہیں رہے گی۔

زکات کی ان شرائط پر اگر گہرائی میں جا کر غور کیا جائے تو اس دنیا میں مہنگائی کے بڑھنے کی جو سب سے بڑی وجہ ہے وہ یہی ہے کہ کچھ سرمایہ کار محض قیمتوں میں اضافے کی غرض سے اپنی زمینیں خالی چھوڑ دیتے ہیں اور ان پر کاشت نہیں کرتے۔ جس سے خورد و نوش کی اشیاء کی مصنوعی قلت پیدا کر دی جاتی ہے اور پھر من چاہے دام وصول کیئے جاتے ہیں۔

جیسے جیسے انسان زکات کے نظام کو پڑھتا چلا جاتا ہے اسے دینِ اسلام کی حقانیت کا یقین آتا چلا جاتا ہے کہ اتنا زبردست نظام کی انسان کے دماغ کی اختراع نہیں ہو سکتی۔

بنیادی طور پر جو زکات کے نظام کا اصول ہے وہ یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اگر اصل چیز پہ زکات نہ دینا چاہیں تو اس کو مارکیٹ میں لے کر آئیں۔ اسی سے مزید مال کمائیں اور اس کمائے ہوئے مال پر زکات دیں دیں۔ اصل محفوظ رہے گا۔ دوسری صورت میں اصل آہستہ آہستہ خرچ ہوتا رہے گا۔

الحاد تو کیا پوری دنیا میں اس کے متوازی کوئی نظام نہیں۔

تحریر محمد سلیم

سائنس، فلاسفی آف سائنس اور ملحدین کی دھوکے بازی

سائنس ''اور'' فلاسفی آف سائنس ''میں فرق:

ملحدوں اور دہریوں کے مغالطوں میں سے ایک بہت بڑا مغالطہ جو کہ یہ لوگ سادہ لوح انسانوں کا ایمان بگاڑنے کے لیے استعمال کرتے ہیں، یہ ہے کہ یہ لوگ ''فلاسفی آف سائنس ''کو ''سائنس ''بنا کر پیش کرتے ہیں۔ یہ ''لوہے ''کو ''سونے ''میں ملا کر سونے کا تاثر دے کر بیچتے ہیں۔ ''سائنس ''اور چیز ہے اور ''فلاسفی آف سائنس ''اور چیز ہے۔ خالص سائنس (pure science) نہ تو خدا کا انکار کرتی ہے اور نہ ہی اثبات۔ البتہ خدا کے اثبات کی ایک علامت ضرور ہو سکتی ہے۔ اس لیے خالص سائنسدان (pure scientist) کبھی بھی دہریہ نہیں ہو گا، بلکہ یا تو خدا کا اثبات کرے گا، جیسا کہ اکثر کا معاملہ ہے، یا پھر عاجزی کا اظہار کرے گا کہ مجھے نہیں معلوم، یا یہ کہے گا کہ یہ سائنس کا میدان نہیں ہے۔

ملحد ہمیشہ یہ کہتے ہیں کہ ہم آزاد خیالی (free thinking) کے قائل ہیں کہ جسے عقلی تفکر (rational thinking) کا نام بھی دیتے ہیں، حالانکہ ان کا سوچ وبچار متعصب اور جانبدار (biased) ہوتا ہے۔ خدا کے وجود کے بارے میں آزاد خیالی کا نتیجہ لا ادریت (agnosticism) تو ہو سکتا ہے لیکن دہریت اور انکارِ خدا (atheism) کسی صورت نہیں۔ دہریت اور الحاد کا مطالعہ

بتلاتا ہے کہ وہ ایک جارحانہ رویہ (aggressive attitude) ہے لہٰذا کسی صورت حقیقت کی طرف رہنمائی کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا ہے۔اور جہاں تک لاادریت کا معاملہ ہے تو اس کا علاج علم سے ہو سکتا ہے۔

فزکس کہ جس کا لیبارٹری میں اثبات کیا جاتا ہے 'خالص سائنس کا میدان ہے اور فلاسفی آف سائنس (نظریاتی فزکس) کے اکثر مباحث ''ظن و تخمین'' سے زیادہ کچھ نہیں ہیں۔اسٹیون ہاکنگ، کارل ساگاں اور رچرڈ ڈاکنز تینوں یہی کرتے ہیں کہ ''فلاسفی آف سائنس'' کو ''سائنس'' بنا کر پیش کرتے ہیں۔ نظریاتی سائنس میں جو کچھ پیش کیا جارہا ہے، وہ سائنس کا مذہبی ورژن ہے کہ جسے ماننے کے لیے سائنسدانوں پر اس سے زیادہ ایمان لانا پڑتا ہے کہ جتنا کسی نبی اور رسول پر ایمان لانے کا مطالبہ ہے۔ثقبِ کُرم (worm hole) ، ثقب اسود (black holes) متوازی زمین (parallal earth) ، کثیر کائنات (multiverse) کے تصورات سائنس کی دنیا کے ''ہیری پوٹر (harry potters) ''نہیں تو اور کیا ہیں؟ان میں اور مذہبی معتقدات پر ایمان لانے میں کتنا فرق ہے؟) بگ بینگ پر ایمان کو بھی اسی فہرست میں شامل کر لیں کہ اس کی سائنسی دلیل ملحدوں کی نظر میں ''کوانٹم گریوٹی'' ہے۔اور اب مذہبی بے وقوف یہ سوال کریں گے کہ ''کوانٹم گریوٹی'' کیا چیز ہے؟ بھئی، ابھی ہم اس دلیل کی تلاش میں ہیں، ہم اسٹرنگ تھیوری سے ایم تھیوری تک پہنچ چکے ہیں اور ایم تھیوری بس اپنے آخری مراحل میں ہی ہے۔جب مکمل ہو جائے گی تو تمہیں بھی بتلا دیں گے۔اس پر ایک مومن اس کے علاوہ اور کیا تبصرہ کر سکتا ہے کہ اے ملحدوں کی جماعت! یہ اپنے احکام عشرہ Ten Commandment اپنی جیب میں رکھو اور جب تک اپنے موقف کے حق میں کوئی سائنسی دلیل وضع نہیں کر لیتے اس وقت تک سائنس کے نام پر مذہب کو چیلنج دینا بند کر دو۔

مذہبی معتقدات اور سائنسی ایمانیات(Religious Doctrines and Scientific Beliefs) :

فرشتوں کو وجود پر یقین رکھنا سائنسی طرزِ فکر نہیں ہے، البتہ خلائی مخلوق (alliens) کے وجود پر ایمان لانا عین سائنسی طرزِ فکر ہے؟ کیا یہ دوغلی پالیسی نہیں ہے کہ جو ملحدوں نے اختیار کی ہوئی ہے؟جب اسٹیون ہاکنگ نے کہا کہ ان کا سائنسی دماغ یہ کہتا ہے کہ ہماری زمین کے علاوہ بھی کسی سیارے پر کوئی مخلوق آباد ہے، اس وقت ناول نگاروں اور مووی میکروں کی چاندی ہو گئی ہے۔اور تو اور ''ٹام اینڈ جیری'' بھی مریخ پر خلائی مخلوق سے ملاقات کر کے واپس آچکے ہیں۔اب بھی اگر مؤمن نہ مانیں تو ملحد انہیں دقیانوس، سائنس مخالف، مذہبی ملا نہ کہیں تو اور کیا کہیں؟اور اب تو سائنسی عقیدہ صرف خلائی مخلوق کے وجود کا نہیں ہے بلکہ اس کا نیا ورژن یہ ہے کہ یہ خلائی مخلوق اس دنیا

پر حملہ کر کے انسانوں کو تباہ کر دے گی اور یہ کسی سائنسی فلم کے ہیرو کا ڈائیلاگ نہیں بلکہ اسٹیون ہاکنگ جیسے سائنسدان کے خیالات عالیہ ہیں جو ''دی گارڈین'' میں شائع ہو رہے ہیں۔ (Alok Jha, Is Stephen Hawking right about Aliens?,Retrieved 7 January , 2016 from)

اور ناسا (NASA) نے نہ صرف خلائی مخلوق کی کھوج شروع کر دی ہے بلکہ انہوں نے 2025ء تک انہیں ڈھونڈ نکالنے کی پیشین گوئی بھی کی ہے۔ (Mike Wall , Signs of Alien Life Will Be Found by 2025 , NASA's Chief Scientist Predicts , Retreived 7 january , 2015)

ہاں، مومنوں کو خلائی مخلوق کے وجود کی دلیل چاہیے تو Tom and Jerry:Blast Off to Mars دیکھ لیں۔ خلائی مخلوق کے نام پر فلم انڈسٹری کی ریٹنگ جاری ہے تو سائنسدانوں کی فنڈنگ۔ اسٹیون ہاکنگ کو جو خیالات چھو گزرتے ہیں، وہ وحی کا مقام رکھتے ہیں کہ ان پر کوئی سوال یا اعتراض ''مذہب سائنس'' سے بغاوت کا اعلان کرنے کے مترادف ہے کہ جس کی کم از کم سزا ''جہالت کا سرٹیفکیٹ'' ہے جو آپ کو فوراً عطا کر دیا جائے گا۔

باقی، فرشتوں پر ایمان لانے کے لیے ضروری ہے کہ سائنسی اور عقلی طرزِ فکر اپنایا جائے، لیکن خلائی مخلوق پر ایمان لانے کے لیے سائنسدانوں کا اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ اس کا وجود ہے، لہٰذا اب خلائی مخلوق کا وجود سائنسی طرزِ فکر سے ثابت شدہ امر بن چکا ہے۔ اور اگر مومنوں نے سائنس دشمنی میں نہیں ماننا، تو نہ مانیں۔

امر واقعہ یہ ہے اور ہم بار بار اس کی طرف توجہ دلا رہے ہیں کہ ہم کلاسیکل سائنس کے دور سے ماڈرن سائنس کے دور میں داخل ہو چکے ہیں جو کہ اکثر و بیشتر (خالص سائنس نہیں بلکہ) نظریاتی سائنس ہے اور ثبوت میں مذہب کی طرح اندھے ایمان (blind faith) کی متقاضی ہے۔ کشش ثقل (gravity) اور رد عمل کا قانون وغیرہ کلاسیکل فزکس کے موضوعات ہیں کہ جن کا مشاہدہ ہر شخص کر سکتا ہے۔ ماڈرن فزکس کے موضوعات مابعد الطبیعی (metaphycal) ہیں جو کہ مذہب کے ہیں۔ اور ان موضوعات پر سائنسدانوں کے غور و فکر کرنے اور ان کو ثابت کرنے کا طریق کار بھی کل کا کل مذہبی نوعیت ہی کا ہے۔

مثلاً ملحد واقعہ معراج پر اعتراض کرتے ہیں لیکن چاند پر لینڈنگ پر ایمان رکھتے ہیں حالانکہ انہوں نے دونوں کا مشاہدہ نہیں کیا ہے۔ تو یہ فرق کیوں؟) اب اس کے جواب میں یہ کہنا کہ چاند پر لینڈنگ کی تو ویڈیو موجود ہے جو ہر شخص دیکھ سکتا ہے، ایک بچگانہ رویہ ہے جبکہ

روسی سائنسدان عرصہ دراز سے یہ دعوٰی کر رہے ہیں کہ وہ ویڈیو اسٹوڈیو میں بنائی گئی ہے۔ اور امریکیوں کی ایک اچھی خاصی تعداد خود اس کی قائل نہیں ہے کہ امریکی چاند پر اترے ہیں اور وہ اسے خلائی دور میں روس پر امریکہ کی فتح حاصل کرنے کی خواہش کی ایک بھونڈی چال قرار دیتے ہیں۔ چاند پر لینڈنگ کی جو ویڈیو امریکی ٹیلی ویژن پر 1969ء میں دکھائی گئی، وہ یوٹیوب وغیرہ پر ملاحظہ کی جاسکتی ہے، اس میں واضح طور امریکی پرچم چاند کی سرزمین پر لہراتا ہوا نظر آرہا ہے کہ جس دیکھنے والوں کو یہ ایمان نصیب ہوتا ہے کہ چاند پر امریکی پرچم گاڑتے وقت اچھی خاصی آندھی جاری تھی۔ علاوہ ازیں ناسا NASA نے چاند پر لینڈنگ کی جو تصاویر جاری کی ہیں، ان میں واضح طور دیکھا جاسکتا ہے کہ چاند پر اترنے کی تصاویر کے پس منظر میں کوئی ستارے موجود نہیں ہیں یعنی خلاء میں اکیلا چاند ہی چاند ہے۔ علاوہ ازیں تصاویر میں چاند کی سطح پر جو سائے پڑ رہے ہیں، وہ مخالف سمت میں ہیں۔ اگر چاند پر روشنی کا واحد ذریعہ سورج ہے تو سب چیزوں کے سائے ایک ہی سمت میں ہونے چاہیئں نہ کہ مخالف سمتوں میں۔ یہ معلوم نہیں کیا کہانی ہے؟ پھر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ناسا NASA یہ کہتا ہے کہ چاند پر لینڈنگ کی اصل ویڈیو ضائع ہوگئی ہے لہٰذا ثبوت مانگنے والے روسی سائنسدانوں کے لیے اب ہمارے پاس دینے کو کچھ نہیں ہے۔ پھر یہ بھی سوال ابھرتا ہے کہ چاند پر اترے چالیس برس سے زائد کا عرصہ گزر گیا، دوبارہ جانے کی توفیق کیوں نصیب نہ ہوئی۔ ہمیں اس ساری بحث میں چاند پر اترنے کے سائنسی عقیدے کو چیلنج دینا مقصود نہیں ہے بلکہ صرف یہ کہنا مقصود ہے کہ چاند پر اترنا ایک سائنسی واقعہ ہے اور سائنسی طرزِ فکر ہی کی روشنی میں ایسے سوالات کیوں نہیں کیے جاسکتے کہ جن سے اس واقعے کے سچ اور جھوٹ کو پرکھا جاسکے۔ ہمیں صرف یہ بتلانا مقصود ہے کہ ''مذہبی معتقدات پر منطقی سوال اٹھانا عین سائنسی طرزِ فکر ہے جبکہ سائنسی معتقدات پر عقلی سوال پیدا کرنا عین غیر سائنسی طرزِ عمل ہے۔'' کیا یہ اہلِ سائنس کی دوغلی پالیسی نہیں ہے؟

ہمیں یہ کہنا ہے کہ ماڈرن سائنس اور مذہب دونوں کا راستہ ایک ہی ہے، دونوں اپنے ماننے والوں سے ایمان بالغیب کا تقاضا کرتے ہیں، لہٰذا ''اہل سائنس ''کا'' اہل مذہب'' کو مذہبی معتقدات پر کوسنا درست نہیں ہے کہ مذہب کا طریقہ سائنسی نہیں ہے، جبکہ خود ''اہل سائنس ''کا سائنسی ایمانیات کے ثبوت کا طریق کار سائنسی نہیں مذہبی رنگ لیے ہوئے ہے۔ دراصل ماڈرن سائنس اور مذہب دونوں کا طریقہ مذہبی ہے، کیونکہ سائنس اس قسم کے کئی ایک اعتقادات رکھتے ہیں کہ جن کی تصدیق (verification) کے بقیہ دنیا کے پاس نہ تو آلات (tools) ہیں اور نہ ہی ذرائع (resources)۔ بقیہ دنیا اگر سائنسدانوں کی ان باتوں کو مانتی ہے تو صرف ایک ہی راستے سے اور وہ سائنسدانوں پر ایمان لانے اور یقین لانے کا راستہ ہے کہ وہ اس بارے میں سچ کہہ رہے ہیں، جیسا کہ مذہبی لوگوں کو یہ یقین ہوتا ہے کہ نبی اپنے بیان میں سچ ہی ہے۔ جس طرح مذہب میں کچھ باتیں بنیادی عقائد کے طور مانی جاتی ہیں، اسی طرح سائنس میں

بھی ''ایمانیات کا ایک لمبا چوڑا سلسلہ موجود ہے۔ اگر آپ ان سائنسی عقائد میں سے کسی عقیدے کے بارے میں کوئی شبہ تو کجا کسی عقلی و منطقی سوال کا بھی اظہار کر دیں تو لوگ آپ کو بے وقوف، جاہل، ان پڑھ، مولوی، معلوم نہیں کیا کچھ کہیں گے۔ نظریاتی سائنس میں بڑی تعداد میں ملحدین موجود ہیں جو اپنے نظریات کے حق میں دلیل تلاش کم کرتے ہیں اور گھڑتے زیادہ ہیں۔ کبھی خلائی مخلوق کے ثبوت کے لیے ان کو اُڑن طشتریاں (UFO) نظر آنا شروع ہو جاتی ہیں اور کبھی ارتقاء کو ثابت کرنے کے لیے انہیں لاکھوں سال پرانے انسان کی کھوپڑی مل جاتی ہے۔ اب بھی اگر مومن یہ نہ کہے کہ ماڈرن سائنس ایک مذہب ہے جس کے کچھ رسول ہیں کہ جن پر وحی نازل ہوتی ہے اور وہی وحی بالآخر سائنسی ایمانیات کی صورت اختیار کر لیتی ہیں، ان ایمانیات کی تبلیغ کے لیے ملین ڈالرز کی فلم انڈسٹری کام کرتی ہے اور ان کے دفاع کے لیے سائنسدان بلین ڈالرز کے ریسرچ پراجیکٹس کے فنڈز وصول کرتے ہیں، تو کیا کہے؟) ہماری نظر میں عصر حاضر میں سائنسی معتقدات کے ایک تنقیدی مطالعہ کی ضرورت ہے تاکہ سائنس کے نام پر توہم پرستی، مکر و فریب، جھوٹ و دجل وغیرہ سے سادہ لوح انسانوں کا ایمان محفوظ کیا جا سکے۔

، تحریر ڈاکٹر زبیر، کامسیٹ یونیورسٹی، لاھور

اسلام، سائنس اور ملحدین کی سائنس

سوشل میڈیا پر ملحدین کی طرف سے اکثر یہ دعوی کیا جاتا ہے کہ سائنس نے مذہب کا گلا گھونٹ دیا ہے۔ ہمارے ردالحاد کے موضوع پر کام کرنے والے ایک دوست محمد سلیم صاحب نے کچھ عرصہ پہلے اس دعوی کا ملحدین کے انداز میں ہی جواب دیا تھا، یہ جواب واضح کرتا ہے کہ کس طرح ملحدین ایک نیوٹرل علم یعنی سائنس کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں اور پھر اسکو اصلی سائنس بنا کر مذہب کے خلاف پیش کرتے ہیں۔ صاحب تحریر کا لہجہ سخت ہے لیکن انکے بہت سے پوائنٹس متوجہ کرتے ہیں۔ انہی کو دیکھتے ہوئے ہم اس تحریر کو اپنے اس سلسلہ تحاریر میں پیش کر رہے ہیں۔

لوگ عموماً سمجھتے ہیں کہ اسلام سائنس کے خلاف ہے۔ مگر جب میں سائنسی نظریات پہ نظر ڈالتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ اسلام سائنس کے خلاف نہیں بلکہ سائنس اسلام کے خلاف ہے۔ سائنس سے میری مراد یہاں ایسے غیر مسلم سائنس دان ہیں جو اسلام سے شدید نفرت کرتے ہیں۔ اسلام کو نیچا دکھانے کے لئے انہیں اگر کسی غیر سائنسی رویے کو اپنانا پڑے تو وہ اس سے بھی نہیں چوکتے۔ اس مضمون میں میں جہاں سائنس کا لفظ استعمال کروں گا اس سے مراد سائنس دان ہی ہوں گے۔

سائنس کو اگر مریخ پہ پانی کے آثار مل جائیں تو وہاں زندگی کی تلاش شروع ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ جہاں پانی ہو وہاں زندگی کا ہونا غیر یقینی نہیں۔ بغیر یقینی آنکھ سے دیکھے محض شواہد کی بنیاد پر زندگی کا تصور کر لیا جاتا ہے۔ مگر انہی اصولوں پر خدا کی تلاش یا تصور سائنس کے لئے

محال ہے۔ایسے میں سائنس کی ایک اور پالیسی سامنے آتی ہے کہ جو چیز جب تک سائنس کے مشاہدے میں نہ آجائے اس وقت تک سائنس اس چیز کے وجود کو تسلیم نہیں کرتی۔سائنس کے مطابق خدا کی تخلیقات خدا کے وجود کا ثبوت نہیں۔جب تک خدا خود زمین پہ آکر اپنا دیدار نہ کروادے مگر انہی سائنس دانوں کو اگر پچاس لاکھ سال پرانا کوئی دانت مٹی میں دبا مل جائے تو اس پہ پورا ہومو سیپیئن یا نانڈرا تھیال کھڑا کر لیتے ہیں۔مشاہدوں پر مخلوقات کا تصور سائنس کے لئے عمومی بات ہے مگر انہی مشاہدوں پر خدا کا تصور سائنس کے لئے ناممکنات میں سے ہے۔

جو چیز سائنس کے مشاہدے میں نہ آسکے وہ چیز اپنا کوئی وجود نہیں رکھتی۔جادو۔معجزے اور جنات انہی چیزوں میں شامل ہیں۔اسی اصول پر اگر ہم نیوٹن کے لاء آف گریویٹی کو پرکھیں تو اندازہ ہوگا کہ گریویٹی نیوٹن کی دریافت نہیں بلکہ ایجاد تھی۔کیوں کہ نیوٹن کے لاء آف گریویٹی کو متعارف کروانے سے ایک دن پہلے لاء آف گریویٹی کا سائنس کے پاس کوئی مشاہدہ نہ تھا۔اور جس چیز کا سائنس کے پاس کوئی مشاہدہ نہ ہو اس کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔جس طرح خدا کا سائنس کی نظر میں کوئی وجود نہیں۔اور جو چیز وجود ہی نہ رکھتی ہو اسے وجود بخشنے والا اس کا خالق اور موجد کہلاتا ہے نا کہ دریافت کنندہ۔یعنی سائنس کے اسی اصول پر نیوٹن لاء آف گریویٹی کا خالق اور موجد تھا۔

اگر ہم اس اصول کو تمام سائنسی دریافتوں پر اپلائی کر دیں تو وہ سب ایجادات میں تبدیل ہو جائیں گی۔تاوقتیکہ سائنس اس معاملے میں اپنی اصلاح کا اعلان نہ کرے۔بہتر رویہ یہ ہوتا کہ سائنس کچھ معاملات میں اپنی کم فہمی کا ادراک کر لے کہ جس چیز کا مشاہدہ سائنس کے پاس نہ ہو اس کا وجود تو ممکن ہے مگر سائنس ابھی اس معیار پر نہیں پہنچی کہ اس پر گواہی دے سکے۔مگر یہ رویہ سائنس کو خدا کا تصور بھی دے دے گا جو سائنس کے لئے لمحۂ فکریہ ہے۔

پھولوں میں رنگ کون بھرتا ہے؟سائنس کو نہیں پتہ مگر خدا کے سوا کسی نے بھی بھر دئے ہوں گے۔

پھولوں سے خوشبو کیوں آتی ہے؟سائنس نہیں جانتی مگر اس میں خدا کا کوئی کردار نہیں ہو سکتا۔

پھلوں کے ذائقے۔انسان کی تخلیق۔انسان کا اندرونی جسمانی نظام۔یہ سب باتیں کوئی نہ کوئی سائنسی وجہ رکھتی ہوں گی۔مگر خدا نہیں ہو سکتا۔

لاکھوں سال لگتے ہیں ایک بندر کو ارتقا کے مراحل سے گزر کر انسان بننے میں مگر ایک ناپاک قطرہ ماں کے پیٹ میں محض نو مہینے میں انسانی شکل اختیار کر لیتا ہے۔پتہ نہیں اس قطرے میں سے انسانی اعضا برامد ہو جاتے ہیں یا ماں کے پیٹ میں پہلے سے دگنے انسانی اعضا موجود

ہوتے ہوں گے جن میں سے آدھے وہ اپنے بچے کو عنایت کر دیتی ہے۔ چار مہینے میں وہ مردہ قطرہ زندگی کی نمو پا کر حرکت میں آجاتا ہے اور انسان الٹراساؤنڈ مشینوں کی مدد سے محض اس کی حرکات دیکھ کر اپنی ذہانت پہ دل ہی دل میں خوش ہوتا رہتا ہے کہ دیکھو میں کتنا ترقی یافتہ ہوں کہ میں ماں کے پیٹ میں بچے کو حرکت کرتے دیکھ سکتا ہوں۔ بچہ کیسے پیدا ہوتا ہے اس معاملے میں سائنس کے پاس بھی اتنا ہی علم ہے جتنا میری گلی میں گٹر صاف کرنے کے لئے آنے والے جمعدار کے پاس۔ مگر بچہ کیوں پیدا ہوتا ہے۔ اس معاملے میں جمعدار اور سائنس کی جہالت میں کوئی واضح فرق نہیں۔

اللہ تعالیٰ قرآن میں سات آسمانوں کا ذکر کرتا ہے۔ سائنس کو آج تک ایک بھی نہیں ملا لہٰذا آسمان موجود ہی نہیں۔ انسان کی رسائی چاند اور مریخ سے آگے نہ جا سکی۔ مگر جس آسمانِ دنیا پر ستارے ٹانکے گئے ہیں وہی ستارے جو سورج سے بھی لاکھوں نوری سال کی مسافت پہ ہیں ۔اس آسمانِ دنیا کا کوئی وجود نہیں۔ یہ ستارے اگر ٹمٹمانہ رہے ہوتے تو سائنس ان کا بھی انکار کر ڈالتی۔ پھر اگر کسی سائنس دان کو اگر دوربین سے کوئی ستارہ دکھ جاتا تو وہ اس کا دریافت کنندہ نہیں بلکہ خالق بن بیٹھتا۔ کیوں کے سائنس ہی کے مطابق ایک دن پہلے تک اس کا کوئی وجود ہی نہ تھا تو جس نے ڈھونڈ لیا وہ اسی کا۔

سائنس کے مطابق انسان لاکھوں سالوں سے اس دنیا میں مقیم ہے مگر آج تک نہیں جانتا کہ سمندر میں مچھلیوں کی کتنی قسمیں بستی ہیں۔ روزنت نئی مچھلیاں ایجاد ہو رہی ہیں۔ مگر سوری۔ یہاں ایجاد کا لفظ نہیں آئے گا۔ کیوں کہ یہاں سائنس کی تھیوری بدل جاتی ہے۔ سائنس اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ زمین پر لاکھوں سال جوتیاں چٹخانے کے باوجود ہمیں زمین پر موجود تمام مخلوقات کا علم نہیں۔ مگر کائنات جس میں ہم چاند اور مریخ سے آگے کبھی نہ گئے اس کے بارے میں ہمیں پکا پتہ ہے کہ وہاں آسمان نہیں ہو گا۔ للہ ستارے شیاطین کے پیچھے کیسے چھوڑ سکتا ہے یہ تو ممکن ہی نہیں۔

کسی سیارے پہ سائنس کو انسانی فضلے کے شواہد مل جائیں تو پوری زمین کے سائنس دان اپنی ساری مشینری اس انسان کو ڈھونڈنے میں استعمال کر ڈالیں گے۔ کسی کے ذہن میں کبھی بھولے سے بھی خیال نہ آئے گا کہ انسانی فضلہ وہاں خود بخود بھی تو بن سکتا ہے۔ ممکن ہے مادہ اور ضد مادہ آپس میں ٹکرا کر ختم ہو گئے ہوں اور فضلے کی داستان چھوڑ گئے ہوں۔ کسی بگ بینگ کے نتیجے تخلیق پا گیا ہو۔ جی نہیں ایسا کیسے ممکن ہے۔ سائنس اس بات کو نہیں مانتی۔ خود بخود تو صرف کائنات وجود میں آسکتی ہے۔ چاند سورج ستارے وجود۔ میں آسکتے ہیں۔ زمین وجود۔ میں آسکتی ہے۔ انسان وجود میں آسکتا ہے۔ مگر انسانی فضلے جیسی عظیم ترین چیز خود بخود کیسے وجود۔ میں آسکتی ہے ؟

لاکھوں سال پرانے غاروں میں سائنس انسانی ہاتھوں کے بنے نقش و نگار کا پتہ لگاتی ہے اور اس پہ کچھ معترضین تصویریں دکھا دکھا کر ہمیں یقین دلاتے پھرتے ہیں کہ دیکھو انسان بھی موجود اور خود ساختہ مذاہب بھی موجود۔ یہ تو بہت بڑا ثبوت ہے۔ ظاہر ہے انسان تھا تو نقش و نگار بنائے نا۔ کسی بگ بینگ تھیوری کے نتیجے میں نقش و نگار تھوڑی بن سکتے ہیں۔ صرف کائنات بن سکتی ہے۔

حقیقت میں سائنس اور اسلام کا آپس میں کوئی تنازعہ نہیں۔ سائنس تو اصل میں للہ ہی کا انسان کو دیا گیا ایک علم ہے۔ ورنہ اللہ کے لئے کچھ مشکل نہیں تھا کہ بغیر کسی قاعدے اور ضابطے کی محض معجزاتی طور پر یہ پوری کائنات تخلیق کر دیتا اور انسان بے بسی سے پھر اس کائنات کو دیکھ کر حیران ہونے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ تنازعہ اصل میں موجودہ سائنس دانوں کے عقائد کا ہے۔ میری اس تنقید کا کسی سائنس دان کو برا ماننے کی ضرورت نہیں۔ یہ حقائق ہیں۔ جس طرح قانون اندھا ہوتا ہے اس طرح سائنس بھی اندھی ہوتی ہے۔ مگر انسان اندھے نہیں ہوتے۔ عقل و شعور ہمیں ہر اس مقام پر کچوکے لگاتے ہیں جس مقام پر سائنس ہمیں تنہا چھوڑ جاتی ہے۔

کوئی بے جان چیز کسی جاندار چیز کو وجود دے ہی نہیں سکتی یہ سائنس کہتی ہے۔ انسان اور چیمپینزی کی شکل بھی ملتی ہے اور کروموزومز بھی لہٰذا یقیناً انسان چیمپینزی سے ارتقاء پزیر ہوا ہو گا۔ چمپینزی کسی اور مخلوق سے۔ یہ سلسلہ چلتے چلتے ایک یک خلوی جرثومے پہ جا کر اٹک جاتا ہے کہ کیا یک خلوی جرثومہ کسی بے جان چیز سے وجود میں آیا؟ یا کوئی ہے جو ہر قسم کا علم دینے کے بعد بھی بعض معاملات اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے۔ قانون بدلنا آسان ہے عقیدہ بدلنا مشکل۔ ایک دعویٰ یہ کہ جو چیز میرے مشاہدے میں نہیں اس کا کوئی وجود نہیں اور دوسرا دعویٰ یہ کہ ہر موجود چیز میرے علم میں ہے۔ یہ دونوں دعوے ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ میں پہلا دعویٰ کروں اور دوسرے کا انکار کروں تو میرے پہلے دعوے کی وقعت دو کوڑی بھی نہیں۔ مگر سائنس باوجود اس کے کہ دوسرے دعوے کا انکار کرتی ہے مگر پہلے پہ قائم ہے۔ اس کی آخر وجہ کیا ہے؟ وہی وجہ جو میں نے پہلے بتائی کہ قانون بدلنا آسان ہے عقیدہ بدلنا مشکل۔ اگر ہر اس چیز کے وجود کے امکانات کو تسلیم کر لیا جائے جو سائنس کے مشاہدے میں نہیں تو پھر خدا کے ہونے کے امکانات کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا۔ اور اب یہ معاملہ سائنسی قانون کا نہیں بلکہ عقیدے کا ہے۔

ملحدوں کا دعویٰ ہے کہ وہ بنیاد پرست یا عقیدہ پرست نہیں ہیں۔ کیوں کہ بنیاد پرستی اور عقیدہ پرستی مذہبی لوگوں کہ خاصہ ہے۔ ملحدوں کا دعویٰ عقل پرستی کا ہے۔ تو کیا کہتی ہے عقل کہ بے جان سے جاندار کا وجود ممکن نہیں پھر یک خلوی جرثومہ کہاں سے آیا؟ اگر ایک بے جان شے ایک جاندار یک خلوی جرثومے میں بدل سکتی ہے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا جیتے جاگتے سانپ میں کیوں نہیں بدل سکتا؟

اگر جرثومے کے پیچھے کوئی سائنس ہے تو عصا کے سانپ میں بدل جانے کے پیچھے بھی وہی سائنس ہو گی۔ اور اگر عصا کا سانپ بن جانا محض اس لئے ناقابلِ یقین یا معجزہ ہے کہ بے جان سے جاندار کا وجود ممکن نہیں تو یک خلوی جرثومہ بھی ایک معجزہ ہی مانا جائے گا۔ معجزے کا سائنس سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ دونوں الگ الگ میدان ہیں۔ اور اگر یک خلوی جرثومے کی پیدائش کو معجزہ تسلیم کر لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نظریۂ ارتقاء کی بنیاد ہی کا سائنس سے کوئی تعلق نہیں۔ جس قانون کی بنیاد معجزے پر پڑی ہو اس کا سائنس سے بھلا کیا واسطہ؟

پوسٹ کا مرکزی خیال وہی دعویٰ ہے جس کو کوئی ملحد آج تک کسی بھی فورم پہ ثابت نہیں کر پایا مگر ڈھٹائی کا عالم یہ کہ دعوے سے دستبردار بھی نہیں ہوا۔

دعویٰ یہ ہے کہ سائنسی ترقی نے مذہب کا گلا گھونٹ دیا۔ میرے خیال سے اس دعوے کی کوئی حقیقت نہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے جو لوگ مذہب کی لگائی اخلاقی پابندیوں سے مادر پدر آزادی چاہتے ہیں وہ سائنس کے غیر تسلیم شدہ غیر منطقی اور احمقانہ نظریات کو خدا بنا کر پوجنا شروع کر دیتے ہیں۔ سائنس ایک ایسا خدا ہے جو آپ سے کچھ نہیں مانگتا۔ نہ کڑکتی سردی میں صبح صبح اٹھ کر ٹھنڈے پانی سے وضو کر کے فجر کی نماز۔ نہ رمضان میں صبح سے شام تک بھوکا رہنے کی عبادت۔ نہ حج کے سفر کی تنگی۔ نہ زکات کی صورت اپنی کمائی کا مخصوص حصہ کسی غریب کو دینے کا مطالبہ کہ معاشرے کی بھلائی میں کچھ حصہ ڈالا جا سکے۔ بلکہ الٹا یہ تعلیم کہ یہ زندگی بے مقصد ہے

کائنات کی تخلیق؟

بے مقصد

دنیا کی تخلیق؟

بے مقصد

انسان کی پیدائش؟

بے مقصد

سوال یہ ہے جب انسان کی پیدائش ہی بے مقصد ہے تو پھر توہینِ رسالت کے نام پر مسلمانوں کے ہاتھوں ہونے والے قتل پر انسانی ہمدردی کی بین کیوں بجائی جاتی ہے؟ جس کا پیدا ہونا ہی بے مقصد ہو اس کو مارنے کا کم از کم ہمیں ثواب تو ملے۔ بندہ کسی کا بھلا ہی کر دیتا ہے ۔وہ آج نہ مرتا تو کسی اور دن مر جاتا۔ پیدائش کا مقصد ہو نہ ہو کم از کم مرنے کا تو کوئی مقصد ہوتا۔

اب آتے ہیں اصل موضوع پہ۔ میں جاننا چاہوں گا کہ سائنس نے وہ کون سا تیر مارا ہے جس نے مذہب کا گلا گھونٹ دیا۔

اگر ہم دنیا میں زندگی کے آغاز کی بات کریں تو سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ اس دنیا میں زندگی کا آغاز ایک یک خلوی جرثومے سے ہوا۔ آغاز کا مطلب یہ ہے کہ پہلے یک خلوی جرثومے سے پہلے اس دنیا میں کوئی جاندار چیز موجود نہ تھی۔ یعنی یک خلوی جرثونے نے بے جان چیزوں سے جنم لیا۔ تو کیا بے جان سے جاندار کے وجود کی پیدائش کو سائنس تسلیم کرتی ہے؟ اگر کرتی ہے تو کس بنیاد پر؟ اور اگر نہیں کرتی تو یک خلوی جرثرمے کو کیسے تسلیم کر لیا جو نظریۂ ارتقاء کی بنیاد ہے؟

جب سائنس سے پوچھا جاتا ہے کہ یک خلوی جرثومہ کیسے وجود میں آیا تو سائنس کہتی ہے ''ہمیں نہیں پتہ''۔ کیا یہی ہے وہ جواب جس پر مسلمانوں سے یہ امید رکھی جاتی ہے کہ وہ کسی خدا کے وجود کا انکار کر ڈالیں؟ کیا یہی وہ سائنس ہے جس نے مذہب کا گلا گھونٹ دیا؟ یک خلوی جرثومے کی پیدائش تو ارتقائی نظریے کی بنیاد ہے۔ اور جب بنیاد ہی غیر سائنسی ہو تو باقی نظریہ سائنسی کیسے ہو سکتا ہے؟

کسی سے اپنی کوئی منطق تسلیم کروانے کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر میں کہوں کہ ستارے سفید ہوتے ہیں اور آپ کو لگے کہ میں غلط ہوں تو آپ میری تصحیح کر سکتے ہیں مگر مجھے جھٹلا نہیں سکتے۔ یعنی آپ یوں تصحیح کر سکتے ہیں کہ ستارے سفید نہیں ہوتے بلکہ لال ہوتے ہیں یا نیلے ہوتے ہیں۔ مگر یوں نہیں کہہ سکتے کہ ستارے سفید نہیں ہوتے اور ہمیں یہ بات پتہ ہی نہیں کہ ستارے کس رنگ کے ہوتے ہیں۔ کیوں کہ جب آپ کو پتہ ہی نہیں کہ ستارے کس رنگ کے ہوتے ہیں تو یہ کیسے پتہ کہ سفید نہیں ہوتے؟ ہو سکتا ہے سفید ہی ہوں؟

اسی طرح اگر میں یہ کہوں کہ اللہ نے ہر جاندار پہلی بار جوڑوں میں پیدا کیئے اور اس سے دنیا میں زندگی کا آغاز ہوا۔ تو آپ اس کا انکار ضرور کر سکتے ہیں۔ مگر پھر آپ کو یہ بتانا پڑے گا کہ زندی کا آغاز کیسے ہوا؟ دوسری صورت کیا ہے؟'' پتہ نہیں'' جیسے جواب سے آپ مجھ سے میرا عقیدہ نہیں بدلوا سکتے۔ یعنی یہ ممکن نہیں کہ آپ مجھ سے یہ کہیں کہ اس دنیا میں زندگی کا آغاز خدا کی تخلیق سے نہیں ہوا مگر جب میں آپ سے یہ پوچھوں کہ پھر کیسے ہوا؟ تو آپ جواب دیں ہمیں نہیں پتہ۔ جب آپ کو ایک بات کا پتہ ہی نہیں تو خدا کے انکار کا دعویٰ کیا معنیٰ رکھتا ہے؟

اسی ارتقائی نظریئے میں آگے چلیئے تو معلوم ہوتا ہے کہ یک خلوی جرثومہ ایک پودے میں تبدیل ہوااور پودا ایک آبی جاندار میں۔ پھر وہ آبی جاندار خشکی پر آگئے۔ کیسے ؟ جبکہ ہم یہ جانتے ہیں کہ پانی میں سانس لینے والے جاندار گلپھڑوں سے مزین ہوتے ہیں اور خشکی کے جاندار پھیپھڑوں سے۔ پھر پانی کے جانداروں کا خشکی پہ سانس لینا کیسے ممکن ہوا؟ سائنس اس کا یہ جواب دیتی ہے کہ جو جاندار پانی سے خشکی پہ گئے ان کے گلپھڑے اور پھیپھڑے دونوں تھے۔ بعد میں تھیوری آف فٹیسٹ کے تحت خشکی کے جانداروں کے گلپھڑے ختم ہو گئے اور پانی کے جانداروں کے پھیپھڑے ختم ہو گئے۔ سبحان اللہ۔

اب یہاں کئی سوال ایک ساتھ پیدا ہوتے ہیں۔

سوال: جو جاندار گلپھڑوں اور پھیپھڑوں سے بیک وقت مزین تھے وہ آج کہاں ہیں؟

مذاہب کا گلا گھونٹ دینے والی سائنس کا جواب: وہ ناپید ہو گئے۔

سوال: کیوں؟

سائنس: پتہ نہیں۔

اگلا سوال: جب آبی جاندار خشکی پہ گئے تو ان کے گلپھڑے کیوں ختم ہو گئے؟

سائنس کا جواب: کیوں کہ وہ غیر ضروری تھے۔

سوال: تو وہ جاندار جو پانی میں رہتے ہوئے پھیپھڑوں اور گلپھڑوں سے ایک ساتھ مزین تھے ان کے پھیپھڑے کیوں غیر ضروری نہیں تھے؟ کیا وہ جانتے تھے کہ مستقبل میں ان کا ارتقاء خشکی پہ ہونا ہے لہٰذا پھیپھڑے بچا کر رکھے جائیں وہاں کام آئیں گے؟

جواب: ہم ابھی یہ نہیں جانتے۔

یہ ہے وہ سائنس جس نے مذہب کا گلا گھونٹ دیا؟

آگے چلیئے۔

ایک ملحد سے جب میں نے یہ پوچھا کہ ایک قطرہ مادۂ منویہ شکمِ مادر میں نو مہینے گزار کر جیتے جاگتے انسان میں کیسے تبدیل ہو جاتا ہے تو جواب ملا کہ اس کے ڈی این اے میں ہر عضو کی معلومات ہوتی ہیں۔ میں نے پوچھا یہ معلومات کہاں سے آئیں تو جواب ملا کہ لاکھوں کروڑوں برسوں کے ارتقائی سفر سے جانداروں نے یہ معلومات سیکھی ہیں۔

اب ذرا اس بات کا بھی جائزہ لیتے ہیں۔

یک خلوی جرثومے میں افزائش نسل کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو تقسیم کر لیتا ہے۔ یعنی ایک سے دو دو سے چار اور چار سے آٹھ۔ پھر وہ یک خلوی جرثومہ ایک پودے میں تبدیل ہو گیا۔ پودے میں افزائشِ نسل کا طریقہ جنسی تولید ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جرثومے نے پودے میں تبدیل ہونے کے بعد جنسی تولید کا طریقہ کس سے سیکھا؟ کیا اس کی کوئی مثال پہلے موجود تھی؟ جب کوئی مثال ہی نہیں تھی تو سیکھا کیسے؟

آگے چلیں۔

پھر پودا جاندار میں تبدیل ہو گیا۔ افزائشِ نسل کا طریقہ ایک بار پھر تبدیل ہو گیا۔ یعنی اب جنسی تولید کی جگہ جنسی اختلاط ہونے لگا۔ یعنی اب نر اپنا عضوئے مخصوص مادہ کے عضو میں داخل کر کے مادہ منویہ چھوڑے گا تو مادہ انڈا یا بچہ جنے گی۔ یہ کام کس سے سیکھا؟ کیا اس کی کوئی مثال پہلے موجود تھی؟

پھر مسئلہ یہ بھی ہے کہ اگلا سبق سیکھتا جا رہا ہے پچھلا بھولتا جا رہا ہے۔ یعنی جس تقسیم والے طریقے سے جنسی تولید والے طریقے پہ جمپ ماری تو تقسیم والا طریقہ بھول گیا اور جب جنسی تولید سے جنسی اختلاط پہ قلابازی کھائی تو جنسی تولید بھول گیا۔ پتہ نہیں بھول گیا یا بٹوارہ ہو گیا کہ تقسیم آج بھی صرف جرثوموں ہی کا خاصہ ہے۔ جنسی تولید آج بھی پودوں ہی کا خاصہ ہے۔ مگر آج کا انسان جس نے جرثومے اور پودے سے ہی ارتقاء کا سفر طے کیا۔ وہ نہ تقسیم ہونا جانتا ہے نہ جنسی تولید پہ قادر ہیں۔ وہ اب صرف جنسی اختلاط سے ہی نسلی افزائش کر سکتا ہے حالانکہ اصولاً ارتقاء کے اس سفر میں اتنا کچھ سیکھنے کے بعد آج انسان کے پاس افزائشِ نسل کے یہ تینوں طریقے موجود ہونے چاہیئے تھے۔ آج ہمارے معاشرے میں بہت سی خواتین ہیں جو شادی نہیں کرنا چاہتیں۔ کسی مرد سے اختلاط نہیں کرنا چاہتیں مگر بچوں کی خواہش رکھتی ہیں۔ وہ گھر بیٹھے جرثوموں کی طرح اپنے آپ کو تقسیم کر لیتیں۔ ہینگ لگے نہ پھٹکری رنگ چوکھا آئے۔

پھر اس احمقانہ نظریے کی داستان یہاں ختم نہیں ہو جاتی۔

پانی سے خشکی پر ارتقاء ہوا پھر خشکی سے ہوا میں اڑنا شروع کر دیا۔ وہ کیسے ؟اس موضوع پہ ابھی تک میری کسی ملحد سے بات نہیں ہوئی اس لیئے مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں کہ اس کا کیا جواب گھڑیں گے۔ ہو سکتا ہے یہ کہیں کہ جانداروں کو ہوا میں اڑنے کی ضرورت پیش آئی تو انہوں نے لاکھوں سال تک ہوا میں چھلانگیں لگا لگا کر اڑنے کی کوششیں کیں۔ آخر کار ان کے پر نکل آئے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر انسان کو انہی پرندوں سے سیکھ کر ہوائی جہاز ایجاد کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی ؟انسان بھی پھدکنا شروع کر دے۔ کیا پتہ اس کے بھی پر نکل آئیں اور وہ اڑنے لگے۔

مذاہب میں خدا کے وجود اور پھر خدا کی قدرت سے جانداروں کی پیدائش کو سائنس کے مقابل احمقانہ سمجھنے والے ملحدوں نے سائنس میں جو پایا وہ میں نے من و عن عرض کر دیا۔ اس میں وہ تجربے بھی ہیں جو ملحدوں کے ساتھ مختلف مباحثوں میں پیش آئے۔

سائنسی نظریات میں جتنے جھول موجود ہیں اس سے الحادی عزائم کی پوری قلعی کھل جاتی ہے کہ مسئلہ صرف اسلام دشمنی ہے۔ اخلاق سے آراستہ اور مذہبی پابندیوں سے فرار کا راستہ الحاد ہے ورنہ غیر متعصبانہ انداز میں سائنس کا مطالعہ کیا جائے تو سائنس کسی بھی مقام پہ خدا یا مذہب کے خلاف کوئی نظریہ پیش نہیں کرتی۔

تحریر محمد سلیم

مذہب، سائنس اور شیطے کا عنصر

ایک مقام ایسا ہے کہ جہاں پہنچ کر مذہب اور سائنس دونوں سوال کو پسند نہیں کرتے۔ لہٰذا ملحدین کا اہل مذہب کو اس کا طعنہ دینا درست نہیں ہے کہ وہ بعض مقامات پر سوال کو شیطان کا وسوسہ قرار دیتے ہیں کہ یہی ملحد بعض مقام پر سوال کو لایعنی قرار دے رہے ہوتے ہیں۔ مذہب اور سائنس دونوں کا فکری قالب (paradigm) اگرچہ مختلف ہے لیکن اس کے باوجود سوال کے بارے میں ایک مقام پر جا کر دونوں کی روش (approach) یکساں ہو جاتی ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے کہ شیطان تم میں سے کسی کے پاس آکر کہتا ہے کہ اس کو کس نے پیدا کیا، اس کو کس پیدا کیا؟ یہاں تک کہ وہ تم سے یہ بھی کہتا ہے کہ خدا کو کس نے پیدا کیا؟ تو جب تم میں سے کوئی شخص اس مقام پر پہنچے تو فوراً اللہ کی پناہ مانگے اور اس میں غور کرنے سے باز رہے۔(صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان الوسوسۃ فی الایمان ومایقولہ من وجدھا، دار احیاء التراث العربی۔ بیروت (120/1

اسی طرح اکیسویں صدی عیسوی کے نامور سائنسدان اسٹیون ہاکنگ یہ کہتے ہیں کہ بگ بینگ سے پہلے کیا تھا، یہ ایک لایعنی سوال ہے۔((The Grand Design;p.109))

یعنی یہ سوال کرنا ہی غیر ضروری ہے کہ جب وقت اور مکان (time and space) کا آغاز ہی بگ بینگ سے ہوا تو اس سے پہلے کیا تھا؟ کا سوال لایعنی قرار پاتا ہے۔ لیکن یہی روش مذہبی لوگ جب خدا کے بارے میں سوال کے جواب میں اختیار کرتے ہیں تو اسے غیر سائنسی رویہ قرار دیا جاتا ہے۔ ملحدین دراصل اس ایک بنیادی نکتے کو سمجھنے سے گریزاں ہیں یا یوں کہیے کہ یہ بات ان کے لیے قابل فہم نہیں کہ مذھب نے خُدا کے وجود کے لیے ثبوت نہیں بلکہ دلائل پیش کیے ہیں. اور یہ دلائل فطرت و وجدان کی انمٹ گواہی سے لے کر آفاق میں پھیلے بے مثل نظم کی صورت پُکار پُکار کر خدائے بُزرگ و برتر کی عظمت و بڑائی کو مبرہن کر رہے ہیں. یہ ذہن دراصل فزیکل سائنسز سے متاثر ہونے کے سبب بنا ہے کہ انہیں وجود باری کے اثبات کے لیے بھی Empirical evidence درکار ھے. ایمپیریکل ایویڈینس کیا ہے ؟ یعنی کسی چیز کو تسلیم کرنے کے لیے ٹھوس حسی ثبوت کا ہونا, جبکہ خدائے بزرگ و برتر کی ذات کی دلیل صرف اور صرف استنباط inference ہے,

استنباط یعنی ظاہر کو دیکھ کر مخفی تک پہنچنا، معلوم باتوں کی بنیاد پر نامعلوم دنیا تک رسائی حاصل کرنا، نیوٹن نے درخت سے سیب گرنے کے واقعے سے ''استنباط'' یعنی infer کیا کہ، یہاں کوئی کشش ثقل جیسی قوت موجود ہے جو چیزوں کو اپنی جانب کھینچتی ہے، حالانکہ کشش ثقل ایسی چیز نہیں کہ جسے برہنہ آنکھ سے دیکھا جاسکے، لیکن اِس کے اثرات اس قدر نمایاں اور حقیقی ہیں کہ اِس ان دیکھی قوت کو بھی بن دیکھے (ایمان باالغیب کی مانند) تسلیم کیا جاتا ہے، آج کی سائنس محسوسات کے قفس سے بہت آگے نکل چکی ہے۔ اب سائنس بھی انرجی، اضافت، اور ویو میکانکس (Wave Mechanicss) جیسے بے شمار ناقابل مشاہدہ امور کو تسلیم کر کے اسی ایمان بالغیب (بن دیکھے ماننے) کے قفس میں ہے، سائنسی حلقوں میں آج جتنے بھی نظریات قائم کیے گئے ہیں وہ سب اسی طرح بالواسطہ استنباط پر مبنی ہیں۔ خدا کے عقیدے پر استدلال کی نوعیت بھی یہی ہے، اگر آفاق و انفس کی نشانیاں خدا کے عقیدے کی تائید کر رہی ہیں اور ان مشاہدات سے جائز طور پر خدا کے وجود کا استنباط ہو رہا ہو تو یہ عین جدید سائنسی منطق کے مطابق درست اور قابل تسلیم قرار پائے گا۔ مذہبی نقطہ نظر سے سمجھنے کی اھم بات یہ ھے کہ اس دنیا میں خُدا نے جو امتحان برپا کیا ھے وہ بِن دیکھے محض دلیل کی بنیاد پر ایمان لانے کا ھے نا کہ کسی حسی ثبوت کی بنیاد پر یقین کرنا,

زرا سوچیئے ! خدا کو اپنے ہونے کا اگر ثبوت ہی پیش کرنا ہے تو اس تکلّف کی بھی کیا ضرورت وہ چاہے تو ثبوت پیش کیے بغیر برہنہ آنکھ سے ہی دکھائی دینے کا انتظام فرمادے. لیکن اس صورت میں امتحان کیسا اور آزمائش کس کی ؟ (سید اسرار احمد)

شبہ کا عنصر:(element of doubt)

خالق نے مخلوق کے لیے ہر معاملے میں شبہ کا ایک عنصر باقی رکھا ہے اور عنصر کے باقی رکھنے کا مقصد آزمائش اور اختیار ہے۔ اگر شبہ ختم ہو جائے تو انسان کی آزمائش اور اختیار ختم ہو جائے، اور انسان جب تک اس دنیا میں ہے، آزمائش اور اختیار میں رہنا اس کا مقدر ہے۔ انسان کی آزمائش اور امتحانی اختیار اسی صورت ختم ہو گا جبکہ اس دنیا کا خاتمہ ہو جائے۔ شبہ کا یہ عنصر اس قدر عام ہے کہ خود خالق نے اپنے بارے میں بھی اس کو برقرار رکھا ہے کہ اسی میں انسان کا امتحان اور اختیار ہے۔ پس کسی انسان کو اللہ، رسول، کتاب اور آخرت کے بارے میں کوئی شبہ اور وسوسہ لاحق ہو سکتا ہے۔ انسان کے اختیار کا امتحان اس میں ہے کہ وہ اس شبہے کے عنصر کو رد کر کے دنیا کی آزمائش میں کیسے کامیاب ہوتا ہے؟ جو اس شبے کے امتحان میں کامیاب ہو جائے تو وہ مومن کہلاتا ہے اور جو ناکام ہو جائے تو ملحد بن جاتا ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ اللہ عزوجل نے مجھ سے یہ کہا کہ اے نبی ﷺ آپ کی امت میں سے ہمیشہ لوگ یہ کہتے رہیں گے کہ اسے تو اللہ نے پیدا کیا اور اللہ کو کس نے پیدا کیا؟(صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان الوسوسۃ فی الایمان وما یقولہ من وجدھا، 121/1)ایک اور روایت کے الفاظ ہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ سے اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ اے ابوہریرہ! تم سے لوگ ہمیشہ یہ سوال کرتے ہیں رہیں گے کہ فلاں کو اللہ نے پیدا کیا اور اللہ کو کس نے پیدا کیا؟(ایضاً)

اور شبہے یا وسوسے کا پیدا ہونا ایمان کے لیے مضر نہیں ہے بلکہ یہ تو عین ایمان ہے اور صحابہ بھی اس سے بری نہیں تھے۔ کچھ صحابہؓ اللہ کے رسول ﷺ کے پاس آئے اور انہوں نے کہا: اے نبی ﷺ ! ہمیں ایسے ایسے خیالات آتے ہیں کہ ہم انہیں زبان پر لانا بھی مناسب نہیں سمجھتے۔ آپؐ نے پوچھا: ''کیا واقعتاً ایسا ہے؟'' تو انہوں نے کہا: جی ہاں، آپؐ نے فرمایا: '' یہ تو صریح ایمان ہے''(سنن ابی داؤد، ابواب النوم، باب رد الوسوسۃ، المکتبۃ العصریۃ، صیدا۔ بیروت، 329/4)۔ اور ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس تابعی کے سوال پر ہنستے ہوئے کہا کہ اس وسوسے سے تو کوئی بھی بچ نہیں پایا ہے۔(ایضاً)

بعض ملحدین یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ حق ان کے لیے ایسے واضح ہو جائے کہ اس میں سے شبہے کا عنصر ختم ہو جائے۔ تو یہ اس دنیا میں ممکن نہیں ہے، البتہ آخرت میں ممکن ہے، بلکہ آخرت میں ایسا ہی ہو گا۔ فرشتوں کے لیے شبے کا عنصر نہیں ہے، لہٰذا ان کے لیے امتحان اور اختیار بھی نہیں ہے۔ اگر انسانوں کے لیے بھی شبہے کا عنصر ختم ہو جائے ان کا امتحان اور اختیار دونوں ختم ہو جائے۔ اگر انسان اللہ کو اس طرح سامنے دیکھ لے جیسا کہ آخرت میں دیکھے گا یا جنت و جہنم کا اس دنیا میں اس طرح نظارا کر لے جیسا کہ آخرت میں کرے گا تو اب اس

سے ایمان کے مطالبے میں کیا امتحان باقی رہ جائے گا؟ قرآن مجید نے جابجا یہ واضح کیا ہے کہ کافر جہنم کو دیکھیں گے تو اپنے ایمان کا اظہار کریں گے لیکن ان کا وہ ایمان مقبول نہ ہوگا، کیونکہ ایمان وہی قابل قبول ہے جو کہ شبہے کے عنصر کے ساتھ ہو کہ یہی ایمان، امتحان کہلانے کے لائق ہے۔ (صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب من کرہ یعود فی الکفر کما یکرہ ان یلقی فی النار دار طوق النجاۃ، الاول 1422ھ، 13/1) اسی طرح سورۃ الانعام میں ہے کہ مشرکین مکہ بار بار آپ ﷺ سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ آپ ہمیں فلاں معجزہ دکھادیں تو ہم ایمان لے آئیں گے۔ مشرکین کا یہ مطالبہ اصرار کے ساتھ کئی سال جاری رہا لیکن اللہ عزوجل نے ہر بار اپنے نبی ﷺ سے یہی کہا کہ اللہ نے انہیں وہ معجزہ نہیں دکھانا کہ جس کا یہ مطالبہ کررہے ہیں۔ انہیں معجزہ چاہیے تو وہ یہی کلام، قرآن مجید ہے۔ مشرکین نے آپ ﷺ سے مطالبہ کیا کہ ہمارے سامنے آپ پر فرشتہ نازل ہو تو ہم ایمان لے آئیں گے تو اللہ تعالیٰ نے جواب دیا کہ فرشتہ جب نازل ہوگا تو وہ عذاب لے کر ہی آئے گا۔ یعنی میں فرشتہ تو تمہیں دکھادوں گا لیکن اس کے بعد تمہارے ایمان کا فائدہ؟

ایک اور جگہ قرآن مجید میں کہا کہ یہ ملحد اس کے انتظار میں ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا ان کا رب ان کے پاس آئے یا ان کے رب کی نشانیاں ان کے پاس آئیں، لیکن کافر یہ جان لیں کہ جس دن ان کے رب کی بعض نشانیاں ان کے سامنے آجائیں گی تو اس دن انہیں ان کے ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ ایک اور جگہ قرآن مجید میں کہا کہ اگر اللہ چاہے تو ان کافروں کے لیے آسمان سے ایسی نشانی نازل کردے کہ ان کی گردنیں اس کے سامنے جھک جائیں لیکن اللہ ایسا نہیں کرتا، کیونکہ اس صورت میں انسان کا اختیار اور امتحان دونوں ختم ہو جاتے ہیں۔

قوموں نے رسولوں کی زندگی میں ان کا انکار کیا اور آج کل ملحدوں نے تو رسولوں کو دیکھا بھی نہیں، لہٰذا مومنوں کو اس پر حسرت نہیں کرنی چاہیے کہ ہمارے پاس کوئی ایسی نشانی کیوں نہیں ہے کہ جس کے سامنے ایک ملحد بے بس ہو جائے۔ اور جو کچھ دین اسلام کی تعلیمات موجود ہیں اور ان میں کچھ شبہ وغیرہ کبھی محسوس ہو تو اس گھبرانا نہیں چاہیے کہ یہی تو عین امتحان ہے۔

شیخ بن بازؒ کے پاس ایک دہریہ آیا اور ان سے کافی دیر تک خدا کے وجود کے بارے میں سوالات کرتا رہا اور شیخ اس کے سوالات کے جوابات دیتے رہے، یہاں تک کہ اس نے تنگ آکر کہا: کیا آپ کو کبھی خدا کے وجود کے بارے میں شک نہیں ہوا؟ شیخ نے کہا: نہیں، اور یہ تمہاری بدبختی ہے کہ تمہیں خدا کے وجود کے بارے میں شک پیدا ہوا ہے۔ اسی لیے تو قرآن مجید نے مشرکین کے انکار پر حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ تمہیں اللہ کے بارے میں شک ہو گیا ہے؟ اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (سورہ ابراھیم آیت 10) شیخ کے

اس جواب میں کوئی بناوٹ یا مصنوعیت نہیں تھی۔ آپ آج بھی پاکستان کے کسی بھی گاؤں کی مسجد میں پنج وقتہ نمازی اَن پڑھ بوڑھے بابا جی سے سوال کر لیں کہ انہیں اپنی زندگی میں کبھی خدا کے نہ ہونے کے بارے میں سوال پیدا ہوا تو جواب نفی میں ہو گا۔ دنیا میں لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں لوگ جنہیں زندگی بھر میں نہ تو کبھی شک ہوا اور نہ ہی کوئی سوال پیدا ہوا۔ یہ کیا ہے؟ یہ ایمان کا تجربہ ہے جو ہر ''مخلص'' بندہء مومن کو حاصل ہوتا ہے جبکہ ''مداری'' اس سے محروم رہتا ہے۔ علاوہ ازیں خالق کے وجود پر اس کی مخلوق ہی دلالت کرنے کے لیے کافی ہے، جیسا کہ فن پارے کا وجود فنکار artist ، عالیشان عمارت کا وجود اپنے معمار اور جیٹ انجن کا وجود اپنے انجینئر کے حسن تخلیق کی دلیل ہے۔ قرآن مجید میں جابجا یہ ارشادات ملتے ہیں کہ اللہ نے انسان کے وجود اور زمین و آسمان میں ایسی واضح نشانیاں رکھ چھوڑی ہیں جو خالق پر اشارہ کر رہی ہیں۔ عرب کے بدو جسے سمجھتے تھے، اسے فلسفی اور سائنسدان سمجھنے سے قاصر رہے۔ عرب کے بدوؤں میں یہ معروف تھا کہ جس طرح اونٹ کی مینگنی اونٹ کے راستے سے گزرنے اور قدموں کے نشانات انسان کے گزرنے پر دلالت کرتے ہیں، اسی طرح یہ وسیع و عریض آسمان اور زمین اپنے خالق پر کیسے دلالت نہیں کرے گی؟

اہلِ مغرب نے اپنے ہر علم، خواہ وہ سائنسی ہو سماجی، تاریخی ہو یا لسانی، کو نظریہ ارتقاء کی روشنی میں مرتب کر کے دکھا دیا ہے۔ اور اہلِ مشرق کا یہ فریضہ ہے کہ وہ ہر علم کو، چاہے وہ تاریخ ہو یا سائنس، نظریہ تخلیق کی روشنی میں مرتب کر کے دکھا دیں۔ اور جب تک ہمارے محققین فلسفہ، سائیکالوجی، بیالوجی، نظریاتی فزکس، عمرانیات، لسانیات اور تاریخ کے مضامین میں نظریہ تخلیق کی روشنی میں بحث و تحقیق کی بنیاد نہیں رکھ دیتے، اس وقت تک دنیاوی علوم سے مذہب کا مقدمہ ثابت کرنا ممکن نہیں ہے۔

تحریر ڈاکٹر زبیر

سائنسی لحاظ سے مذہب کی مخالفت کا امکان باقی نہیں رہا!

اکیسویں صدی الحاد کے لیے نامساعد ترین صدی ہے۔ اگر یہ لوگ یہی باتیں نیوٹن کے فوراً بعد کرتے تو بہت مناسب وقت تھا۔ فی زمانہ تو الحاد کے پاس کچھ بھی نہیں بچا۔ کوئی ایک بھی چیز۔ مثال کے طور پر اگر آج کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ مستقبل سے آیا ہے تو خود فزکس کے پاس اس کی بات پر یقین کرنے کی ایک سو ایک وجوہات ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ فزکس کے ماہرین اس سے کہیں گے، ثابت کرو! اس پر وہ جواب دے سکتا ہے کہ میں ثابت تو کر سکتا ہوں لیکن آپ کی ذہنی صلاحیت ہی اتنی نہیں ہے کہ آپ سمجھ سکو! اب اُس کے اس دوسرے دعوے کو جھٹلانے کی ہمّت پھر سائنس کے پاس نہیں کیونکہ خود بیالوجی اور خصوصاً ٹرانس جینک بیالوجی کے پاس ایک سو ایک وجوہات ہیں اُس کی اِس بات پر یقین کرنے کے لیے۔

اِسی طرح آج اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اُسے آسمانوں سے پیغامات آتے ہیں تو خود فزکس کے پاس ایک سو ایک وجوہات ہیں اس کی اس بات کو ماننے کی۔ فزکس زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتی ہے کہ ثابت کرو! اور اس سوال کے جواب میں وہ مکرر وہی پہلے والا عذر پیش کر

سکتا ہے کہ میں تو ثابت کر دوں گا لیکن آپ لوگوں کے پاس اتنی عقل ہی نہیں کہ اس ثبوت کو دیکھ سکو۔ بہتر ہے کہ میری بات کا یقین کر لو!

الغرض الحاد جو کہ زیادہ تر مادہ پرستوں کا ہی حصہ رہا ہے، فی زمانہ سب سے نامناسب اور نامساعد حالات کا شکار ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ الحاد کی شمع اپنی موت سے پہلے قدرے زیادہ تیزی کے ساتھ بھڑکنے لگی ہے۔ ہاں البتہ وہ الحاد جو صوفیاؑ نے اختیار کیے رکھا جیسا کہ بلھے شاہؒ کا الحاد تو بلاشبہ اس الحاد کو ہم مادہ پرست الحاد نہیں کہہ سکتے لیکن کیا فی الواقعہ ہم اسے الحاد کہہ سکتے ہیں؟ سچ تو یہ ہے کہ نہیں کہہ سکتے۔ دیکھیے! بہت سادہ سی بات ہے اور بہت آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ عہدِ حاضر کی سائنس خود فالسفکیشن کے اُصول سے بہت آگے کھڑی ہے۔ اوّل تو آئن سٹائن کی فزکس نے ہی ٹائم اور سپیس کے دھاگے دریافت کر کے کائنات کی مادی شکل کو کسی خواب کی طرح عجیب و غریب بنا دیا۔ یہ بھی بھلا کوئی بات ہے کہ ٹائم بھی کسی لچکدار دھاگے کی طرح سپیس کے ساتھ بُنا ہوا ہے اور ہم جب چاہیں کہیں سے توانائی کا بندوبست کر کے اِن دھاگوں کو سُکیڑ بھی سکتے ہیں، پھیلا بھی سکتے ہیں۔ یہ چونکہ ٹائم کے دھاگے ہیں لحاظا سکُڑنے اور پھیلنے سے ہم ٹائم میں آگے پیچھے جا سکتے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص آج یہ دعویٰ کرے کہ وہ ساری کائنات گھوم کر آیا ہے اور اُس کا اپنا وقت بالکل نہیں گزرا تو خود فزکس کے پاس ایک سو ایک وجوہات ہیں اس کی بات سے انکار نہ کرنے کی۔ مشہور ماہرِ طبیعات کارل ساگان نے اپنی زندگی میں ہالی وُوڈ کے لیے ایک فلم لکھی تھی، ''دی کانٹیکٹ''، اس کا بھی یہی موضوع ہے۔

اسی طرح بیسویں صدی کے پہلے عشرے سے لے کر اب تک سوا صدی ہونے کو آئی ہے جب سے مادہ پرست فکر کو شدید ضربیں پڑ رہی ہیں۔ اتنی شدید کہ کہیں کہیں تو الحاد کو پناہ لینے کی جگہ بھی نہیں ملتی۔ سائنس میں سب سے زیادہ کارنامے فزکس نے سرانجام دیے ہیں اور اس لیے فزکس کو بجا طور پر ''کُوئین آف سائنسز'' کہا جا سکتا ہے۔ 1920ء سے فزکس مسلسل یہ بتا رہی ہے کہ کائنات کا وجود مشکوک ہے یا کم از کم بات وہ نہیں جو آج تک ہم سمجھتے آئے ہیں۔ کوپن ہیگن انٹرپریٹیشنز نے یہ کہا کہ رئیلٹی سپر پوزیشن پر ہے اور جو ہم دیکھ پاتے ہیں وہ فقط لا متناہی امکانات میں سے ایک ہے۔ ہم ویو فنکشن کو کولیپس کر دیتے ہیں بطور ناظر، اور یہ ساری کائنات ہم نے دراصل کولیپس کر رکھی ہے۔ شے کی تعریف ممکن نہیں اور رفتار، فاصلہ، وقت، یہ سب فقط دھوکے ہیں۔ حقیقت کی حقیقت میں کوئی حقیقت نہیں (نیلز بوہر)۔

اس پر شروڈنگر نے اعتراض کیا تو مینی ورلڈز کی تھیوری سامنے آگئی۔ کچھ وقت گزرا تو ''ہیوایورِٹ'' نے تمام رئیلٹیز کے سچا ہونے کا اعلان کر دیا اور بتایا کہ رئیلٹی کو لیپس نہیں ہوتی بلکہ ہمارے وجود کے لامتناہی ورژنز ہیں۔ ہماری لامتناہی نقول ہیں۔ ہر امکان حقیقی ہے اور بہت سی کائناتیں ہیں جو ایک جیسی ہیں اور ہم ہر ایک کائنات میں موجود ہیں۔

وقت کے ساتھ ساتھ ایسی ہی تھیوریز فزکس میں داخل ہوتی چلی گئیں اور اکیسویں صدی کی فزکس یعنی سٹرنگ تھیوری تک پہنچنے سے پہلے پہلے تک حال یہ ہو گیا سپیس کی دس ڈائمینشنز ہیں اور دسویں ڈائمینشنز اتنی نیچے ہے کہ اگر ہم وہاں تک اُتر جائیں تو ہم کائنات کی ساری ٹِیوننگ کو نہ صرف دیکھ سکتے ہیں بلکہ اسے تبدیل بھی کر سکتے ہیں۔ سٹرنگ تھیوری اس مقام تک پہنچ چکی ہے کہ اب کون کیا سمجھے؟ یہ سب مادی دنیا جو ہمارے آس پاس ہے یہ حقیقی ہے بھی کہ نہیں؟ یہ خواب ہے؟ کیا بہت سارے خواب ہیں؟ کیا ہم ماضی میں واپس چلے جائیں؟ دوبارہ سے زندگی شروع کر دیں؟ کسی اور رئیلٹی میں گھُس جائیں یا ٹرانس ہیومینز بن جائیں؟ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے انٹرنیٹ کمپیوٹروں سے نکل کر موبائلوں میں اور ٹچ سسٹم کے بعد اب آرٹفیشیل انٹیلجنس کے ساتھ یوں پھیل گیا ہے جیسے کوئی چاہے تو ایک ہی ساعت میں تمام کے تمام انسانوں کو ایک ساتھ میسج بھیج دے، کال کر لے یا کوئی اعلان پہنچا دے۔

کتنی کائناتیں ہیں؟ کیا ہم خواب کی طرح کی حالت میں ہے؟ کیا ہم کل کلاں ٹیلی پورٹ ہو پائینگے؟ اگر ہم ڈی میٹیریلائز ہو کر ری میٹیریلائز ہو سکتے ہیں تو پھر ہم ہیں کیا؟ یہ نظامِ انہضام کہاں سے آگیا؟ ہمارے وجود کو آپس میں جوڑ کر رکھنے والی قوت سپر پوزیشن کی قوت ہے تو پھر ہمارے باقی وجودوں کو کون دیکھ رہا ہے؟ کس امکان کو ہم خود چُن سکتے ہیں؟ کیا ہم کچھ بھی خود چُن سکتے ہیں؟ ہم سب کچھ خود چُن سکتے ہیں لیکن ہم ہوتے تو تب ناں۔ ہم تو ہیں ہی نہیں۔ نہیں نہیں، ہم ہیں لیکن کسی اور شکل میں ہیں۔ جیسا ہم خود کو سمجھتے ہیں کہ ہم ہیں اصل میں ہم ایسے نہیں ہیں۔

گریوٹی کے بھی ذرّات ہوتے ہیں؟ ہو سکتا ہے ٹائم کے بھی ذرّات ہوں۔ کیا ٹائم کے ذرّات کا تجربہ بھی ویسا ہو گا جیسے مادے کے ذرّات کا ہوتا ہے؟ ہم ''ایچ ٹُو او'' کے ایک مالیکیول کو ہتھیلی پر رکھیں تو کیا وہ گیلا ہو گا؟ کیونکہ ایچ ٹُو او کے بہت سارے مالیکیول مل کر تو پانی کہلاتے ہیں؟ کیا ٹائم کے مالیکیول ہو سکتے ہیں؟ اگر ٹائم کے ذرّات کل کلاں ثابت ہو گئے تو کیا وہ بھی ہتھیلی پر رکھے جا سکینگے؟

ڈائمینشنز کیا ہوتی ہیں؟ یہ سپیس کی دس ڈائمینشنز کیا ہو نگی؟ کیا ہم کسی اور ڈائمینشن میں جا سکتے ہیں؟

خدا کی پناہ! الحاد کہاں پناہ لے گا؟ ہے کوئی جگہ ؟ پرانا مذہب نہ سہی نیا مذہب ہی سہی لیکن یہ تو سب کا سب مذہب ہے۔ وہی باتیں، وہی انداز، وہی لب ولہجہ۔ مذہب اور کیا ہوتا ہے ؟

اب لے دے کے ایک ہی بات بچتی ہے کہ الحاد بے چارہ دراصل مذہب کے خلاف ہے ہی نہیں کیونکہ اس کے لیے مذہب کی مخالفت کا امکان ہی باقی نہیں رہا۔ الحاد خلاف ہے تو مذہب کے جعلی نمائندوں کے، کیونکہ انہوں نے مولویوں، پنڈتوں اور پادریوں کے رُوپ میں زمین پر ظلم کا بازار گرم کیا اور اہلِ زمین کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ لیکن پھر اگر ایسی بات ہے تو پھر وہ الحاد تو نہ ہوا خود اصلی مذہب کا ہی کوئی نمائندہ ہوا کیونکہ مذہب کے اصلی نمائندے بھی تو یہی چاہتے ہیں کہ اب بہر حال ''میر و پیر و فقیر'' کی گھات سے خلقِ خدا کو بچالیا جائے۔

تحریر ادریس آزاد

حقیقی ملحد وہ ہوتا ہے جو۔۔۔۔۔

حقیقی ملحد وہ ہوتا ہے جو پورے خلوص سے سچائی کا متلاشی ہو۔۔ وہ جانتا ہے کہ سائنس کا مقصد خدا کی تلاش نہیں بلکہ رموزِ کائنات کو سمجھنا ہے۔۔ وہ سائنس اور مذہب کو گڈمڈ نہیں کرتا۔۔ اسے خبر ہوتی ہے کہ اشیاء کی ماہیت و تراکیب سمجھنے کا علم (سائنس) اشیاء کے خالق (خدا) کی تحقیق کرنے پر لاگو نہیں ہو سکتا۔۔ وہ مظاہرِ فطرت کی رنگینیوں سے دنگ رہ جاتا ہے۔۔ وہ فطرت کو خدا ماننے کی بجائے فطرت کے پالنہار کی کھوج میں ہوتا ہے۔۔ ایسا ملحد نہ تو مذہب کو مانتا ہے اور نہ انکار کرتا ہے۔۔ دراصل وہ ذہنی خلفشار کا شکار ہوتا ہے۔۔ وہ اپنی الجھن کو

اسلام یا کسی اور مذہب پر بے جا اور غیر عقلی اعتراضات سے ظاہر نہیں کرتا.. وہ اگر مذہب دوست نہ ہو تو مذہب دشمن بھی نہیں ہوتا، کیونکہ وہ مانتا ہے کہ عداوت اور تعصب حق کی کھوج میں رکاوٹ ہوتے ہیں.. سو اگر کوئی واقعی سچا ملحد ہے جو تلاشِ خالق میں سر گرداں ہے تو اسکے ساتھ ہمارا بنیادی اختلاف اللہ کے وجود پر ہے.. ہمارا اوّل موضوع ذاتِ باری تعالی ہے.. باقی موضوعات ثانوی حیثیت رکھتے ہیں!..

اگر اللہ کا وجود کسی حقیقی ملحد کو سمجھ میں آجائے،، تو مذہب ہے یا نہیں اور اگر ہے تو سچا کون سا ہے وغیرہ جیسے مسائل خود بخود حل ہو سکتے ہیں!..

اللہ جل شانہ کے وجود پر ہمارا اور ملحد کا پہلا نکتہِ بحث یہ ہے کہ جب کائنات میں کچھ نہیں تھا تو کون تھا؟ یعنی کائنات میں سب سے پہلے کون تھا؟ ملحد کا ماننا ہے کہ کائنات میں سب سے پہلے جو بھی تھا، وہ خود بے اختیار اور بے شعور تھا.. پھر اس بے اختیار، بے شعور، بے عقل اور بے سمجھ مادے سے یہ ساری کائنات، اسکی اثر آفرینیاں، اسکے مربوط ریاضیاتی اور طبیعاتی قوانین وجود میں آئے.. دیگر جانداروں کو فی الحال چھوڑ دیں.. انسان جیسی عاقل، بااختیار، بامقصد، ذہین تر اور حسین ترین مخلوق بھی اسی مادے سے بنی جسکے پاس کچھ کرنے کا اختیار اور فکر ہی نہ تھی!..

اسکے مقابلے میں ہم کہتے ہیں کہ نہیں جناب، کائنات میں سب سے پہلے جو وجود تھا وہ اللہ کریم کی ذات تھی.. جو ساری قدرتوں کی یکتا مالک، ساری حکمتوں کی اکیلی حاکم، ساری طاقتوں کی واحد مرکز اور ہر قسمی نقص سے پاک ذات ہے.. اس واحد و یکتا ذات نے اپنی ذاتی قدرتوں اور حکمتوں کے ساتھ اس سارے عالم کو ایسا بے خطا سجایا کہ دیکھنے والے انگشت بدنداں رہ گئے.. اس تنہا نے تمام تر مخلوقات کو اپنے اختیار و ارادے سے وجود بخشا.. پھر انسان جیسے اشرف المخلوقات کو تخلیق فرما کر اسے ایک عظیم منشور دیا اور اس پر عمل کرنے کو کہا.. بطور امتحان اُس نے اپنی ہستی اور عالمِ آخرت کو پردہِ غیب میں رکھا.. پھر اس نے کائنات میں جابجا اپنے ہونے کی نشانیاں بکھیر دیں تاکہ سمجھنے والے سمجھ سکیں.. اس پہ مستزاد یہ کہ اس نے غیب پر مطلع فرمانے کیلئے پے در پے اپنے پیغامبر بھیجے جن سب نے خدا کا ایک جیسا تعارف کرایا اور اسکے فرامین سے نوعِ انسانی کو آگاہ کیا.. ایک وقت آئے گا جب یہ غیب کسی کی نظروں سے اوجھل نہ ہو گا، مگر تب کا ماننا ہر گز کوئی نفع نہ دے گا.. دیکھ کر کون نہیں مانتا،، ایمان کا امتحان یہ ہے کہ بِن دیکھے مانا جائے!..

اس پیچیدگی کے رفع ہوتے ہی حقیقی ملحد کا(نہ کہ کسی مذہب بیزار/نفس پرست/ہٹ دھرم کا)اگلی جستجو یہ فوری سوال ہوتا ہے کہ خدا کو کس نے بنایا؟

دیکھیں ابھی ابھی آپ نے سمجھ لیا کہ خدا''خالق''ہے..اگر خدا کو بنانے والی کوئی اور ذات ہوتی تو پھر''وہ ذات''خالق کہلاتی اور خدا مخلوق..جبکہ آپ جانتے ہیں کہ خدا مخلوق نہیں بلکہ خالق ہے..خالق وہ ہوتا ہے جو اپنی ذات اور''ذاتی صفت''کی بنا پر قائم ودائم ہو..پس یہ سوال(کہ خدا کو کس نے بنایا؟)منطقی طور پر درست نہیں بلکہ مبنی بر مغالعہ ہے..اگر بالفرض ہم یہ کہہ بھی دیں کہ خدا کو''فلاں''نے بنایا،،تو آپ فوراًاگلا سوال یہ پوچھیں گے کہ فلاں کو کس نے بنایا؟:)ارے بھئی خدا ہوتا ہی وہ ہے جو پیدا ہونے اور مرنے سے پاک ہو!..

یہاں تک ہمارے سامنے دو مختلف النوع مقدمے واضح ہو گئے..اب ہر غیر جانبدار انسان خدا کی ودعیت کردہ عقل کو ذرا سا استعمال کر کے خود ہی فیصلہ کر سکتا ہے کہ ان دونوں میں سے کون سا موقف دل کو لگتا اور شعور کو بھاتا ہے اور کونسا خلافِ عقل معلوم ہوتا ہے..تحریر: محمد نعمان بخاری

دہریت'عقلمندی یا حماقت؟

سائنس کی ترقّی کے ساتھ ساتھ مذہبی تشکیک میں اضافے کا عمل بھی تیز ہوتا نظر آرہا ہے اور مذہب پر اعتراض گویا فیشن بن گیا ہے۔سوشل میڈیا پر خدا کا انکار اور دہریت ومادیّت پرستی کا پرچار کھلے عام ہو رہا ہے۔دہریت اور مادیّت پرستی سے مختصراً مراد یہ ہے کہ جو کچھ موجود ہے بس وہی ہے۔اسلام پر رکیک حملے ہو رہے ہیں اور یہ ثابت کرنے کی ناکام کوششیں جاری ہیں کہ اسلام،قرآن اور نبی ﷺ

کی تعلیمات نعوذ باللہ غیر سائنسی اور دقیانوسی ہیں۔ یہ محاذ آرائی ایک سوچی سمجھی اور منظّم سازش نظر آتی ہے تاکہ نوجوانوں کو اسلام سے برگشتہ کیا جائے۔ اصول وہی پرانا ہے کہ کسی کو اپنے نظریئے کا قائل نہ کر سکو تو اُسے اسکے نقطہ نظر میں کنفیوزڈ کر دو یعنی وسوسوں یا مغالطوں میں اُلجھا دو۔ آیئے، ہم اختصار سے جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ اسلام، مادیّت پرستی اور دہریت کے منطقی پیرائے کیا ہیں اور کتنے مضبوط ہیں۔

اس سلسلے میں ہم ایک بنیادی نکتے سے بات آگے بڑھاتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ کوئی بھی نظریہ حیات اپنی ایک بنیاد رکھتا ہے۔ وہ بنیاد کائنات اور انسان کے وجود کے حوالے سے ایک معیّن فلسفہ ہوتا ہے، جو انسان اور کائنات کے موجود ہونے کی ایک تشریح رکھتا ہے۔ مذہبی فلسفۂ حیات خدا کو ہر چیز کا خالق کہتا ہے۔ خدا کی صفات یہ بتلاتا ہے کہ وہ ذات کل کائنات پر حاوی ہے، کائنات کی حاکم ہے۔ ہر چیز اسکی دسترس میں ہے۔ وہ ہر شئے پر غالب ہے۔ ہر علم کا منبع اسکی ذات ہے۔ خدا کے وجود اور ذات کے پیرائے انسانی علم اور تخیّل سے ماوراء ہیں اور ہم اسکو نہیں سمجھ سکتے۔۔۔۔ بالکل اُسی طرح۔۔۔ جس طرح ایک سوپر روبوٹ جو انسان کی دی ہوئی مصنوعی عقل کا خوگر ہو کر اور بہت سے کام کرنے کے باوجود انسان کے وجود کے پیرائے نہیں سمجھ سکتا کیونکہ انسان نے روبوٹ کے سوفٹ ویئر میں وہ کمانڈ یا احکامات دیئے ہی نہیں کہ وہ انسانی وجود کی تشریح مشینی زبان میں سمجھ سکے! مزید یہ کہ خدا پر یقین انسان کا قلبی اور ایمانی فیصلہ ہوتا ہے جو بغیر ثبوت طلب کیئے ہوتا ہے۔ یہ تو رہا مختصراً مذہبی نقطہ نظر اب ذرا انکارِ خدا کی ماہیّت اور مادّہ پرست نظریات کی عقلی بنیادوں کی جانچ کر لیں۔

انسان ملحد کیوں بنتا ہے؟

جب کوئی خدا کے وجود کے حوالے سے اٹھنے والے سوالات کا تشفّی بخش جواب نہیں پاتا تو شک میں مبتلا ہوتا ہے اور عقل پر انحصار کرتا ہے، اور جیسا کہ اوپر تشریح کی گئی کہ کیونکہ انسان کی معیّن و محدود عقل خدا کو مکمل سمجھنے میں عاجز ہے تو انسان خدا کا انکار کرتا ہے۔ گویا خدا سے انکار دراصل تشکیک کے غلبے میں ایک غیر عقلی اور جبری زاویہ نظر ہے۔ اور اسی لیئے دہریت ہمیشہ سے نظریاتی طور پر یتیم ہی رہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں الحاد اپنی بقاء کے لیئے کوئی بھی نظریہ مستعار ہی لیتا ہے۔

خدا کے وجود کے متبادل مضبوط عقلی نظریہ نہ ہونے کی وجہ سے منکر عموماً ایک منفی ذہنی حالت میں ہی رہتا ہے۔ اس منفی کیفیت کے زیرِ اثر اکثر ملحد ترقّی پسند بن کر ہر مذہب پر تنقید کرتے اور انکی تعلیمات میں کیڑے نکالتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ منفی طرز عمل لاشعور میں پیوست کسی بے چینی یا احساس کمتری کا پرتو ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہو سکتی ہے کہ خدا کے وجود کا اقرار انسانی فطرت کا لازمی

تقاضہ ہے لیکن کیونکہ منکر اس کے خلاف رائے رکھتا ہے اس لیئے اس کے اندر قلبی وذہنی کشمکش جاری رہتی ہے۔ کوئی متبادل نظریہ پاس نہ ہونے اور اپنے اس قلبی وذہنی تنازعے میں مقیّد ہونے کی وجہ سے اطراف کے تمام مذاہب میں غلطیاں نکال کر ہی ایک ملحد اپنے نفس اور قلب کو مطمئن کرتا ہے۔

سائنس کا سہارا:

حالیہ دور میں سائنس نے اپنی تحقیقات میں کائنات کی ابتداء کے حوالے سے بے مثال دریافتیں کی ہیں۔ سائنس جب بہت سے پیچیدہ عوامل جیسے کائنات کی تخلیق، زندگی کا ظہور وغیرہ کی سائنسی تشریح کرنے کے قابل ہوئی۔۔ تو کسی بھی فلسفہ حیات سے محروم تشکیک میں مبتلا منکرین خدا کو سائنس کی شکل میں نظریاتی مسیحا مل گیا۔ بگ بینگ، نظریہ ارتقاء، ڈی این اے، جدید خلائی دریافتیں، پارٹیکل فزکس اور کائنات اور زندگی کی ابتدا اور ارتقاء کی سائنسی تشریحات نے گویا منکرین کو وہ ہتھیار دے دیئے جن کے بغیر یہ مذہب سے مقابلے میں معذور تھے۔ انہی سائنسی تشریحات کا سہارا لیکر منکرین خدا تازہ دم ہو کر مذہب پر حملہ آور ہوئے۔ لیکن مذہب پر دقیانوسیت کی پھبتی کسنے والے کن سائنسی نظریات کو صحیح مانتے ہیں انکی ایک جھلک آپکو ضرور محظوظ کرے گی۔

مذہب کے مطابق خدا کی قدرت اور رسائی ہر جگہ ہے، لیکن خدا ہمیں نظر نہیں آتا۔ دوسری طرف سائنس کی حالیہ دریافت ہگز فیلڈ جو کہ ایک ایسی اندیکھی توانائی ہے جو کائنات میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہے اور جس سے مَس ہو کر ہی ہر ایٹم میں وزن آتا ہے۔ ہگز فیلڈ گویا ایک سمندر ہے جس میں کائنات کی ہر چیز تیر رہی ہے۔ کیا کسی نے اس فیلڈ کا دیکھا یا محسوس کی؟ مزید یہ کہ سائنس کے مطابق کائنات طبعی قوانین کے طابع ہے اور کائنات میں چار قوّتیں ہیں جنکی وجہ سے یہ نظام چل رہا ہے۔

اب سادہ سی منطق سے جائزہ لیں تو نہ خدا کو کسی نے دیکھا نہ ہگز فیلڈ کو نہ قوانین نظر آتے ہیں اور نہ ہی قوّتیں!

ہگز فیلڈ کو چند سائنسدانوں نے دریافت کیا اور ہمیں آگاہ کیا تو انکے علم پر یقین کی وجہ سے سب انسانوں نے اسکو قبول کیا۔ (ہگز فیلڈ کو کس نے تخلیق کیا یہ سوال الگ ہے)

دوسری طرف نبیوں نے خدا سے تعلق کا تجربہ ہونے کے بعد لوگوں کو آگاہ کیا تو عام لوگوں نے انکے اقوال پر یقین کیا کیونکہ انسانوں کا تجربہ ان نبیوں کے بارے میں یہی تھا کہ یہ سچّے ہیں۔ اب فیصلہ خود کریں کہ ان دونوں نقطہ نظر میں کتنا فرق رہ گیا ہے؟

اسی طرح نبیوں نے کہا کہ فرشتے اور جنّات ہوتے ہیں جو ایک مخفی نظام کے طابع اور اسکا حصہ ہیں، تو عام لوگوں نے یقین کیا، لیکن سائنس نے انکار کیا۔ گویا سائنس کے مطابق ایسی مخلوقات کا وجود ثابت نہیں ہے اور یہ سب تخیّلات ہیں۔ منکرین بھی یہی استدلال لاتے ہیں تو چلیئے اسے مان لیا کہ یہ درست ہونگے۔ لیکن آپکو تعجّب ہوگا کہ خلائی مخلوق کی موجودگی جواب تک ایک سائنس فکشن ہی سمجھی جاتی رہی ہے اسے بڑے سائنسدان نہ صرف قرین قیاس قرار دے رہے ہیں بلکہ اس دور کے قابل ترین سائنسدان مسٹر ہاکنگ نے ایک سو ملین ڈالر کے فنڈ سے ان خلائی مخلوق کی تلاش میں مدد بھی شروع کر دی ہے۔

اس تلاش کی یقیناً کوئی علمی اور سائنسی بنیاد ہوگی لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ وہ ایسی ہی ہو جیسی ہم سمجھتے ہیں؟ جب خلاء کے دور دراز کسی گوشے میں کوئی اجنبی زندگی موجود ہو سکتی ہے تو ہمارے اطراف کسی اور پیرائے کی ناقابل شناخت زندگی بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن سائنسدانوں کی اس سوچ سے ظاہر یہی ہوا کہ انسان کا علم ایک ترقّی کرتا عنصر ہے جس کی آئندہ عیاں ہونے والی جہتیں انسانی پہنچ سے فی الوقت باہر ہیں۔ گویا سائنسدان تنگ نظری یا ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہر میٹا فزکس کا پہلے انکار کرتے ہیں پھر جب کوئی میٹا فزکس کا عنصر تجربات اور علم کے تئیں ثابت ہوتا ہے تب اسے مانتے ہیں۔

اب ایک دوسرے پہلو کو دیکھتے ہیں۔

اسلام کہتا ہے کہ کائنات اللہ کے ارادے سے وجود میں آئی یعنی کائنات کے وجود سے قبل کچھ نہیں تھا اور اللہ نے نیست سے اسے تخلیق کیا۔ جدید سائنسداں کائنات کی تخلیق میں خدا کا کردار ماننے کو تیّار نہیں لیکن جدید سائنسدان جو کچھ لکھ رہے ہیں وہ بھی عجیب ہے۔ جیسا کہ ہم نے گزشتہ ایک تحریر میں تفصیلی تذکرہ کیا کہ اسٹیون ہاکنگ جو دہریت کے بڑے علمبردار اور جدید سائنسدانوں میں بڑے قد آور ہیں بلکہ سب سائنسدان انکی رہنما کی طرح عزّت کرتے ہیں، انکی کائنات کی خود بخود تخلیق کی مضحکہ خیز تشریح پڑھ کر سر دُھنیے! اپنی نئی کتاب ''دی گرینڈ ڈِیزائن'' میں فرماتے ہیں کہ کائنات کی تشریح کے لیئے خدا کی ضرورت نہیں اور مزید یہ بھی فرماتے ہیں: ''کششِ ثقل کے قانون کی موجودگی میں کائنات خود کو نیست سے (یعنی کچھ بھی نہ ہونے) بنا سکتی ہے بلکہ بنائے گی'' (دی گرینڈ ڈیزائن، صفحہ 227)

یہ کسی عام انسان کی تحریر ہوتی تو اب تک قیامت سر پر اُٹھ چکی ہوتی، لیکن کیونکہ یہ ایک انتہائی قابل سائنسدان نے کہی ہے تو ترقّی پسند اور روشن خیال لوگ سوچ میں پڑے ہیں کہ شاید ایسا ہو سکتا ہو یا شاید ایسا ہی ہوا ہو! لیکن اس میں سب سے مضحکہ خیز یہ مفروضہ ہے کہ

کائنات کی تخلیق سے پہلے قانونِ کشش ثقل موجود تھا۔ یہ بات عقل کی کس کسوٹی پر پوری اُترتی ہے؟ کوئی منکرِ خدا سمجھائے تو۔ جناب، جب کچھ تھا ہی نہیں تو بگ بینگ سے' باہر' کوئی اثرانداز ہونے والی قوّت کا اقرار کیا ظاہر کرتا ہے؟

کیا یہ خدا نہیں ہے؟ اسلام اسی تخلیق کو خالق اور اللہ کا اذن کہتا ہے، جبکہ سائنس مخمصوں میں ہے!

اس سے اندازہ لگائیں کہ محض خدا کو جھٹلانے کے لیئے کیا سب سے قابل اور علم والا 'ملحد' ایسی لایعنی بات کہہ کر خود کو اور دوسرے منکرین اور ملحدین کو جان بوجھ کر گمراہ نہیں کر رہا۔ الحاد کا فلسفہَ حیات توریت کا گھروندا نکلا! کیا یہ حماقت نہیں جس پر الحاد کی بنیاد ہے اسکے حمائتی ذرا توجّہ کریں کہیں قرآن کے مطابق اسی کو قلوب پر قفل اور مہرِ تو نہیں کہتے۔

ذرا سوچیئے!

بے خدا تہذیب کی پریشانی

جواہر لال نہرو دنیا کے تیسرے سب سے بڑے ملک کے وزیر اعظم تھے، جنوری 1964ء کے پہلے ہفتے میں مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس نئی دہلی میں ہوئی جس میں ہندوستان اور دوسرے ممالک کے بارہ سو ڈیلی گیٹ شریک ہوئے، پنڈت نہرو نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا:

''میں ایک سیاست داں ہوں اور مجھے سوچنے کے لئے وقت کم ملتا ہے پھر بھی بعض اوقات میں یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ آخر یہ دنیا کیا ہے، کس لئے ہے، ہم کیا ہیں اور ہم کیا کر رہے ہیں، میرا یقین ہے کہ کچھ طاقتیں ہیں جو ہماری تقدیر بناتی ہیں۔''

(National Herald, Jan, 6, 1964)

یہ ایک عدم اطمینان ہے، جو ان تمام لوگوں کی روحوں پر گہرے کہر کی طرح چھایا رہتا ہے جنہوں نے خدا کو اپنا الٰہ اور معبود بنانے سے انکار کیا، دنیا کی مصروفتوں اور وقتی دلچسپیوں میں عارضی طور پر کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اطمینان سے ہم کنار ہیں، مگر جہاں یہ مصنوعی ماحول ختم ہوا، حقیقت اندر سے زور کرنا شروع کر دیتی ہے، اور انہیں یاد دلاتی ہے کہ وہ سچے اطمینان سے محروم ہیں۔

خدا سے محروم قلوب کا یہ حال صرف ایک دنیوی بے اطمینانی کا معاملہ نہیں ہے بلکہ وہ اس سے بہت زیادہ اہم ہے، یہ چند روزہ مسئلہ نہیں بلکہ دائمی مسئلہ ہے، یہ دراصل اس تاریک اور بے سہارا زندگی کے آثار ہیں جس کے کنارے وہ کھڑا ہوا ہے، یہ اس ہولناک زندگی کی ابتدائی گھٹن ہے جس میں ایسے ہر آدمی کو موت کے بعد داخل ہونا ہے اور اس خطرے کا ایک پیشگی الارم ہے جس میں اس کی روح کو بالآخر مبتلا ہونا ہے، گھر میں آگ لگ جائے تو اس کا دھواں سوتے ہوئے آدمی کے دماغ میں گھس کر اس کو آنے والے خطرے سے باخبر کرتا ہے، اگر وہ دھوئیں کی گھٹن سے جاگ گیا تو اپنے آپ کو بچا لے جائے گا، لیکن جب شعلے قریب آجائیں تو وہ انتباہ کا وقت نہیں ہوتا، بلکہ وہ ہلاکت کا فیصلہ ہوتا ہے، جو اس کو چاروں طرف سے گھیر لیتا ہے، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تمہاری بے حسی اور بے خبری نے تمہارے لئے مقدر کر دیا ہے کہ تم آگ میں جلو۔

کیا کوئی ہے جو وقت سے پہلے بیدار ہو جائے؟

1۔میک گل یونیورسٹی کے پروفیسر بریچر (Michael Brecher) نے پنڈت جواہر لال نہرو کی سیاسی سوانح حیات لکھی ہے اس سلسلے میں مصنف نے پنڈت نہرو سے ملاقات بھی کی تھی، نئی دہلی کی ایک ملاقات میں 13 جون 1956ء کو انہوں نے پنڈت نہرو سے سوال کیا: ''آپ مختصر طور پر بتائیں کہ آپ کے نزدیک اچھے سماج کے لئے کیا چیزیں ضروری ہیں اور آپ کا بنیادی فلسفہ زندگی کیا ہے؟''

ہندوستان کے سابق وزیر اعظم نے جواب دیا: ''میں کچھ معیاروں کا قائل ہوں، آپ ان کو اخلاقی معیار Moral Standards کہہ لیجئے یہ معیار ہر فرد اور سماجی فرد کے لئے ضروری ہیں، اگر وہ باقی نہ رہیں تو تمام مادی ترقی کے باوجود آپ کسی مفید نتیجے تک نہیں پہنچ سکتے، ان معیاروں کو کیسے قائم رکھا جائے، یہ مجھے نہیں معلوم، ایک تو مذہبی نقطۂ نظر ہے لیکن یہ اپنے تمام رسوم اور طریقوں کے ساتھ مجھے تنگ نظر آتا ہے، میں اخلاقی اور روحانی قدروں کو مذہب سے علیٰحدہ رکھ کر بڑی اہمیت دیتا ہوں، لیکن میں نہیں جانتا کہ ان کو ماڈرن زندگی میں کس طرح قائم رکھا جاسکتا ہے یہ ایک مسئلہ ہے۔ (Nehru :A Political Biography,London,1959,p.607-8)''

یہ سوال و جواب جدید انسان کے دوسرے خلا کو بتاتا ہے، جس میں آج وہ شدت سے گرفتار ہے، افراد کو دیانت و اخلاق کے ایک خاص معیار پر باقی رکھنا ایک سماجی گروہ کی ایک ناگزیر ضرورت ہے، اس کے بغیر تمدن کا نظام صحیح طور پر برقرار نہیں رہ سکتا، مگر یہ خلا کیسے پُر ہو اور وہ ماحول کیسے بنے جس میں عوام اور سرکاری کارکن دیانتداری اور اتحاد کے ساتھ ترقیاتی کاموں میں اپنے آپ کو صرف کریں، اس سوال کا کوئی جواب جدید مفکرین کے پاس نہیں ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ بے خدا تہذیب کے ماحول میں نہیں ہو سکتا، بے خدا تہذیب کے اندر ہر ترقیاتی اسکیم ایک زبردست تضاد کا شکار ہوتی ہے اور وہ یہ کہ اس کا شخصی نظریہ اس کے سماجی تصور سے ٹکراتا ہے، اس کا اجتماعی پروگرام یہ ہے کہ ایک پُرامن اور خوشحال سماج کی تعمیر کی جائے، مگر اسی کے ساتھ اس کے مفکرین جب یہ کہتے ہیں کہ ''انسان کا مقصد مادی خوشی حاصل کرنا ہے'' تو وہ اپنی پہلی بات کی تردید کر دیتے ہیں۔

مادی خوشی کو زندگی کا مقصد بنانے کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص اپنی اپنی خواہش پوری کرنا چاہے، لیکن اس محدود دنیا میں یہ ممکن نہیں ہے کہ ہر شخص دوسرے کو متاثر کئے بغیر یکساں طور پر اپنی اپنی خواہش پوری کر سکے، نتیجہ یہ ہے کہ ہر آدمی جب اپنی تمام خواہشیں پوری کرنا چاہتا ہے تو وہ دوسروں کے لئے مصیبت بن جاتا ہے۔ فرد کی خوشی، سماج کی خوشی کو درہم برہم کر دیتی ہیں، ایک محدود آمدنی والا شخص جب دیکھتا ہے کہ اس کی اپنی آمدنی اس کی خواہشوں کی تکمیل کے لئے کافی نہیں ہو رہی ہے تو وہ حق ماری، بددیانتی، چوری، رشوت اور

غبن کے ذریعہ اپنی آمدنی کی کمی کو پورا کرتا ہے، مگر اس طرح جب وہ اپنی خواہش پوری کرلیتا ہے تو وہ سماج کو اسی محتاجی میں مبتلا کر دیتا ہے جس میں وہ خود پہلے مبتلا تھا۔

جدید دنیا ایک عجیب و غریب قسم کی نہایت خطرناک مصیبت میں مبتلا ہے جس کا تاریخ میں کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ ایک جرم کم سنی ہے، جو جدید زندگی کا ایک لازمہ بن چکا ہے۔ یہ کمسن مجرمین کہاں سے پیدا ہوتے ہیں، ان کی پیدائش کا سرچشمہ وہی مادی خوشی کو پورا کرنا ہے، ایک شادی شدہ جوڑا کچھ دنوں ساتھ رہنے کے بعد ایک دوسرے سے اکتا جاتے ہیں اور اپنی جنسی خوشی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں کہ نیا جسم اور نیا چہرہ تلاش کریں، اس وقت وہ طلاق لے کر ایک دوسرے سے علیٰحدہ ہو جاتے ہیں، اس علیٰحدگی کی قیمت سماج کو چند ایسے بچوں کی شکل میں ملتی ہے، جو اپنے ماں باپ کی موجودگی میں ''یتیم'' ہو گئے ہیں، یہ بچے والدین سے چھوٹنے کے بعد ماحول کے اندر اپنی کوئی جگہ نہیں پاتے، ایک طرف وہ بالکل آزاد ہوتے ہیں اور دوسری طرف ماحول سے بیزار، یہ صورتِ حال بہت جلد انہیں جرائم تک پہنچادیتی ہے۔ سر الفرڈ ڈیننگ Alfred Denning نے بہت صحیح لکھا ہے کہ

''اکثر کمسن اور نابالغ مجرمین اجڑے ہوئے گھرانوں (Broken Homes) سے نمودار ہوتے ہیں۔ (The Changing Law,p.111)''

اسی طرح موجودہ زندگی میں تمام خرابیوں کی جڑ صرف یہ واقعہ ہے کہ جدید دنیا کا انفرادی فلسفہ اور اس کے اجتماعی مقاصد ایک دوسرے سے متضاد ہیں، وہ تمام واردات جن کو ہم ناپسند کرتے ہیں اور ان کو جرم، برائی اور بدعنوانی کہتے ہیں وہ دراصل کسی شخص یا پارٹی یا قوم کی اپنی مادی خوشی حاصل کرنے کی کوشش ہی ہوتی ہے اور اسی کوشش کا سماجی انجام قتل، بدکاری، لڑائی، اغواء، جعل سازی، ڈاکہ، لوٹ کھسوٹ، جنگ اور اس طرح کی دوسری بے شمار صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔

یہ تضاد بتاتا ہے کہ زندگی کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا جو علوم وحی سے پتا چلتا ہے کہ دنیا کی مادی چیزوں کے بجائے آخرت میں خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کو مقصد بنایا جائے یہی وہ مقصد ہے جو فرد اور سماج کو باہمی تضاد سے بچا کر متوافق ترقی کی راہ پر گامزن کرتا ہے، نظریہ آخرت کی یہ خصوصیت جہاں یہ ثابت کرتی ہے کہ وہی وہ واحد بنیاد ہے، جو ترقیاتی اسکیموں کو صحیح طور پر کامیاب کر سکتی

ہے،اسی کے ساتھ وہ یہ بھی ثابت کرتی ہے کہ وہی حقیقی مقصد ہے کیونکہ غیر یقینی چیز زندگی کے لئے اتنی اہم اور اس سے اتنی ہم آہنگ نہیں ہو سکتی۔

موجودہ زمانے میں طب اور سرجری میں حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے، یہ خیال کیا جانے لگا ہے کہ سائنس موت اور بڑھاپے کے سوا ہر جسمانی تکلیف پر قابو پاسکتی ہے مگر اسی کے ساتھ بیماری کی اقسام میں نہایت تیزی سے ایک نئے نام کا اضافہ ہو رہا ہے،اعصابی بیماری Nervous Diseases یہ اعصابی بیماریاں کیا ہیں، یہ دراصل اسی تضاد کا ایک عملی ظہور ہے، جس میں جدید سوسائٹی شدت سے مبتلا ہے،مادی تہذیب نے انسان کے اس حصے کو جو نمکیات معدنیات اور گیسوں کا مرکب ہے، ترقی دینے کی کافی کوشش کی، مگر انسان کا وہ حصہ جو شعور، خواہش اور ارادہ پر مشتمل ہے،اس کی غذا سے اس کو محروم کر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ پہلا حصہ تو بظاہر فربہ اور خوش منظر دکھائی دینے لگا، مگر دوسرا حصہ جو اصل انسان ہے، وہ طرح طرح کے عوارض میں مبتلا ہو گیا۔

موجودہ امریکہ کے بارے میں وہاں کے ذمہ دار ذرائع کا اندازہ ہے کہ وہاں کے بڑے بڑے شہروں میں اسّی 80 فیصد مریض ایسے ہیں جن کی علالت بنیادی طور پر نفسیاتی سبب Psychic Causation کے تحت واقع ہوتی ہے،ماہرین نفسیات نے اس سلسلے میں جو تحقیقات کی ہیں،ان سے پتہ چلتا ہے کہ ان بیماریوں کے پیدا ہونے کے چند اہم ترین وجوہ جرم، ناراضگی،اندیشہ، پریشانی،مایوسی،تذبذب،شبہ،خود غرضی اور اکتاہٹ ہیں۔ان سارے عوارض اگر گہرائی کے ساتھ غور کیجئے تو بے خدا زندگی کا نتیجہ ہیں، خدا پر ایمان آدمی کے اندر وہ اعتماد پیدا کرتا ہے، جو مشکلات میں اس کے لئے سہارا بن سکے، وہ ایسا برتر مقصد اس کے سامنے رکھ دیتا ہے، جس کے بعد وہ چھوٹے چھوٹے مسائل کو نظر انداز کر کے اسکی طرف بڑھ سکے، وہ اس کو ایسا محرک دیتا ہے، جو سارے اخلاقی محاسن کی واحد بنیاد ہے، وہ عقیدے کی طاقت دیتا ہے جس کے متعلق سر ولیم اوسلر Sir William Osler نے کہا ہے ''وہ ایک عظیم قوت محرکہ (Great Moving Force) ہے جس کو نہ کسی ترازو میں تولا جاسکتا ہے اور نہ لیبارٹری میں اس کی آزمائش کی جاسکتی ہے ''یہی عقیدے کی طاقت دراصل نفسیاتی صحت کا خزانہ ہے، جو نفسیات اس سرچشمہ سے محروم ہو وہ بیماریوں کے سوا کسی اور انجام سے دوچار نہیں ہو سکتی، یہ انسان کی بدقسمتی ہے کہ وقت کے ماہرین نفسیاتی یا اعصابی عوارض کا کھوج لگانے میں تو کمال درجے کی ذہانت کا ثبوت دیا ہے، مگر ان نو دریافت بیماریوں کا صحیح علاج تجویز کرنے میں وہ سخت ناکام ہوئے ہیں،ایک عیسائی عالم کے الفاظ میں ''نفسیاتی علاج کے ماہرین صرف اس تالے کی باریک تفصیلات بتانے میں اپنی کوشش صرف کر رہے ہیں، جو ہمارے اوپر صحت کے دروازے بند کرنے والے ہیں۔''

جدید معاشرہ بیک وقت دو متضاد عمل کر رہا ہے، ایک طرف وہ مادی ساز و سامان فراہم کرنے میں پوری قوت صرف کر رہا ہے، دوسری طرف مذہب کو ترک کر کے وہ حالات پیدا کر رہا ہے جس سے زندگی طرح طرح کے عذاب میں مبتلا ہو جائے، وہ ایک طرف دوا کھلا رہا ہے، اور دوسری جانب زہر کا انجیکشن دے رہا ہے، یہاں میں ایک امریکی ڈاکٹر ارنسٹ اڈولف (Paul Ernest Adolph) کا ایک اقتباس نقل کروں گا جو اس کے سلسلے میں ایک دلچسپ شہادت فراہم کرتا ہے:

جن دنوں میں میڈیکل اسکول میں زیر تعلیم تھا، میں ان تبدیلیوں سے آگاہ ہوا جو زخم ہو جانے کی صورت میں جسم کے اخلاط (Body Tissues) میں رونما ہوتی ہیں، خوردبین کے ذریعہ نسیجوں کا مطالعہ کرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ نسیجوں پر مختلف موافق اثرات کے واقع ہونے سے زخم کا اطمینان بخش ریکوری ہوتی جاتی ہے۔۔اسپتال میں جن مریضوں کی نگرانی میرے سپرد کی گئی ان میں ایک ستر سال کی بوڑھی عورت تھی جس کا کولھا زخمی ہو گیا تھا، ایکسرے تصاویر کے معائنہ سے معلوم ہوا کہ اس کی نسیجیں (Tissues) بڑی تیزی سے ٹھیک ہو رہی ہیں، میں نے اس سرعت کے ساتھ شفایابی پر اس کو مبارکباد پیش کی، انچارج سرجن نے مجھے ہدایت کی کہ اس خاتون کو 24 گھنٹے میں رخصت کر دیا جائے، کیونکہ اب وہ کسی سہارے کے بغیر چلنے پھرنے کے قابل ہو گئی ہے۔

اتوار کا دن تھا، اس کی بیٹی ہفتہ وار ملاقات کے معمول کے مطابق اسے دیکھنے آئی، میں نے اس سے کہا کہ چونکہ اس کی ماں اب صحت یاب ہے، اس لئے وہ کل آکر اسے اسپتال سے گھر لے جائے، لڑکی اس کے جواب میں کچھ نہیں بولی اور سیدھی اپنی ماں کے پاس چلی گئی، اس نے اپنی ماں کو بتایا کہ اس نے اپنے شوہر سے اس کے بارے میں مشورہ کیا ہے، اور یہ طے ہوا ہے کہ وہ اس کو اپنے گھر نہ لے جا سکیں گے، اس کے لئے زیادہ بہتر انتظار کی صورت یہ ہے کہ اس کو کسی دار لضعفاء (Old People's Home) میں پہنچا دیا جائے۔ جند گھنٹوں کے بعد جب میں اس بڑھیا کے پاس گیا تو میں نے دیکھا کہ بڑی تیزی کے ساتھ اس پر جسمانی انحطاط طاری ہو رہا ہے، چوبیس گھنٹے کے اندر ہی وہ مر گئی، کولھے کے زخم کی وجہ سے نہیں بلکہ دل کے صدمے کی وجہ سے (Not of her broken hip, but of a broken heart) ہم نے ہر قسم کی ممکن طبّی امداد اسے پہنچائی، مگر وہ جانبر نہ ہو سکی، اس کے کولھے کی ٹوٹی ہوئی ہڈی تو بلکل درست ہو چکی تھی، مگر اس کے ٹوٹے ہوئے دل کا کوئی علاج نہ تھا، وٹامن، معدنیات اور ٹوٹی ہوئی ہڈی کو اپنی جگہ لانے کے لئے سارے ذرائع استعمال کرنے کے باوجود صحت یاب نہیں ہوئی، یقینی طور اس کی ہڈیاں جڑ چکی تھیں، اور عنصر جو درکار تھا، وہ وٹامن نہیں تھا، نہ معدنیات تھے اور نہ ہڈیوں کا جرنا تھا، یہ صرف امنگ (Hope) تھی، اور جب زندگی کی امنگ ختم ہو گئی تو صحت بھی رخصت ہو گئی۔

اس واقعہ نے مجھ پر گہرا اثر کیا ہے، کیونکہ اس کے ساتھ مجھے یہ شدید احساس تھا کہ اس بوڑھی خاتون کے ساتھ ہر گز یہ حادثہ پیش نہ آتا ،اگر یہ خاتون خدائی امید (God of Hope) سے آشنا ہوتی، جس پر ایک عیسائی حیثیت سے میں اعتقاد رکھتا ہوں۔ (The Evidence of God,p.212-14) ''

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جدید ترقی یافتہ دنیا کس قسم کے تضاد سے دوچار ہے، وہ ایک طرف سارے علوم کو اس نہج پر ترقی دے رہی ہے جس سے خدا کا وجود غلط ثابت ہو جائے، تعلیم و تربیت کے پورے نظام کو اس ڈھنگ سے چلایا جارہا ہے، جس سے خدا اور مذہب کے احساسات دلوں سے رخصت ہو جائیں، اس طرح روح اصل انسان کو موت کے خطرے میں مبتلا کر کے اس کے جسم مادی وجود کو تقویت دینے کی سعی کی جارہی ہے، نتیجہ یہ ہے کہ عین اس وقت جبکہ بہترین ماہرین اس کی ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو جوڑنے میں کامیابی حاصل کر چکے ہوتے ہیں، عقیدے کی اندرونی طاقت جو اسکو امید دلاتی سے اس کا دل ٹوٹ جاتا ہے، اور بظاہر جسمانی صحت کے باوجود وہ موت کے آغوش میں چلا جاتا ہے۔

یہ وہ تضاد ہے جس نے آج پوری انسانیت کو تباہ کرر کھا ہے، خوش پوش جسم حقیقی سکون سے محروم ہیں، عالی شان عمارتیں اجڑے ہوئے دلوں کا مسکن ہیں، جگمگاتے ہوئے شہر جرائم اور مصائب کا مرکز ہیں، شاندار حکومتیں اندرونی سازش اور بے اعتمادی کا شکار ہیں، بڑے بڑے منصوبے کردار کی خامی کی وجہ سے ناکام ہو رہے ہیں، غرض مادی ترقیات کے باوجود زندگی بالکل اجڑ گئی ہے، اور یہ سب نتیجہ ہے صرف ایک چیز کا کہ انسان نے اپنے خدا کو چھوڑ دیا، اس نے اس سرچشمہ سے اپنے آپ کو محروم کر لیا، جو اس کے خالق و مالک نے اس کے لئے مہیا کیا تھا۔

نفسیاتی امراض کی نوعیت جو اوپر بیان کی گئی ہے، وہ اتنی واضح حقیقت ہے کہ خود اس فن کے ماہر نے اس کا اعتراف کیا ہے، نفسیات کے مشہور عالم پروفیسر ینگ (C.G. Jung) نے اپنی زندگی بھر کا تجربہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

پچھلے تیس برسوں میں روئے زمین کے تمام متمدن ممالک کے لوگوں نے مجھ سے (اپنے نفسیاتی امراض کے سلسلے میں) مشورہ حاصل کرنے کے لئے رجوع کیا ہے، میرے مریضوں میں زندگی کے نصف آخر میں پہنچنے والے تمام لوگ جو کہ 35 سال کے بعد کہی جاسکتی ہے کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جس کے مسئلہ کا حل مذہبی نقطہِ نظر پانے کے سوا کچھ اور ہو، یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ان میں سے ہر شخص کی

بیماری یہ تھی کہ اس نے وہ چیز کھودی تھی جو کہ موجودہ مذاہب ہر دور میں اپنے پیروؤں کو دیتے رہے ہیں (ایمان، امید اور محبت)، اور ان مریضوں میں سے کوئی بھی حقیقۃً اس وقت تک شفایاب نہ ہو سکا، جب تک اس نے اپنا مذہبی تصور دوبارہ نہیں پالیا۔"

(Quoted by C.A. Coulson, Science and Christian Belief, p.110

یہ الفاظ اگرچہ سمجھنے والے کے لئے بجائے خود بالکل واضح ہیں، تاہم اگر میں نیویارک اکیڈمی آف سائنس کے صدر اے، کریسی مارلسین کے الفاظ نقل کردوں تو بات بالکل مکمل ہو جائے گی:

ادب و احترام، فیاضی، کردار کی بلندی، اخلاق، اعلیٰ خیالات اور وہ سب کچھ جس کو خدائی صفات (Divine Attributes) کہا جاسکتا ہے، وہ کبھی الحاد سے پیدا نہیں ہو سکتیں جو کہ دراصل خود بینی کی عجیب و غریب قسم ہے، جس میں آدمی خود اپنے آپ کو خدا کے مقام پر بٹھالیتا ہے، عقیدے اور یقین کے بغیر تہذیب تباہ ہو جائے گی، نظم، بے نظمی میں تبدیل ہو جائے گی، ضبط نفس اور اپنے آپ پر کنٹرول کا خاتمہ ہو جائے گا اور برائی ہر طرف پھیل جائے گی، ضرورت ہے کہ ہم خدا پر اپنے یقین کو دوبارہ مضبوط کریں۔"

Man Does not Stand Alone, p.123)

مجھے الحاد میں کیوں کشش محسوس نہیں ہوئی؟

الحاد کی کھائی سے واپس آنے والی ایک جدید تعلیم یافتہ لڑکی کا تجزیہ:

1 -فریڈم آف سپیچ/ایکسپریشن کے نام پر کوئی بھی شخص مجھے بُرا بھلا کہے. میری پراپرٹی چھین لے. میرا یا میرے عزیزوں کا قتل کردے. الحاد کے پاس کوئی ایسا خودکار نظام موجود نہیں ہے جو مجھے سو فیصد انصاف مہیا کر سکے.

2 -میں نے ملحدین کو ہمیشہ تعصب پرور پایا. مذہبی مقدس شخصیات و مقامات و کتب کی تضحیک و تنقید میں ملحدین ہمیشہ حد سے بڑھے نظر آئے. جس نے مجھ پر الحاد کی شر انگیزی ظاہر کر دی.

3 -ملحدین سے جب بھی خدا کے رد کی وجہ دریافت کی تو جواب میں یا تو نظریہ خود بخود سننے کو ملا یا پھر یہ سوالات کہ اگر کوئی خدا ہے تو اُسے ثابت کرو. اور یہ بتاؤ کہ خدا کو کس نے پیدا کیا. اسکا سادہ سا جواب میرے پاس یہی ہے وہ خدا ہی کیوں جس کا وجود ثابت کیا جا سکے. اور کوئی بھی پیدا کیے جانے لائق ہستی خدا ہر گز نہیں ہو سکتی.

4 -الحاد میں عورت کا بے حد استحصال دیکھنے کو ملا. ملحدین کو عورت کے جسمانی اعضاء کو کھلے عام ڈسکس کر کے قہقہے لگاتے پایا. ''چالو'' عورت کی تعریف ملحدین کی زبانی ہی سننے کو ملی. عورت کو بیوی کی بجائے چند گھنٹوں کے لیے گرل فرینڈ بنا کر استعمال کیے جانے جیسے عمل کو الحاد میں درست پایا. اس کے برعکس مذہب نے عورت کو نا صرف تحفظ دیا اور رشتوں کے تقدس کا احساس دلایا. بلکہ تمام شرعی حقوق سے نوازا.

5 -الحاد میں منافقانہ طرز عمل نے مجھے اس سے کوسوں دور رکھا. مثال کے طور پر یہی ملحدین جو سارا سال سور جیسے جانور کے اسلام میں ممنوع ہونے پر شور مچاتے رہتے ہیں کہ یہ کھانے کی اجازت کیوں نہیں. عیدالاضحیٰ پر جانوروں کی قربانی پر جانوروں کے حقوق کا رونا روتے نظر آئے.

6 -میں نے ملحدین کو ہمیشہ کم علم مذہبی افراد کو گمراہ کرنے میں مصروفِ عمل پایا. ان کم علم اذہان کے سامنے دینی اشکال کی ہیئت بگاڑتے ملحدین نے مجھ پر الحاد کی قبیح صورت واضح کر دی.

7 -اہل علم مذہبی افراد کے ساتھ مناظرے و مکالمے کے دوران اکثر ملحدین کی پسپائی نے مجھ پر الحاد کی اصلیت کھول کے رکھ دی.

8 -الحاد میں اخلاقی اقدار کا اس قدر فقدان نظر آیا کہ جب جب ملحد مذہبیوں کے سامنے پسپا دکھائی دیے انہوں نے اخلاقیات کا دامن چھوڑ دیا. لہذا مجھے یہ واضح ہو گیا کہ ملحد ہو اور گالی نہ دے یہ ہو نہیں سکتا.

9 -ملحدین کا ہمیشہ مذہبی تعلیمات کے ادھورا بیان کرنے اور توڑ مروڑ کر پیش کرنے جیسے منافقانہ عمل نے مجھے الحاد کی کاذبیت کا یقین دلایا.

10 -ملحدین کا مذہبیوں کے درمیان فرقہ وارانہ فسادات کا موجب ہونا اور فیک آئیڈیز سے کسی خاص فرقہ کی تشہیر یا مخالفت کرنے جیسے متعدد واقعات نے الحاد کی شیطانی سازش کو مجھ پر بے نقاب کیا.

11 -ملحدین کے پاس نا تو کوئی ایسی معقول کتاب پائی نہ ہی مینی فیسٹو جس کی حقانیت پر شبہ نہ کیا جاسکتا ہو اور اُسکی تعلیمات کے مطابق ادیانِ عالم پر تنقید یا اصلاح کی جاسکے. محض انسانی عقل کے بل بوتے پر انبیاء اور الہامی کتب کا انکار صرف ہٹ دھرمی ہی ہو سکتی ہے.

12 -الحاد کے پاس ایسا کوئی سماجی یا معاشی نظام دکھائی نہیں دیا. جس کہ تحت زر کی پراپر سر کولیشن کے ذریعے غرباء کی فلاح و بہبود کے لیے اقدامات کیے جائیں. نہ ہی جرائم کی روک تھام کے لیے ایسا عادلانہ نظام موجود ہے جس کی موجودگی میں چین و سکون کی زندگی گزاری جاسکے.

13 -الحاد دکھی و غمگیں دِلوں کی مشکلات و پریشانیوں کا مداوا کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا. یہ انسان سے اسکا سب سے مضبوط سہارا دُعا چھین لیتا ہے.

14 -الحاد نیکی کے بدلے اخروی انعام اور برائی کے بدلے اخروی عذاب جیسے نتائج کا منکر ہے. جس سے نیکی کرنے کا شوق اور برائی سے بچنے کا احساس بیدار ہونا تقریباً ناممکن ہے.

15 -ملحدین تمام سائنسی علوم پر صرف اپنا قبضہ سمجھتے ہیں اور مذہبیوں کو کم عقلی کے طعنے دیتے نظر آتے ہیں. جبکہ اگر مجموعی طور پر تجزیہ کیا جائے تو تمام اہم ایجادات و دریافتوں کے پیچھے مزہبیوں کی ان تھک محنت شامل ہے.

مندرجہ بالا تمام وجوہات نے عارضہ نرگسیت کے شکار الحاد کو میرے لیے بے کشش اور کھوکھلا ثابت کیا. ایسی ہی کئی اور وجوہات کے سبب مذہب کی سچائی مجھ پر مکمل طور پر آشکار ہوئی. اور ایمان بالغیب مزید پختہ ہوتا چلا گیا.

من نمی ملحد

کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں آدمی کے بجائے عدمی ہوں اور یہ زندگی ایک لامتناہی گمان سے زیادہ کچھ نہیں... سب کچھ 'ہونا' ناممکن سا لگتا ہے... یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ 'زندگی' میرے ورود سے پہلے بھی ایسے ہی رواں دواں تھی اور میرے بعد بھی ایسے ہی جادہ پیما رہے گی... یہ کیسی نامکمل سی تصویر ہے ازل اور ابد کے بغیر... آخرت کے بغیر!...

~آگہی میں اِک خلا موجود ہے

اس کا مطلب ہے خدا موجود ہے

اور پھر جب نفسیات مابعد الطبعیاتی (میٹافزکل) دقیقہ سنجیوں میں معلّق سوچتا ہوں ازل کے بارے میں کہ آخر رب کے بغیر دنیا وجود میں ہی کیسے آئی تو عدم سے آدم نکلتا محسوس نہیں ہوتا... مطلب کہ اگر 'فلسفہ' دھماکہ '(بگ بینگ) کو ایک لمحے کیلئے تھوڑی سی جگہ دے کر دیکھ بھی لیا جائے کہ 'کچھ نہیں' سے 'سب کچھ' بن گیا تو بھی یہ بات کتنی بد منطقی ہے کہ جرثومۂ واحد سے ہی ارتقائی منازل طے کرتا انسان معدوم سے موجود ہوا ہے... تو پھر تمام جرثومے انسان ہی کیوں نہ بن گئے... کوئی بھینس، کوئی بلی، کوئی شتر مرغ، کوئی مچھلی، کوئی پرندہ کیونکر بنا...!؟ اور اس میں پھر عدم سے ہی ایسی صلاحیت کیسے ودیعت ہوئی کہ اس بے بس و بے کس جرثومے نے کارآمد ارتقائی تبدّل قبول کیے اور بے کار نظر انداز کرتا رہا جبکہ اس کا اپنا کوئی ارادہ ہی نہیں تھا... خشکی والوں نے پانی میں سانس لینے کی ارتقائی منزل کیوں ترک کر دی اور آبی نے خشکی میں سانس لینے کے ارادے کا بیڑا کیوں نہیں اٹھایا بلکہ الٹا بیڑا غرق کر لیا اپنا...!؟ اسکے بعد عورت اور مرد کے نہ

صرف طبعی مختلف اجسام بلکہ انکے ارادے، مزاج اور متعیّن شدہ طریقۂ نسلِ انسانی... کہ عورت کا کام اس کو اپنے اندر سنبھالنا اور پرورش کرنا اور قرآن میں ربّ کا فرمانا

مَاجَعَلَ اللّٰہُ لِرَجُلٍ مِنۡ قَلۡبَیۡنِ فِیۡ جَوۡفِہٖ۔= نہیں بنائے اللہ تعالی نے مرد کے پہلو میں دو دل! (الاحزاب ۳)

ادھر صرف مرد کا ذکر ہوا... کیونکہ عورت حمل ٹھہرنے کے بعد دو دلوں کی پاسبان ہو جاتی ہے... اسی طرح نہ صرف انسان بلکہ ہر جنس میں دو اصناف اور ان میں بھی یہ متعیّن کہ وہ مخصوص کام مادہ کا ہی ٹھہرا... کبھی مرد نے بچہ کیوں نہ جنا...!؟ یا عورت نے ہی کبھی انڈا کیوں نہ دیا...!؟ انڈے یا بچے دینے والوں نے کبھی ایک دفعہ ہی سہی جننے کا دوسرا انداز کیوں نہ اپنایا ارتقاء کے ذریعے...!؟ یہ اتنا 'تعیّن' ظاہر کرتا ہے کہ کوئی ہے جو اس سب 'ارادے' کے پیچھے ہے... وگرنہ ہر ارتقائی عمل کا ایک جیسا نتیجہ کیوں نکلا...!؟ آدھا گھوڑا آدھا انسان صرف ہیری پوٹر میں ہی کیوں...!؟ اصل میں ارتقاء نے اسے ثابت کیوں نہ کیا...!؟ میڈِیُوسا (سنپیلی عورت) صرف دیومالا میں کیوں...!؟ بندر سے بنتا انسان اب کیوں نہیں...!؟ یک چشم دیو (سائیکلاپس) صرف 'گاڈ آف وار' اور اسی نہج کی گیموں اور موویوں میں ہی کیوں...!؟ 'ڈے وِی جونز' اور 'کریکن' فقط قزاقی داستانوں کا حصہ ہی کیوں...!؟ یک سینگھی گھوڑا (یُونی کارن) اور اسی طرح کی دوسری مخلوقات فقط اساطیری قصّوں میں ہی کیوں...!؟ کوئی جرثومہ ان میں سے ایک کیوں نہ بنا...!؟ ارتقاء نے یہ سب کیوں نہ ثابت کیا...!؟ ارتقاء کے عمل سے گزرتے جرثومے سب کے سب ہی ایسے عمدہ کیسے ہیں...!؟ کوئی آدھا انسان آدھا مچھلی کیوں نہ بنا' ایکوَامین (Aqua Man) ' کی طرح...!؟ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ یہ سب اس طرح دکھائے گئے ہیں کہ اصل ہوں... بلکہ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ جتنے ممکنات جرثومے کے انسان بننے کے ہیں اتنے ہی باقی اشیاء بننے کے بھی ہیں... پھر کیوں نہ بنے...!؟ کیا معلوم کہ جینیاتی گھپلے (Genetic Engineering and Mutation) کے ذریعے یہ اس طرح کی مخلوق وضع کرنے میں کامیاب ہو بھی جائیں... مگر وہ 'ارتقائی نتیجہ' تو کسی طرح نہ کہلایا جا سکے گا... سوال تو پھر بھی برقرار رہے گا... حیرت ہے کہ رب کے اوپر بغیر دیکھے ایمان نہ لانے والے اس نظریۂ ارتقاء پر بغیر دیکھے ایمان کیونکر لے آئے...!؟ یہ منطق کی عبادت کرنے والے اتنے بڑے خائن کیسے ہو سکتے ہیں...!؟ مگر ہم دیکھتے آئے ہیں... کہ یہ سب سوفسطائیت زدہ زہنیت کے مارے ہیں... ان کے ذہن اصل میں اتنے ٹیڑھے ہو گئے ہیں کہ انھیں پیچیدہ بات سیدھی لگنے لگی ہے... حالانکہ پیر اگر ٹیڑھا ہو تو اس پر جوتا بھی ٹیڑھا ہی آئے گا... سیدھا نہیں... اسی کی مانند ان کے ذہن اب سیدھی بات نہیں قبول کرینگے... کیونکہ یہ مزعومہ پر پیچ گتھیوں میں خود کو اتنا الجھا چکے ہیں کہ سلجھنا شاید ان کی قسمت میں ہی نہیں رہا... ٹیڑھا جوتا انکے خمیدہ پیر پر چڑھ گیا ہے تو یہ اسے ہی سیدھا سمجھنے لگ گئے ہیں... حالانکہ فلسفہ پینسپَرمِیا (Panspermia) بھی زندگی 'کب اور کہاں' کا

جواب دیتا ہے...اور 'کیسے' کا اسکے پاس جواب محض 'خودروئی (Abiogenesis) 'ہی ہے...یعنی 'کچھ نہیں' سے 'سب کچھ' کا نکلنا... حالانکہ یہ سب کچھ انتہائی غیر منطقی ہے... کیونکہ اٹھارھویں اور انّیسویں صدّی میں رُو بہ عمل ہونے والے سلسلہ وار تجربات نے ثابت کر دیا تھا کہ زندگی زندگی سے ہی نکلتی ہے...از خود پیدا ہونا محال ہے...لاطینی میں کہا جاتا تھا

Omne vivum ex vivo, Latin for "all life [is] from life." A related statement is Omnis cellula e cellula, "all cells [are] from cells;"

یعنی ہر زندگی کا مخرج زندگی ہی ہے...اسی سے متعلقہ ایک اور قول تھا کہ ہر خلیہ (سیل) خلیے سے ہے!...

اور اسکی سائنسی تطبیق لوئس پاسچر (Louis Pasteur) نے دی تھی اپنے تجربات کے ذریعے...اور ان تجربات میں اس نے ثابت کیا تھا کہ زندگی از خود رفتہ نہیں ہے...اسکے الفاظ آج بھی تاریخ میں ثبت ہیں...اسنے کہا تھا

"La génération spontanée est une chimère"

("Spontaneous generation is a dream").

"خودرُو زندگی ایک خواب ہے"!...

یہ منطق کے پیروکار جانے کیوں سائنس کی ثابت کردہ چیزوں کو ہی ٹھکرا رہے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ 'ثبوت' لاؤ...ثبوت جانے کس چڑیا کا نام ہے انکے یہاں... جانے کیوں جب بھی الحاد کی بات ہوتی ہے مجھے قراۃ العین طاہرہ یاد آجاتی ہے...ایک تو حسن کی فراوانی...اور وہ بھی ایرانی... جسے اقبال نے 'خاتونِ عجم' کہہ کر پکارا... وہ بہابی مذہب کی داعیہ جس کو شاعرہ ہونے کا شرف بھی حاصل تھا...ایسی پرکار اور چابکدست نقاب آرا مقررہ تھی کہ لوگوں کو اپنی ندا کے حصار میں جکڑ لیتی تھی...اور منتہائے کلام پر جب سامعین اس کے دام میں آچکے ہوتے تھے تو یک دم اپنا نقاب الٹتی تھی اور ایک خلقت از خود رفتگی میں اس کا کلمہ پڑھنا شروع کر دیتی تھی...'نوائے طاہرہ' نام کی فارسی غزل پڑھ کر ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ کیا فتنہ زا شخصیت رہی ہو گی... بالکل اسی طرح...جب الحادی سوچیں دماغ تک رسائی حاصل کرتی ہیں تو بندہ ان کے ساتھ بہنا شروع ہو جاتا ہے اور اسی ارتیابیت زدگی (تشکیک) کے دوران جب ایک دم سے اسے اسکے نفس کی پسندیدہ ترین چیز بے روک ٹوک ملتی ہے تو وہ مست ہو جاتا ہے اور بے اختیار پکار اٹھتا ہے...لَایَھُم...اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا...انکار از وجودِ خدا اسکا کام

ٹھہرتا ہے... دین اسکو 'ترقی' کی راہ میں بوجھ لگتا ہے... حالانکہ خدا کے وجود کے انکار میں کوئی جاؤ و تھوڑا ہی ہے کہ اسکا ارتکاب کرتے ہی صنعتیں آپوں آپ کھڑی ہونا شروع ہو جائیں!...

یہ تو ہو گئی زندگی کی 'شروعات' کے بارے میں موجود الحاد میں پیچیدگی... باقی موت اس سے زیادہ عقل سے ماورا ہے الحاد میں... مرنے کے بعد جسم تو ویسا ہی باقی رہتا ہے... پھر کیا شے ہے جو انسان کو زندہ کرتی ہے...!؟ کیا گردش کرتا خون یا کیا...!؟ وہ پمپ کے ذریعے گردش میں لاؤ... انسان نہیں زندہ ہو گا... پھر...!؟ اور پھر اسکے مرنے سے جو کروڑہا خلیے اور جرثومے وجود میں آئے تو انھوں نے ارتقائی منازل طے کر کے کروڑ نہیں، لاکھوں نہیں، ہزاروں نہیں، سیکڑوں چھوڑ محض ایک نیا انسان کیوں نہ بنایا...!؟ یا انسان بھی برطرف؛ محض چوہا، مینڈک یا چھپکلی کیوں نہ بنائی..!؟ اور جو مرنے سے پہلے تک اچھا بھلا ایک چلتا پھرتا بندہ تھا، ایک جسم، سوچ، تخیل، نظریات، مزاج رکھنے والا... وہ کہاں گیا...!؟ کیا بس فضا میں دھول بن کر تحلیل ہو گیا...!؟ وہ کیا شے ہے جو جسم کو زندہ کرتی ہے...!؟ مادّے (Matter) اور انَرجی (Energy) کا قانونِ دوام (Law of Conservation) کیا ہوا...!؟ یا یہ مانا جائے کہ دنیا میں محض گنے چنے اجسام ہی ہیں کہ اِدھر مرا اور اُدھر دوسری صورت میں زندہ ہو گیا...!؟ اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے... اور اگر اس تمام مربوط زندگی کو دہرایا جانے والا مان بھی لیا جائے تو یہ جو نئے نئے انسان اور ہر انسان کا الگ مزاج آرہا ہے اس کو کیا مانا جائے گا...!؟ اور انسان اپنے جسم سے جدا ہو کر کچھ روح ہوتا بھی ہے یا محض جسم ہی ہوتا ہے جو ایک جسم سے دوسرے قالب میں ڈھل جاتا ہے... اور اگر ایسا ہوتا ہے تو اسے یاد کیوں نہیں رہتا کہ وہ پہلے فلاں بندہ فلاں ملک میں تھا اور اس دفعہ اس نے یہ قالب اپنایا...!؟ اور اگر اسی کو مان لیا جائے تو یہ تو سیدھا سادہ ہندوؤں کا نظریۂ آواگون ہے... مرنے کے بعد کتے بلی بنو اور بھول جاؤ... اور اسی طرح قالب بدلتے جاؤ نروانہ حاصل کرنے کیلئے... تم پوچھتے ہو کہ آخرت کیوں ضروری ہے...!؟ جاؤ کسی تاریک کوٹھری میں سلاخوں کے پیچھے سسکنے والے کسی بے گناہ انسان سے پوچھو... وہ تمھیں اچھی طرح بتائے گا کہ آخرت کیوں ضروری ہے!...

کہتے ہیں کہ 'غیب' کوئی چیز نہیں ہے اور اسکو 'ثابت' کرنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے... انھوں نے شاید گوڈل کے ریاضیاتی منطق کے نظریاتِ تشنگی (Godel's Theorems of Incompleteness) نہیں پڑھے... بقول بسمِل اسکا پہلا نظریہ یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ

''کوئی بھی ایسا مربوط منطقی نظام (consistent logical system) جس میں بنیادی حساب کو مشاہدہ میں لایا جاسکے، ان میں کچھ قضیے یا جملے ضرور ایسے ہونگے جو نہ ثابت کیے جاسکیں گے نہ رد کیے جاسکیں گے''!...

دوسرا نظریہ یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

''کسی بھی مربوط منطقی نظام کو اسی نظام میں رہتے ہوئے مربوط ثابت نہیں کیا جاسکتا۔''

اس کا سادہ سا مطلب یہ ہے کہ جب بھی کسی منطقی نظام کے مربوط ہونے کا مشاہدہ ہوگا تو وہ لا متناہی یا ناتمام ہوگا...اسی وجہ سے انہیں ناتمامی کے تھیورم بھی کہتے ہیں...یعنی یہ کہ کوئی بھی مربوط منطقی نظام ہمیشہ ناتمام رہے گا... کیونکہ کوئی بھی منطقی نظام اگر مکمل ہے، اور اس کے سارے قضیے اسی نظام کے تحت حل ہو سکتے ہیں تو وہ مکمل کہلا سکتا ہے... لیکن تکمیل کی صورت میں غیر مربوط (Inconsistent) ہو جائے گا... اس میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ بہت سی باتیں سچ ہوتے ہوئے بھی ناقابلِ اثبات (True but Unprovable) رہیں گی!...

گویا ایسا کوئی بھی منطقی نظام جو اپنے آپ میں ایسا کوئی محال جملہ نہ رکھتا ہو، وہ مربوط (consistent) نہیں ہو سکتا...اور جو بھی نظام مربوط ہوگا وہ جملۂ محال سے پاک نہیں ہو سکے گا... کوئی ایک جملہ ضرور رہے گا جس کا اثبات (Proof) ممکن نہیں ہوگا... مگر وہ پوری آب وتاب سے موجود ہوگا!...

اسی طرح 'غائب' جاننے کیلئے اس نظام سے نکلنا ضروری ہے...اور اسکا فقط ایک ہی طریقہ ہے...اور وہ ہے 'موت'...! موت سے ہمکنار ہونے کے بعد 'غیب' کا عالم نظر آجائے گا... جنھیں یقین نہیں ہے وہ موت کے بعد کا جاننے کیلئے کبھی مرنے کا 'تجربہ' کیوں نہیں کرتے...!؟ وہ تو 'تجربات' پر یقین رکھتے ہیں نا...!؟ (قطع نظر لوئس پاسچر کے 'ثابت شدہ' تجربے کو ٹھکرانے کے)...اپنی دھڑکن معدوم کرواکے مرجائیں اور تصدیق کرلیں جاکر...اور جسم میں جان ڈلوالیں جو بقول انکے 'خود بہ خود' آگئی... کیا انھیں 'تجرباتِ قریب المرگ' (Neat Death Experiences-NDE) نہیں معلوم...!؟ ان لوگوں کے تجربات جو کچھ دیر کیلئے مرے اور پھر زندہ ہو گئے...! کیا انکی باتیں بھی ان کیلئے قابلِ التفات نہیں...!؟ کہ 'کوئی' موجود ہے... دنیاوی زندگی ایک ربط ہے...اور اس سے وسیع تر ربط اخروی زندگی ہے...اور موت ہی صرف وہاں تک کی سواری ہے... مگر واپسی کا راستہ نہیں ہے... کیونکہ دنیا جائے امتحان ہے...اور امتحان کے بعد فقط نتیجہ ہی آتا ہے!...

یہ پوری کائنات اور اس میں محصور چیزیں جس طرح چل رہی ہیں اور باقاعدہ سائنسی قوانین (Laws Of Science) پر چل رہی ہیں تو اس سے یہی پتا چلتا ہے کہ 'کسی اور' کا ارادہ اسکے پیچھے کارفرما ہے... المانیہ (جرمنی) کا فلسفی المزاج آدمی شوپن ہار (Schopenhauer) بھی اسی نتیجہ پر پہنچا تھا کہ پس از افعالِ انسان 'ارادہ' ہی کارفرما ہوتا ہے اگرچہ وہ ارادہ خود انسان کے اختیار میں نہیں...اور اس سے بہتر نتیجے پر حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ سیکڑوں سال قبل پہنچے تھے کہ

'عرفت ُربی بفسخ العزائم...'

میں نے اپنے ربّ کو اپنے عزائم کے ٹوٹنے سے پہچانا!...

کیونکہ انسان کا اپنا ارادہ کچھ نہیں ہے...وہ منصوبے بناتا ہے مگر ارادے ربّ کے ہی چلتے ہیں!...

مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَ مَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ...

وہ اللہ جسے ھدایت دے اسے کوئی گمراہ کرنے والا نہیں اور جسے وہ گمراہ کرے اسے کوئی ہدایت یاب کرنے والا نہیں!...

بدُونِ دین پوری تصویر ہو ہی نہیں سکتی...بلکہ اصل حقیقت صرف 'وہ' ہی ہے...! وہ سورۂ یٰس میں فرماتا ہے

وجَعَلۡنَا مِنۡۢ بَیۡنِ اَیۡدِیۡھِمۡ سَدًّا وَّ مِنۡ خَلۡفِھِمۡ سَدًّا فَاَغۡشَیۡنٰھُمۡ فَھُمۡ لَا یُبۡصِرُوۡنَ (یٰس ۹)

اور بنادی ہم نے ان کے آگے دیوار اور ان کے پیچھے دیوار پھر ان کو ڈھانپ دیا تو یہ دیکھ نہیں سکتے!...

اس رب نے پوری کتاب میں اپنے آپکو پہچاننے کے تین طریقے بتائے ہیں...اس نے گزری ہوئی قوموں کا ماجرہ بیان کیا...اس نے کہا کہ کیا تم زمین پر نہیں پھرتے کہ خود دیکھ لو کہ تم سے اگلوں کا کیا حال ہوا...!؟ کنفیُوشس کا کہنا تھا...'ماضی کا مطالعہ کرو...اگر تم مستقبل سے متعارف ہونا چاہتے ہو...!' پھر اس رب نے ایک دوسرا طریقہ جو بیان کیا وہ یہ تھا کہ 'کیا یہ اپنے سامنے کی آیات (نشانیوں) پر غور نہیں کرتے...!؟' رات دن کا ہزاروں لاکھوں قرنوں سے بغیر بدلے اسی انداز میں آنا جانا...پانی کا اوپر سے نیچے بہنا...برف کا نیچے سے اوپر آنا...پرندوں کا اڑنا، آبیوں کا تیرنا...درندوں کا پھاڑنا، چرندوں کا چرنا...نفس کا موت کا مزہ چکھنا...یہ جو ایک لے میں پوری دنیا بہہ رہی ہے تو کیا یہ سب کچھ خود بخود ہو گیا...!؟ کیا یہ سب سے بڑا 'ارادہ' نہیں ہے...!؟ کن فیکون...پھر اس کے بعد جو سب سے آخری بات بیان کی وہ

تھا قرآن... کیا نازل کیے ہوئے قرآن کو پڑھ کر، سن کر اس میں نشانیاں نظر نہیں آتیں...!؟ کیا انھیں اہرامِ مصر میں دھرا فرعون مجسّم نظر نہیں آتا...!؟ یا یہ 'اگر مگر' کرتے محض منطقی محالیہ (Paradox) میں ہی رہ رہے ہیں...!؟

یہی کہا سورہ یٰس میں کہ ان کے پیچھے دیوار کھڑی کر دی کہ انھیں پیچھے والوں کے احوال سے بے خبر کر دیا... عاد، ثمود، لوطی، نوحی، موسوی... اور انکے سامنے کی چیزوں کو دیوار کھڑا کر کے بے معنی کر دیا... صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ فَھُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ... بہرے ہیں، اندھے ہیں، گونگے ہیں کہ کچھ سمجھتے ہی نہیں...! اور نازل ہوئے قرآن کی بابت ان کے ذہنوں پر پردہ ڈال دیا کہ اس کو محض 'اگلے لوگوں کی حکایتیں' کہتے ہیں... یٰاَیُّھَا الْاِنْسَانُ مَاغَرَّکَ بِرَبِّکَ الْکَرِیْم...!؟ اے انسان تجھے کس چیز نے تیرے کریم رب کے بارے دھوکے میں ڈال دیا...!؟ فَاَیْنَ تَذْھَبُوْنَ...!؟ پس تم کدھر جارہے ہو...!؟ فَھَلْ مِنْ مُّدَّکِر...!؟ تو کوئی ہے جو سوچے سمجھے...!؟

~سازِ ہستی کی صدا غور سے سن

کیوں ہے یہ شور بپا، غور سے سن

~دن کے ہنگاموں کو بے کار نہ جان

شب کے پردوں میں ہے کیا، غور سے سن

''تو اسی (دین کی) طرف (لوگوں کو) بلاتے رہنا اور جیسا تم کو حکم ہوا ہے (اسی پر) قائم رہنا۔ اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرنا۔ اور کہہ دو کہ جو کتاب اللہ نے نازل فرمائی ہے میں اس پر ایمان رکھتا ہوں۔ اور مجھے حکم ہوا ہے کہ تم میں انصاف کروں۔ خدا ہی ہمارا اور تمہارا پروردگار ہے۔ ہم کو ہمارے اعمال (کا بدلہ ملے گا) اور تم کو تمہارے اعمال کا۔ ہم میں اور تم میں کچھ حجت نہیں۔ خدا ہم (سب) کو اکھٹا کرے گا۔ اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے- اور جو لوگ اللہ (کے بارے) میں بعد اس کے کہ اسے (مومنوں نے) مان لیا ہو جھگڑتے ہیں ان کے ربّ کے نزدیک ان کا جھگڑا لغو ہے۔ اور ان پر (خدا کا) غضب اور ان کے لئے سخت عذاب ہے-

خدا ہی تو ہے جس نے سچائی کے ساتھ کتاب نازل فرمائی اور (عدل و انصاف کی) ترازو۔ اور تم کو کیا معلوم شاید قیامت قریب ہی آ پہنچی ہو- جو لوگ اس پر ایمان نہیں رکھتے وہ اس کے لئے جلدی کر رہے ہیں۔ اور جو مومن ہیں وہ اس سے ڈرتے ہیں۔ اور جانتے ہیں کہ وہ

برحق ہے۔ دیکھو جو لوگ قیامت میں جھگڑتے ہیں وہ پرلے درجے کی گمراہی میں ہیں- خدا اپنے بندوں پر مہربان ہے وہ جس کو چاہتا ہے رزق دیتا ہے۔ اور وہ زور والا (اور) زبردست ہے-" ﴿شوریٰ ۱۵ تا ۱۹﴾

میں نے شروع میں کہا تھا کہ کبھی کبھی یہ ایک لامتناہی گمان سا محسوس ہوتا ہے... غلط کہا تھا... گمانوں سے احتراز کرنا چاہئے... کیونکہ بعض گمان... گناہ ہوتے ہیں!...

یااللہ! آسمانوں اور زمین کو بے نمونہ پیدا کرنے والا، غائب اور حاضر کے جاننے والے میں اس دنیا میں عہد کرتا ہوں کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو اکیلا ہے؛ تیرا کوئی شریک نہیں... اور میری یہ بھی شہادت ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تیرے بندے اور تیرے رسول ہیں... اگر تُو مجھے میری ہی طرف سونپ دے گا تو میں برائی سے قریب اور بھلائی سے دور ہو جاؤنگا... الٰہی! مجھے صرف تیری ہی رحمت کا سہارا اور بھروسہ ہے... پس تُو بھی مجھ سے وعدہ کر جسے تُو قیامت کے دن پورا کرے... بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا!...

تحریر ذہین احمق آبادی... مدعو بہ نام... حافظ رؤف الرحمٰن!...